REGD L. M. 1703.

سالنامہ

نیرنگ خیال لاہور



جناب چوہدری بشیر حسین زیبا مرحوم (ایم اے علیگ) کی
دیگر کتب کی جملہ کاپی رائٹ کتب خانے کو وصیہ کیا گیا ہے۔ قارئین
سے درخواست ہے کہ مرحوم کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ شکریہ

Nairangi Khiyal

1928

Annual

1/8/-

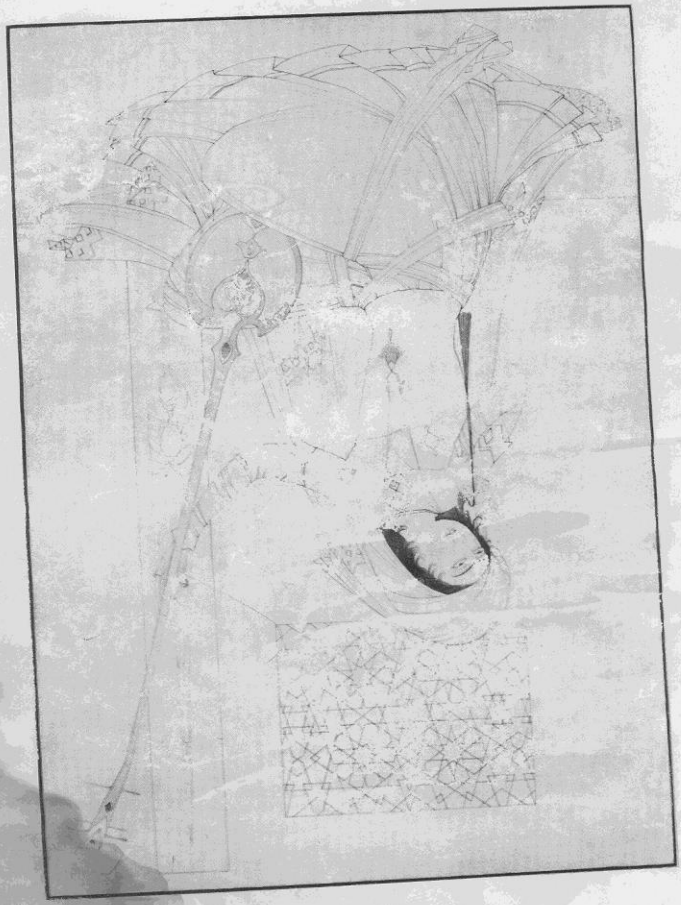

(۷۸۶)

جملہ حقوق محفوظ

یہ کتاب [illegible] ایم اے خیال) کے اس ذخیرہ کتب کی جو اس کتب خانے [illegible] کیا گیا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ مرحوم کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ شکریہ!



ایڈیٹر

حکیم محمد یوسف حسن

پتہ: مینجر رسالہ نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور

قیمت سالنامہ معہ چندہ سالانہ نیرنگ خیال للعہ

(مطبوعہ کریمی پریس لاہور نزد کوتوالی قدیم۔ پرنٹر میر قدرت اللہ۔ پبلشر حکیم محمد یوسف حسن۔ دفتر بازار بارود خانہ لاہور)

۷۸۶

جملہ حقوق محفوظ

IQBAL ACADEMY PAKISTAN Library 31,611 LAHORE

فہرست

تازہ ارشاد ۔ ملک الشعراء علامہ سر اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لاء

مقالات

جمالیات پر ایک سرسری نظر — جناب محمد مظفر حسین فاروقی حیدرآباد دکن — ۱۵ تا ۱۹

نفسِ شاعری اور اُس کے اُصولِ موضوعہ — از جناب پروفیسر محمد ابوالبقا صاحب بی۔ اے — ۲۰ تا ۲۳

فسانۂ عجائب اور باغ و بہار — از ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری ایم اے — ۳۴

حکمت خانم کا روزنامچہ — از جناب انیس الظفر احمد صاحب رضوی بی۔ اے آنرز ایم۔ اے علیگ — ۳۵

ابن خلدون اور اُس کا فلسفۂ تاریخ — از جناب شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے سٹیم عربی — ۴۴

حقیقت کی ایک جھلک — از مولانا نواب علی صاحب ایم۔ اے پروفیسر بُرودہ کالج — ۴۹

صحتِ عائشہ کے اقتصادی اثرات — از جناب ریاض حسین صاحب بی۔ اے — ۵۰

تمقمہ — از جناب محمد عبدالغفور صاحب متعلم بی اے — ۵۱

حافظہ نذیرا حمد اور اُنکا ایک نسائی کردار — مولوی عبدالقادر صاحب سٹری ایم اے۔ ایل ایل بی — ۵۸

فغانی شیرازی — از جناب پروفیسر محمد علم الدین صاحب سالک۔ بی۔ اے — ۶۳

ادب لطیف

پیامِ محبت — از جناب احسن الظفر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۶۸

تائیس — اناطول فرانس کا شاہکار — مترجمہ حضرت پطرس — ۷۱

ایک مصور کا تخیل ۔ پیغام خودی — چغتائی — ۸۸

مطائیبات

لال بجھکڑ — حضرت احسن سبھی کے قلم سے

چچا چھکن نوچندی دیکھنے چلے — از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج۔ بی۔ اے — ۹۴ تا ۱۰۶

ادب العالیہ

حضرت آغا حشر کاشمیری کا شاہکار ۹۷ — اکبر (انارکلی کا ایک منظر) ۱۰۸ از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج۔ بی اے

ب سین حضرت احسن لکھنوی کے قلم سے ۱۰۲

ز جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی اے اسسٹنٹ سکرٹری پنجاب گورنمنٹ ۱۰۵ — کاٹھ کی دو پتلیاں ایک مکالمہ ایڈیٹر کے قلم سے ۱۱۱

منظومات

ی از جناب رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب محمد سجاد علیخاں ۱۵۲

بسمل آف کرنال

از جناب مولانا اظہر علی صاحب آزاد۔ ایم آر ایس لندن ۱۱۴

از لسان الہند علامہ عزیز لکھنوی ۱۱۴

ز شعراء معاصرین از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے ۱۱۵

میسر زاد واجد حسین صاحب یگانہ لکھنوی ۱۱۶

ا از جناب مولانا محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے مرحوم ۱۱۷

ی مجتہد العصر حضرت جوش ملیح آبادی ۱۱۸

ی جناب نواب حیدر یار جنگ بہادر مولانا سید علی حیدر ۱۱۹

نظم طباطبائی ۱۲۰

زل از لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی

یاض لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی ۱۲۱

سال مولانا سید تمکین کاظمی صاحب ۱۲۲

خمخانۂ عرفان ..... لسان القوم مولانا صفی لکھنوی ۱۲۳

انسان کی تازہ کاریاں مولانا وحید الدین صاحب سلیم رکن اردو یونیورسٹی ۱۲۴

غزل از جناب مولانا رضا علی صاحب وحشت کلکتہ ۱۲۵

نیرنگ خیال حضرت فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی ۱۲۵

فسانۂ گل و بلبل از جناب عبد الخالق صاحب خلیق دہلوی ۱۲۶

غزل از جناب عبد الباری صاحب آسی الدنی ۱۲۷

حسن تغزل از جناب شیخ عبد اللطیف صاحب تپش بی اے ۱۲۹

پیغام عمل از جناب انعام فیضی صاحب برنی ۱۲۹

غزل از جناب سید عابد علی صاحب عابد بی اے ایل ایل بی ۱۳۰

حسنیات از جناب اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی ۱۳۰

شعراء ترانہ از جناب روشن دین صاحب بی اے ایل ایل بی ۱۳۱

غزل از جناب خان کبیر خاں صاحب رشا بی۔ اے علیگ ۱۳۲

نغمۂ مسرت ..... بلند رحم علی گڑھی ۱۳۳

افسانے

ا ..... ایڈیٹر کے قلم سے ۱۳۴

از جناب سراج الدین احمد صاحب نظامی ۱۳۸

ادی حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی ۱۴۱

دہلوی کے قلم سے

الک جینی سے از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے ۱۴۶

کامیابی کا راز ..... ایڈیٹر کے قلم سے ۱۵۳

زلیکو ..... حضرت نیازی جامعہ ملیہ دہلی ۱۵۸

پشیمان ..... جناب صادق ایوبی کے قلم سے ۱۶۴

تین دھمکیاں از جناب چودھری محمد رمضان صاحب بی اے علیگ ۱۶۸

ابوس تمنا ..... نذر سجاد حیدر صاحبہ کے قلم سے ۱۷۰

معارف وحقائق

تصویر	تاثیر ایم - اے	۱۹	والکینو ... بشیر حسین خاں
احساسات شاعری	ایڈیٹر	۲۳	سورج اور پھول ... کرم حسین
جنس لطیف	محمد بدرالدین شکیب متعلم بی اے عثمانیہ یونیورسٹی	۳۴	سا کا گیت ... غلام عباس
پھول		۳۴	زندگی ... راجہ رشید احمد صاحب ایڈورڈ کالج پشاور
[illegible]	ایڈیٹر	۴۳	ہندوستان کی خصوصیات ... شبیر مارہروی
[illegible]	محمد [illegible] بی - اے	۴۸	یونیورسٹی جامع ازہر ... بشیر حسین خاں
نغمہ	[illegible]	۶۲	امرود ... مولوی محمد عبداللہ صاحب اسلامیہ کالج لاہور

تصاویر

[illegible] سرورق ... جناب اصغر کے قلم سے

[illegible] ... حضرت چغتائی کا رنگین شاہکار

(۳) جواں [illegible]

(۴) [illegible] (۶) پیغام سروش (۷) چار سوار (۱۹) موازنہ (۲۰) تائیس (۲۱) صحرا کا منظر (۲۲) بازار

(۸) [illegible] سبوت (۹-۱۰) مناظر قدرت (۱۱) [illegible] (۲۳) شیریں فرہاد (۲۴ سے ۲۶) [illegible] ڈل (۲۷ سے ۲۹)

(۱۳) خوش آمدید (۱۴) ایک جینی مندر (۱۵) [illegible] (۳۰) [illegible] آغا خان (۳۲) کیا راز

(۱۶) ایوان تصور (۱۷) [illegible] (۳۳) [illegible] ہزار سال کا پرانا مٹکا (۳۴) جواں سال

ختم نیرنگ خیال کی ضروری عرضداشت

(۱) نیرنگ خیال کا سالانہ چندہ صرف تین روپیہ چار آنہ (۳/۴) سالانہ ہے +

(۲) دسمبر کا نیرنگ خیال پانچ آنہ (۵/) میں ملتا ہے +

(۳) اس سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱/۸) ہے لیکن خریداران نیرنگ خیال سے ایک روپیہ چار آنہ (۱/۴) علاوہ محصول ڈاک +

(۴) آپ جنوری ۱۹۲۸ء سے نیرنگ خیال کے خریدار ہو جائیے۔ تاکہ سال بھر تک رسالہ بھی حاصل کریں۔ اور سالنامہ بھی رعایتی قیمت پر لے سکیں +

(۵) عید نمبر ۱۹۲۷ء کا نیا ایڈیشن شایع ہوا ہے ۱/۴ میں خرید لیجئے +

(۶) عید نمبر ۱۹۲۸ء کی تیاریاں اعلیٰ پیمانہ پر شروع ہو چکی ہیں۔ انشاء اللہ وہ بالکل جدید ترین خوبیوں کا مظہر ہوگا۔ مارچ ۱۹۲۸ء عید کے چاند کے سا[illegible] انتظار کیجئے۔ جنوری سے خریدار ہونے والے اصحاب تو اُسے ۳/۴ چندہ میں ہی حاصل کرینگے۔ دیگر اصحاب سے عہ قیمت لی جائیگی +

نیرنگ خیال پابندی اوقات سے ہر ماہ کی یکم تاریخ کو لاہور سے شایع ہوتا ہے۔ اور آجتک ایک رسالہ بھی دیر سے شایع نہیں ہوا +

منیجر رسالہ نیرنگ خیال (اندرون مستی دروازہ) بارود خانہ۔ لاہور



پیغام سروش

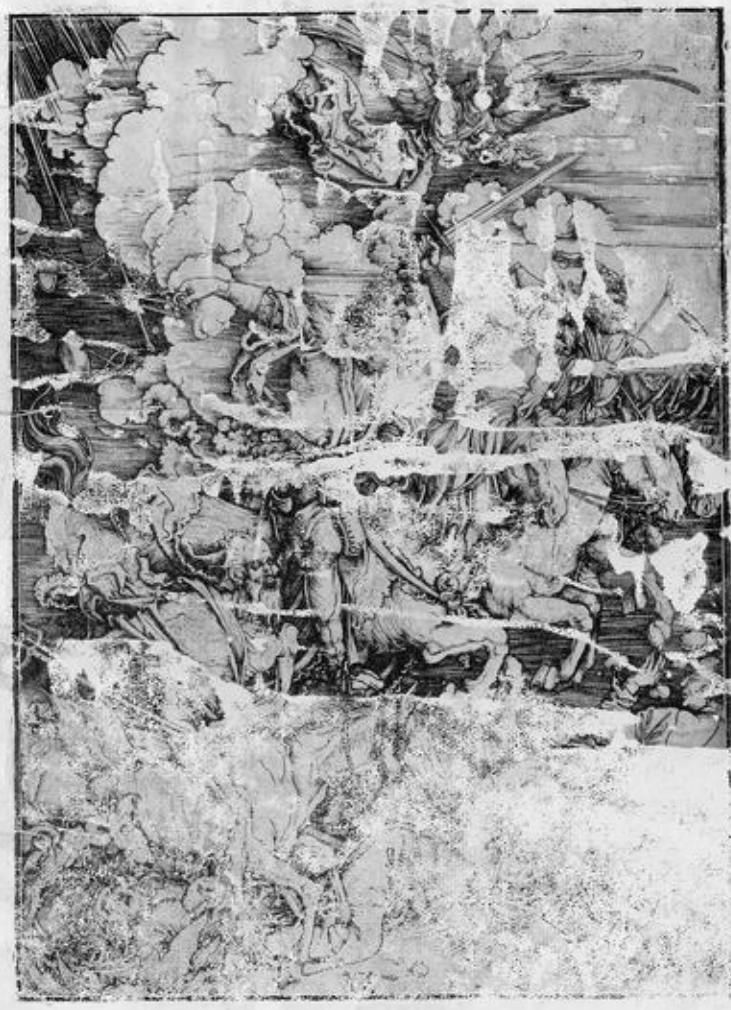

چار سوار

علّامہ اقبال کا تازہ ارشاد

یہ مکتب یہ اسکول [illegible] لے
یہ کلیسے یہ مندر یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت یہ بنیے یہ مُلّا یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی
وطن [illegible] ہے اک نوعِ [illegible]
بڑے سیٹھ ہیں قوم کے [illegible]
وہ بیکھو چلی آ رہی ہے [illegible]
نئے جال لائے پرانے شکاری

غریبوں کا دنیا میں اللہ والی
اقبال

[حضرت علّامہ اقبال ایک ایسے شاندار کام میں مصروف ہیں جس کی تکمیل لاریب تاریخ اسلام میں یادگار رہے گی۔ آپ مذہب کی حقیقت اور اسلام کے حقیقی پیغام پر چھ مضامین مرتب کر رہے ہیں۔ جو اوائل سال نو میں ضرور تیار ہو جائینگے۔ اور آپ پھر مدراس اور جنوبی ہندوستان میں انہیں [illegible] فرمائینگے!۔ اس مشغولیت کے ہوتے ہوئے اور پھر کونسل اور رائل کمیشن اور دیگر مشہوری معاملات کی وجہ سے آپکا اشعار اور وہ بھی اردو اشعار لکھنا جسے آپ پورے پانچ سال سے بھلا چکے ہیں۔ یقیناً دنیائے ادب کی انتہائی خوش قسمتی ہے۔ ایڈیٹر]

ہیں جب کہ ملک کے مشہور ترین انگریزی رسالے اپنی "اینول" کے لئے کئی سالوں سے درخواستیں بھیج رہے ہیں +

دو بہنوں والی تصویر نمائشوں میں بہت کامیاب ہوئی تھی۔ حیا جو عورت کی نسوانیت کا جزو اعظم ہے۔ وہ ان دونوں بہنوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اور یہ حیا اس قدر پُرکیف ہے کہ دیکھنے والے پر خود فراموشی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ بڑی بہن کے چہرہ پر ہلکا سا نقاب ہے۔ سر پر برقعہ نما ٹوپیاں ہیں جنکی جھالریں گردن کی پشت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اُس پر اوڑھنیاں چھاتیوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں +

خوش آمدید } دو بہنوں والی تصویر کی ضد ہے۔ ایک مغربی شوخ و شنگ حسینہ درختوں اور پھولوں کی جھالروں میں سے باہر نکل آتی ہے۔ اُس کا ہنس مکھ چہرہ زبانِ حال سے خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ دو بہنوں والی تصویر سے اس کا مقابلہ کیجئے اور بغور مقابلہ کیجئے۔ آپ کو زمین آسمان کا سا فرق معلوم ہوگا

تخیلات } ایک مشرقی شہر کو جس کے گنبد اور مینار نظر آ رہے ہیں۔ تاروں بھری رات منور کر رہی ہے۔ شہر کے ایک گوشہ میں ایک حسینہ گلاب کے پھولوں کی سیج پر محوِ خواب ہے۔ چھوٹی سی انگیٹھی سے سفید سفید دھواں نکل کر فضا میں پھیل کر حسین شکلیں پیدا کر رہا ہے۔ سچ ہے کہ حسینوں کو خواب بھی حسین ہی نظر آتے ہیں۔ یہ ایک فرانسیسی مصور کا شاہکار ہے +

تخلیق حسن } سمندر کی گہری تہہ ہے۔ بڑی بڑی چٹانیں اور پہاڑ ہیں جن میں مچھلیوں نے گھر بنا رکھے ہیں۔ سمندر کی تہہ میں ایک سفید سفید سیپ پڑا ہے۔ جس میں سے حسینہ نمودار ہو رہی ہے۔ ایک مغربی مصور کا نکتہ خیال ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ مشتری سمندر کی تہہ سے پیدا ہوئی تھی +

پیغام سروش } سادگی اور معصومیت کا مرقع ہے۔ فرشتہ کا نازک ہاتھ ایک نیک عورت کے کندھے پر پڑا ہے۔ اُس کے جواب میں حسینہ کا ہاتھ دیکھئے اور پھر دونوں کے چہروں کا موازنہ کیجئے۔ بیشک بعض عورتیں فرشتوں سے بھی زیادہ معصوم ہوتی ہیں +

چار سوار } مصور نے عدل۔ خونریزی۔ مصائب اور فتوحات چاروں قوتوں کو چار سواروں سے واضح کیا ہے۔ یہی چاروں قوتیں دُنیا کے نظام کو قایم رکھے ہوئے ہیں +

خانۂ عنکبوت } انگلستان کے مشہور شاعر کیٹس کی نظم پر یہ تصویر تیار کی گئی تھی۔ ایک ایسا نوجوان جو بہت خوش شکل۔ بہت بڑا بہادر اور پانچوں ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ ایک حسینہ کے آگے پڑا ہے۔ اور اس قدر بیہوش کہ گھاس پھوس نے اُسے چھپا لیا۔ اور مکڑی نے اُس پر جالا تن دیا۔ جنونِ عشق یا حسن کی تسخیر کا اس سے بہتر مرقع آپ کی نگاہ سے نہ گذرا ہوگا +

الف لیلہ کی ایک رات } اس تصویر میں دونوں لڑکیوں اور چابی بردار بوڑھے کی آنکھوں کو دیکھئے۔ لڑکیوں کی نگاہ سے خوف و ہراس اور پریشانی ٹپکتی ہے۔ بوڑھے محافظ کی نگاہ سے جبر و تعدی کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ تصویر الف لیلہ کے افسانوں سے ماخوذ ہے +

تائیس } حضرت پطرس نے اپنے مضمون کے ساتھ متعدد تصاویر بھی بھیجی تھیں جن میں سے ہم تین شایع کر رہے ہیں۔ ایک تصویر اُس ایکٹرس کی ہے جس نے تائیس کا پارٹ کیا تھا۔ اور دو تصویروں سے سٹیج کے دو مناظر واضح کئے ہیں۔ ایک میں صحرا کا منظر ہے۔ اور دوسری میں بازار کا منظر۔ سٹیج پر اس قسم کے مناظر پیش کرنا مغربی سٹیج کا خاص کمال ہے +

شیریں فرہاد } حضرت چغتائی کے ایک شاگرد مسٹر عنایت حسین نے تیار کی ہے۔ فرہاد جوئے شیر لانے کے لئے تیشہ لئے کام کر رہا تھا کہ اُسے پہاڑ کی چوٹی پر شیریں کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ کام چھوڑ کر محوِ دیدار ہو رہا ہے۔ یہ انگریزی انداز کی تصویر ہے +

خواجہ سرا } یہ بھی ایک فرانسیسی مصور کا کمال ہے۔ خواجہ سرا کی تصویر کے ساتھ ایڈیٹر نیرنگ خیال کا افسانہ پڑھئے +

تین ماڈل اور یک سرخ تصاویر } آرٹ کے کمالات کیساتھ فوٹو کے کمالات بھی دیکھئے۔ آجکل آرٹ فوٹوگرافی بھی آرٹ کے تتبع میں ایسی تصاویر تیار کر رہی ہے جنپر آرٹ کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

کارٹون } ہز ہائی نس سر آغا خان بالقابہ کی عزت بحیثیت قوم پرست اور وطن پرست ہونے کے ہمارے دل میں برابر موجود ہے۔ حال ہی میں ایک انگریزی رسالہ کے مشہور انگارہ ساز بلزک نے سر آغا خان کو بحیثیت ریس لارڈ کے پیش کیا ہے۔ ہز ہائی نس کو گھوڑوں اور گھوڑ دوڑوں سے جو شغف ہے وہ ظاہر ہے۔ کسی اخبار نے لکھا تھا کہ حال ہی میں آپ نے ایک گھوڑا نو لاکھ روپے میں خریدا ہے۔ باقی تمام تصاویر پر خود غور کیجئے +

اسسٹنٹ ایڈیٹر

(تمام تصاویر غیر مطبوعہ ہیں اور تمام بلاک ہم سے کرایہ پر مل سکتے ہیں۔)

دسمبر ۱۹۲۸ء

"جمالیات پر ایک سرسری نظر"

جب فطرتی یا صنعتی معروض مع اپنے ماحول کے ہم میں ایک قسم کا تاثر یعنے خوشی یا رنج کا احساس بغیر کسی قسم کی خواہش کو اُکسائے ہوئے پیدا کرتا ہے تو ہم اس کو "جمالیاتی اثر"[1] کہتے ہیں۔ اور یہی اس کی خاص اور اہم خصوصیت ہے۔ کانٹ[2] جو اس علم کا بانی اوّل ہے جمالیات کے متعلق کہتا ہے۔ کہ "وہ بے غرض طمانیت" ہے۔ یہ ہم کو جمالیاتی معروض پر کسی نہ کسی قسم کے حکم لگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور اس حکم کو ہم خوبصورت و دلچسپ یا بدصورت و تکلیف دہ وغیرہ کے الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اپنے حکم کو ایک کلیہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اور اسی کے زیر اثر مخالف رائے رکھنے والوں سے بحث کرتے ہیں۔ جمالیاتی ذوق کا اثر نہ صرف ایک فرد کی زندگی پر پڑتا ہے۔ بلکہ تمدن پر بھی نمایاں اثر ہوتا ہے۔ اس لئے موضوعی و معروضی دونوں جمالی حالتوں کی تحلیل نہایت اہتمام کے ساتھ ہونی چاہئے۔

نئے علوم کی ترقی اور تاریخی معلومات کی بہم رسانی نے اس بات کے معلوم کرنے میں مدد دی ہے۔ کہ انسان نے کس طرح فطرت شناسی شروع کی اور پھر آہستہ آہستہ کس طرح اس میں جمالیاتی نقطۂ نظر پیدا ہوتا گیا۔ بہرحال ذوق[3] کے موضوعی پہلو کا مطالعہ نفسیات[4] کے ذریعہ اور معروضی پہلو کا مطالعہ تاریخ اور علم الاجتماع کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ ان کے بعد مطالعہ کے بعد ان نتائج کو دیکھ کر جو ہمیں حاصل ہوتے ہیں ہم جمالیاتی اصولوں کو معلوم کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح حسن اور فنون لطیفہ کا فلسفہ بیان کر سکتے ہیں۔

ہاں ہمہ اس اہم اصول کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ کہ جمالیاتی حالت میں ہم پر خالص طمانیت کے تاثرات ہوتے ہیں۔ اور ان میں قطعی خواہش نہیں پائی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی جمالیاتی ذوق خود اس بات کی دلیل ہے کہ تاثر شعور کا اساسی وظیفہ ہے۔ یہ تاثر جمالیاتی ذوق کے علاوہ کہیں موجود نہیں رہتا۔ اور ہمیں فطرت کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ صاف اور مختصر تعریف جمالیات کی یہ ہے کہ یہ فلسفہ تاثر یا ذوق کہلایا جا سکتا ہے۔ اس تعریف سے ایک طرف جمالیات کی فلسفہ میں جو اہمیت ہے واضح ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف نفسیاتی، تاریخی، اور معاشرتی تحقیقات کے لئے راستہ کھلتا ہے۔ جمالیاتی طمانیت کے متعلق نہایت کارآمد تحقیقات نفسیات کی ہے۔ جمالیاتی خوشی کو دیگر خوشگوار احساسات سے علیحدہ کر کے اس کی بنیاد کو معلوم کرنا ہمارے لئے بیحد ضروری ہے ہم کو ایک مصوّر کے خیالات کا بھی بغور مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس کی ہمیں قطعی اجازت نہیں ہے۔ کہ ہم اپنے آپ کو صرف ایک ہی فرد تک محدود رکھیں۔

اجتماعی پہلو جمالیات میں اہم خصوصیت رکھتا ہے۔ کیونکہ جمالیاتی ذوق پر تمدن و ماحول کا بیحد اثر پڑتا ہے۔ فلاطون اور ارسطو نے بھی فن کی معاشرتی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ جن کا مطالعہ ہمارے لئے ضروری ہے۔ اجمالاً یہ کہ جمالیات فلسفہ، تاثرات کا نام ہے۔ اور یہ نفسیاتی، معاشرتی، اور تاریخی تحقیقات پر مبنی ہے۔

جمالیات کا مفہوم اور اس کے نظریات جمالیات کی اصطلاح کو بمعنے فلسفہ حسن پہلے پہل بام گارٹن[5] نے استعمال کیا تھا۔ اس کے لفظی یعنی نظریہ اور ادراک حسی، ہے۔ اور کانٹ نے بھی اس کو اسی

---

[1] Aesthetics
[2] KANT
[3] Taste
[4] Psychology
[5] Baumgarten

معنی میں استعمال کیا ہے۔ حقیقۃً کانٹ کے پاس اس کے دو معنی تھے ایک طرف اس کے نظریۂ علم میں اس کے معنی ادراک حسی کے ہیں۔ اور دوسری طرف اس نے اپنی تحکیم میں خوشی کے علم کے لئے جو حس سے پیدا ہوتا ہے استعمال کیا ہے۔ ہربرٹ نے اس لفظ کو وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔ وہ اس میں علی فلسفہ کو بھی داخل کرتا ہے۔ یعنے وہ ہر اس چیز کو جو تحکیم قیمت رکھتی ہے۔ اس میں داخل کرتا ہے۔ لیکن آجکل جو معنے جمالیات کے لئے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ جمالیات فلسفہ حسن اور فنون لطیفہ کا نام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ علم نیا ہے۔ لیکن نو ایجاد نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی بعض فلاسفہ نے اس کے موضوع یعنے حسن پر بحث کی ہے۔ مثلاً فلاطون نے ایک مکالمہ حسن کی بحث کے لئے اپنی کتاب میں وقف کیا ہے۔ بایں ہمہ جمالیات کو ترقی صرف اٹھارویں صدی میں ہوئی ہے۔ انگلینڈ میں شیفٹسبری۔ اسکاٹلینڈ میں ہچسن اور برک نے اس علم کی بے حد خدمت کی ہے۔ آخیر میں وِنکل مین نے حسن کو قدیم صنعت میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیسنگ نے حسن۔ شاعری۔ اور بت تراشی کے فرق کو معلوم کرنے کی کاوش کی اور شیلر نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ اس نے نغمہ کے آغاز کو خیال کی گہرائیوں میں پالیا ہے۔ ان تینوں باتوں نے کانٹ کو اس بات پر مجبور کیا۔ کہ وہ جمالیات کی بنیاد اپنی کتاب "کریٹک آف ججمنٹ" کے ذریعہ ڈالے۔

کانٹ کو جس اہم چیز نے جمالیات کی تلقین کی۔ وہ بے تعلقی یا بے غرضی کا خیال ہے۔ ہیگل۔ شلنگ اور شوپنہار نے حسن اور فنون لطیفہ پر مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر سے جامع بحث کی ہے۔ ہیگل فنون لطیفہ کو ذہن کل کی معروضیت کا ادنیٰ درجہ اور مذہب و فلسفہ کو اعلیٰ درجے قرار دیتا ہے۔ ہیگل حسن کو تصوّر کا مادی مظاہرہ بتلاتا ہے۔ شیلنگ تخلیق کو فنون لطیفہ کا اعلیٰ تبلاتا ہے۔ اور شوپنہار فنون لطیفہ کو ذہنی تکمیل کا عرج کہتا ہے۔ اور نغمہ کو فنون لطیفہ کی اعلیٰ قسم بتلاتا ہے۔ ہربرٹ کہتا ہے کہ حُسن یا جمال تناسب سے پیدا ہوتا ہے۔

اب تک جتنے نظریات ہم نے پیش کئے ہیں۔ وہ سب "خیالی طریقہ" کے تحت تھے۔ لیکن ۱۸۶۶ء میں فخنر نے ایک نیا طریقہ پیش کیا ہے۔ قدیم طریقہ استخراجی تھا۔ لیکن فخنر نے اپنے خیال کو استقرائی طور پر پیش کیا ہے۔ جس میں تجربہ اور مطالعہ سے مدد لی گئی ہے۔ اور اس نے نئی بات جو پیدا کی وہ جمالیاتی حکم میں خالص و متلازم حصّوں کا امتیاز ہے بہرحال ان تمام مندرجہ بالا مشکلات کے باوجود بھی جمالیاتی ذوق اور فنون لطیفہ کے اثر کی نوعیت کو ایک حد تک معلوم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

جدید نقطہ ہائے نظر میں سے دو نظریے خاص طور پر قابل تحریر ہیں۔ ایک تولیش کا احساس نوعی کے متعلق ہے۔ اور دوسرا کوناڈ لینگ کا "شعوری التباس ذات" کے متعلق ہے۔ پلس یہ فرض کرکے اپنے خیال کی ابتدا کرتا ہے۔ کہ ہر جمالیاتی معروض قایم مقام ہوتا ہے کسی اصل ہستی کا۔ اور اس معروض کے ذہنی اثر کو "احساس نوعی" کہتا ہے۔ لینگ کہتا ہے فنون لطیفہ یا مصوری میں ہمارا تجربہ ایک التباس یا دھوکہ ہوتا ہے۔ اور یہ اصل کی نقل ہوتی ہے۔ یعنے فنون لطیفہ کی ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دھوکہ دیتا ہے۔ دوسرا وہ جو اس کی اصلاح کرتا ہے۔ تو جمالیاتی ذوق اس خیالی نمود اور اصل کے درمیان پایا جاتا ہے۔ لیکن اس فرق کو معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا ہم دیگر مختلف اور جدید نظریات کا ذکر کرینگے۔

خیالی جمالیات ابھی نہیں کردی گئی ہے۔ لیکن یہاں پر طریقہ تجربی نہایت کارآمد ہے۔ اسی لئے ہم اپنے آپ کو اسی حد تک محدود رکھینگے۔ تجربی جمالیات کے دو حصّہ کئے جاتے ہیں۔ ایک معیاری اور دوسرا توصیفی۔ معیاری میں قواعد و ضوابط بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً مصوّر کے لئے یہ نہایت اہم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اعلیٰ مصوّر ہونے کے لئے اصولوں پر

بھی حاوی ہونا ضروری ہے۔ اور توصیفی یا تحصیلی جمالیات میں اصل اصول کو معلوم کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ یہ ایک طرف تو مصور کو نقش و نگار پر اُبھارنے والی حالتوں کے معلوم کرنے میں۔ اور دوسری طرف نقش و نگار کے اجتماعی اثر کی حقیقت کے انکشاف میں مدد دیتا ہے۔ اس کا میدان کارزار ذہن نقاش، تمدن اور اس زمانہ کے مخصوص مذاق کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس طرح جمالیات نفسیات اور تاریخ سے متعلق ہو جاتی ہے۔

تصوریت کے لحاظ سے فنونِ لطیفہ کا آخری مقصد تمثیلوں اور نمونوں کے ذریعہ نوعِ انسان کے سامنے اصلی حقیقت کا واکرنا اور اس کو بلند تر بنانا ہے۔ اور موجودیت کے لحاظ سے فنونِ لطیفہ کا اصلی کام کائنات کی نقل جتنی ہو سکے اصل کی صورت میں ہُو بہُو پیش کرنا ہے۔ ان مندرجہ بالا رجحانات کے علاوہ اور بھی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ ایک حد تک نامکمل ہیں۔

کانٹ کے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ جمالیاتی فیصلہ یا حکم کسی چیز یا تصور کے حل کرنے یا سمجھنے پر منحصر نہیں۔ بلکہ خوشگوار یا ناگوار تاثر اور موضوع پر منحصر ہے۔ یعنے جمالیاتی تاثر فہم میں نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد اس نے دل پسند اور جمالیاتی تاثر میں اہم امتیاز قائم کیا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ دل پسند میں خواہش کا جزو پایا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے تاثرِ حسن میں بے غرضی پائی جاتی ہے۔

یہ واضح ہو کہ ہمارے اعضا جوں جوں ترقی کرتے ہیں۔ مشق چاہتے ہیں۔ جو ان کی حیات کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جو اعضاء جسمانی استعمال نہیں کئے جاتے۔ وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد یہی ضرورت ذہن اور شعور کو بھی پیش آتی ہے جس کو اصطلاح میں وظیفی مطالبہ کہتے ہیں۔ اور وہ خوشی جو کھیل میں حاصل ہوتی ہے۔ اسی وظیفی مطالبہ کی آسودگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی حالت جمالیاتی خوشی کی ہے۔ یہ ہمارے ذہن کے مطالبہ کی آسودگی کا مظہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کانٹ نے جمالیاتی تاثرات کو 'بے تعلق' اور 'بے غرض' کہا ہے۔ کھیل کی مسرت جمالیاتی مسرت کے متوازی ہے۔ لیکن دونوں ایک نہیں ہوتے۔ بلکہ جمالیاتی خوشی اپنی اعلیٰ صورتوں میں نفسی وظائف سے متلازم ہے۔ جو کھیل کی صورت میں کبھی نہیں ہوتا۔ مختصراً یہ کہ جمالیاتی مسرت ایک واضح قسم کی وظیفی مسرت ہے۔ جو غور و خوض کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

جمالیاتی مواد زیادہ تر آنکھ اور کان سے حاصل ہوتا ہے۔ غالب نے ٹھیک کہا ہے کہ ؎

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ نوائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

اس سے یہ خیال نہ ہو۔ کہ باقی حواس کچھ کام نہیں دیتے۔ بلکہ لمس اور ذائقہ سے بھی بعض مرتبہ جمالیاتی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

ہم جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں۔ اور جب اس سے جمالی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ تو اس کو خوبصورت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں موضوع یعنے محسوس کرنے والے کی طبیعت کو بھی زیادہ دخل ہے۔ لیکن بعض مرتبہ وہی چیز جو ایک دفعہ جمالیاتی مسرت پیدا کر چکی ہوتی ہے۔ پھر اُس مسرت کا باعث نہیں بنتی۔ اگر معروض حواس کے علاوہ خیالات و تصورات پر بھی قابض ہو جائے۔ تو جمالیاتی مسرت اور زیادہ صاف اور دلچسپ ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہم کسی نظم کو سنتے ہیں۔ تو اس میں الفاظ ادراکِ حسی کے لحاظ سے بالکل بے معنی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ہم پر ہمارے خیالات و تصورات کے ذریعہ اثر کرتے ہیں۔ گرل پارزر نے اس معنی میں ٹھیک کہا ہے کہ نغمہ ہم میں باہر سے نہیں بلکہ خود اندر سے پیدا ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ بڑی کمپنی۔ نئے ایجادات اور اعلیٰ مشین بھی ہم میں اعلیٰ پیمانہ پر جمالیاتی اثر پیدا کرتے ہیں۔ جوزف پوپر نے اس خیال کو اچھی طرح بیان کیا ہے۔ اسی طرح ریاضیات کے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کے بعد بھی ہم میں جمالیاتی مسرت پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں جمالیاتی مسرت ذہنی و وظیفی خوشی سے پیدا ہوتی ہے۔

دیگر یہ کہ ہم میں رغبت اُسی چیز کی ہوتی ہے۔ جو ہمارے ذہن پر اچھی طرح موافقانہ قابض ہو جائے۔ رغبت دلانے والی اور حسین یا خوبصورت چیز میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس چیز کو جو ہم میں حواس کے ذریعہ وظیفی خوشی

پیدا کرتی ہے۔ دل پسند یا خوشگوار کہتے ہیں۔ اور اس کو جو ہمارے فہم کے مطابق ہو رغبت دلانے والی کہتے ہیں +

اگر ہم فنون لطیفہ کے حسن کے مخفی راز کو سمجھ لیں۔ تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ جذبہ بھی شعور کلی کی ایک بنیادی قوت ہے۔ جو شق کی خواہاں ہے۔ ہمارے جسمانی اعضا جذباتی تحریک کے خواہاں ہوتے ہیں جس سے ایک طرح کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جذبہ کو تاثر کے ہم معنے استعمال کرتے ہوئے ہم اس جذبی مطالبہ کو 'وظیفی مطالبہ جذبی' کہتے ہیں + وظیفی مسرت اصل میں نبع ہوتا ہے جمالیاتی مسرت کا۔ ہم ایک قصہ سنتے ہیں۔ تو ہمارے جذبات ہیرو کی مشکلات کے ساتھ برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جب ہم نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ تو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہی تمام باتیں ملکر ایک وظیفی یا جسمانی خوشی کا باعث ہوتے ہیں۔ اور یہی جذبی وظیفی یا جسمانی مسرت ہوتی ہے۔ جو حقیقی طور پر جمالیاتی مسرت کو بناتی ہے +

یہ عام طور پر کلیۃً تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ مختلف فنون لطیفہ میں سے نغمہ ہی ایک ایسا فن ہے۔ جو زیادہ جذبہ کو ابھارتا ہے + جمالیاتی مسرت میں ہم بالکل متاثر ہو جاتے ہیں۔ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بیحد مضطرب ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہم میں خواہش یا خود غرضی نہیں ہوتی + ہماری اس مسرت کا نبع ہم سے باہر ہوتا ہے۔ یعنے وہ فنون لطیفہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ جس سے ہم متاثر ہوتے ہیں + اسی وجہ سے ہم اس معروض کو خوشگوار۔ دل پسند وغیرہ کے الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں + عام طور پر ایسے معروض کے لئے جو عام لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ 'جمیل' یا 'خوبصورت' ہے۔ یعنے ہم پر اس چیز کو جو ہم میں وظیفی یا جسمانی خوشی پیدا کرتی ہے۔ خوبصورت کہہ کر تعبیر کرتے ہیں + یہ واضح ہو کہ بعض مرتبہ جمالیاتی حکم انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے + اس کی اصلی وجہ یہ ہے۔ کہ افراد کا وظیفی مطالبہ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے + دوسرے یہ کہ ہم بعض ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جو زمانہ کے انقلاب کے باوجود بھی خوبصورتی کا کلی حکم رکھتی ہیں + اس کی اصل وجہ یہ ہے۔ کہ وہ معروض مثلاً بت یا تصویر چند ایسی اہم خصوصیات کو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ جو ہر زمانہ کے انسانوں میں کلیۃً پائے جاتے ہیں +

حسن کے مستعمل معنے کے علاوہ ایک اور محدود معنے بھی کئے جا سکتے ہیں کیونکہ ہر وہ چیز جو ہماری منظور نظر ہوتی ہے۔ ہم میں مشکوریت کا احساس بھی پیدا کرتی ہے۔ یعنے محدود معنے کے لحاظ سے ہم خوشی کی وجہ سے مشکور بھی ہوتے ہیں۔ اس کو اصطلاح میں محبت کہا جاتا ہے + ہر شخص اپنے ذہن کے خزانہ میں چند ایسی چیزیں جمع کر رکھتا ہے۔ جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس طرح ہم جمالیاتی مسرت میں ایک جز کا اضافہ کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے جمالیاتی مسرت کھیل کی مسرت سے نمایاں ہو جاتی ہے۔ حسن اور محبت کا تعلق سلوک ہو چکا۔ اب اس کے متعلق کہا یہ جاتا ہے۔ کہ حسن علت ہوتی ہے اور محبت اثر یا معلول۔ لیکن جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ صنف نازک کا حسن ہم میں محبت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف بھی ہو سکتا ہے یعنے بعض مرتبہ محض محبت کی وجہ سے ایک خاص چیز حسین معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثلاً بدصورت بیٹا ہر حالت میں خوبصورت دکھائی دیتا ہے + یہاں پر حسن علت نہیں بلکہ معلول یعنے اثر ہوا۔ اسی طرح جب فنون لطیفہ کی کوئی صنعت ہماری جسمانی مسرت کو متحرک کرتی ہے۔ تو اس سے وہ چیز حسین معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور اسی کو ہم حقیقی حسن کہتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جنہیں ہم حسین سمجھتے ہیں۔ ہماری زندگی کے آخری لمحہ تک ہمارے ساتھ رہتی ہیں + یہ ہماری خوشی میں اضافہ کرتی اور ہماری روح کو فرحت بخشتی ہیں + یہاں پر جمالیاتی مسرت کی مختصر آ یوں تعریف ہو سکتی ہے کہ یہ وہ وظیفی مسرت ہے جو غور و خوض کے بعد حاصل ہوتی ہے +

بت تراشی اور مصوری پہلے پہل ہمارے حواس پر اثر کرتے ہیں اس کے بعد تاثرات میں فہم کے ذریعہ جنبش پیدا کرتے ہیں۔ اور نغمہ یا نظم کے اثر کی ابتدا فہم یا عقل کی وظیفی خوشی سے ہوتی ہے۔ جو اخیر میں ہمارے جذبات کو ابھار دیتی ہے۔ اور جب کبھی ہماری وظیفی جذبی مسرت نہیں ابھاری جاتی یہ جمالیاتی مسرت بافرحت سطحی رہتی ہے +

جمالیاتی مسرت جمالیاتی حکم پیدا کرتی ہے اور ہم ہر فرحت بخش حسین چیز کو اپنے حکم کی وجہ سے منبع یا مرکز فرحت کہتے ہیں + مطالعہ باطنی اور لوگوں کے تجربات کے مقابلہ سے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ معروض کے حسن کا کلیۃً انحصار ہمارے موضوعی خوشی کی حالتوں پر ہے۔ یعنے موضوع کا اس میں زیادہ دخل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم معروضی پہلو کو بالکل خارج کر دیں۔ تو یہ ہماری غلطی ہے۔ کیونکہ ہم نے دیکھا ہے۔ کہ بعض تصاویر ایسی بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کا اثر ہر زمانے کے باشندوں پر ہوتا ہے + لہذا جمالیات کا کام معروضی و موضوعی

دونوں پہلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے۔ ہمارا یہ بیان جمالیات کے ایک دوسرے مسئلہ کی طرف ہمیں متوجہ کر دیتا ہے۔ یعنے تصاویر کی تعبیر کیسے ہوتی ہے؟ اور ان کے مقبول عام ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مصوّر کلی نمونوں کو پیش کرتا ہے۔ اور یہ ان مجرّد نئے خیالات کو اس طرح پیش کرتا ہے۔ کہ وہ فوراً سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اسی لئے ہیگل نے کہا ہے کہ حسن حواس کے تصوّرات کے مظاہرہ کا نام ہے۔ فلاطون کے "تصوّرات" اس کے سوائے کچھ نہیں ہیں۔ ہیگل حسن اور صداقت کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔

فنون لطیفہ (مصوّری) کا تعلق مذہب سے بھی گہرا ہے۔ اس کا ثبوت قدیم یونانی مصنیات سے ملتا ہے۔ مصوّری ہم میں ایک قسم کی پاک خوشی اور بے غرضی پیدا کر دیتی ہے۔ جس سے ہمارا دماغ عرش اعلیٰ پر پہنچ جاتا ہے۔ اور ہمارے نفس امارہ کو تھوڑی دیر کے لئے دبا دیتی ہے۔ جس سے ہم میں رحم کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے مذہب کو بھی بے حد تعلق ہے۔

سب سے آخر میں اخلاق اور فنونِ لطیفہ کا تعلق بتلایا جاتا ہے۔ یہ تعلق غیر واضح ہے۔ کیونکہ بعض مرتبہ ایک اچھا مصوّر زندگی کے بد پہلو کو بھی ایسے کمال سے دکھلاتا ہے۔ کہ ہم میں اس کے دیکھنے سے ایک قسم کا جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جمالیاتی تاثر اخلاقی حکم سے بالکل علیحدہ ہے۔ بہرحال مصوّری اس لئے نہیں ہے۔ کہ اس سے اخلاق سکھلائے جائیں۔ تاہم اخلاق سے اس کا کچھ تعلق ضرور ہے۔ کیونکہ ایک مصوّر عارضی طور پر اپنی تصویر سے ہم میں پاک خوشی پیدا کر دیتا ہے جس سے ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ اور جبتک وہ چیز ہمارے سامنے رہتی ہے۔ ہم پر جادو کا اثر کرتی ہے۔ اور بعض مواقع پر یہ تصویر ہم میں انسانی ہمدردی کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔

اس مختصر سی بحث سے ایک حد تک یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ جمالیات فلسفہ تاثرات یا احساسات کا نام ہے۔

محمد مظہر حسین فاروقی۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

تصویر

تصویر کا نام جو چاہو رکھ لو۔ کیونکہ تصویر جس کا موضوع رنگ اور خط ہیں الفاظ سے بالکل بے تعلق ہوتی ہے۔ عوام عکاسانہ جزئیات کی غیر موجودگی سے محض اس لئے کھسیانا ہوتے ہیں کہ ایسی تصویر شہوانی جذبات کا موضوع نہیں بن سکتی۔ وہ ہر عورت کو زہ جو آئندہ سمجھکر سیم کی پھلیوں کی سی انگلیوں اور آنکھوں کے تیروں کو غیر فطرتی کہہ کر معیوب قرار دیتے ہیں۔ اور اس طرح اس چیز کو جسے وہ شاعری میں مستحسن سمجھتے ہیں اس کو مغموم گردن کر اپنے طبعی رجحان اور غیر جمالیاتی معیار کی حقیقت واضح کر دیتے ہیں۔ تصویر جس قدر جزئیات سے مبرا ہوگی مصوّر کا پیغام واضح تر ہو جائے گا!!۔ تاثیر ایم اے

عہ خصوصاً مصوّری۔

نفسِ شاعری
اور
اُس کے اُصولِ موضوعہ

(از جناب پروفیسر محمد ابوالبقائی۔ اے)

ذیل کی سطریں چاہے کتنی ہی واقعیت اور صداقت سے مملو ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو خیالات ان میں محمول ہیں۔ ان میں اور ملک کے موجودہ اصول موضوعہ اور شاعری کے متعلق علوم متعارفہ سے نسبتاً اجنبیت اور تباین پایا جاتا ہے۔ میرے یہ خیالات کسی خاص کتاب کے مطالعہ سے پیدا نہیں ہوئے کہ میں سنداً انہیں پیش کر سکوں۔ بلکہ یہ میرے اپنے خیالات ہیں۔ اور مختلف شعبہ ہائے علم کے موضوع لہٗ پر غور کرنے سے پیدا ہوئے ہیں +

علوم جدیدہ کی ترقی و اشاعت شاعری کے حق میں سم قاتل خیال کی جاتی ہے + مادی۔ علمی۔ کاروباری بیسویں صدی نے دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ کہ یہ خیال جہانگیر ہونے لگا۔ کہ شاعری کی ہوائی دنیا (عالم خیال) کا طلسم چند ہی روز میں ٹوٹ جائیگا + وہ دن بہت دور نہیں ہے۔ جب اس کی کساد بازاری کی حد ہو جائیگی۔ کوئی اسے پوچھیگا بھی نہیں۔ انیسویں صدی تو خیر چوں توں گذر گئی۔ مگر بیسویں صدی کے ساتھ ہی زمانے کی ہوا بدل گئی۔ اب ترقی یافتہ ملکوں میں شاعری کی طرف سے عام غفلت اور بے توجہی پائی جاتی ہے[1]۔ علمی علوم کے شیفتہ بڑھتے اور شاعری کے پجاری گھٹتے جاتے ہیں + اب سے ایک صدی اُدھر جو ہما ہمی اور گرما گرمی اس نیرنگستانِ خیال میں تھی وہ اب نام کو بھی نہیں +

اس سے میرا یہ مطلب نہیں۔ کہ 'ہملٹ' اور 'فاسٹ' سے مخمور ہونے والے اب پیدا نہیں۔ بلکہ اب دوسرا مینی سن۔ دوسرا غالب[2] دوسرا قاآنی موجود نہیں ہے + ان وجوہ کی بنا پر یہ خیال عالمگیر ہو گیا ہے کہ شاعری اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکی۔ اور اب اس کی فنا کا وقت آ پہنچا +

مگر حقیقت امر یہ ہے۔ کہ جو نقش ہم نے اپنے دماغ پر کھینچ لیا ہے۔ یعنی کچھ موزوں صورت میں اپنے خیال۔ احساس۔ اور وجدان کو پیش کرنے کا نام شاعری ہے۔ اگر انہیں حدود میں شاعری کو محدود سمجھ لیا جائے۔ تو بیشک شاعری سریع المرور۔ فنا پذیر صورت میں پیش نظر ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ شاعری کو موزوں جملوں کی چار دیواری میں محدود کرنا نفسِ شاعری کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ نفس شاعری کچھ اور ہی چیز یہ ایک لازوال شے ہے جو رہتی دنیا تک رہیگی۔ جب تک انسان کا وجود ہے۔ انسان کی رگوں میں خون دوڑتا ہے اور خون میں گرمی ہے۔ جب تک دماغ میں اور اک۔ احساس اور وجدان کی قوتیں ہیں۔ اور ان حالتوں کے اظہار کی امکانی صورت پر اختیار حاصل ہے۔ اُس وقت تک شاعری زندہ رہیگی + صورت نوعیہ یا قالب بدلتا رہے۔ لیکن ہیولیٰ اور نفس شاعری ہمیشہ ایک ہی رہیگا۔ بلکہ ترویج اشاعت۔ اور ترقی علوم کے ساتھ ساتھ اس میں نمو ہوتا جائیگا۔ اگر علوم کی ترقی سے شاعری میں ضعف۔ انحطاط۔ اور تنزل پایا جائے۔ تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری یہ ترقی اصلی نہیں بلکہ ترقی معکوس ہے +

قبل اس کے کہ میں عرض کروں کہ شاعری کیا چیز ہے۔ مناسب ہے کہ اُن اُمور کا ذکر کر دوں جن سے حقیقت شاعری روشن ہو جائے +

حیوانات، نباتات، جمادات یا جتنی صورتیں کائنات میں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کو اگلے حکما نے ہیجدہ ہزار عالم پر تقسیم کیا ہے۔ عالم ہفتدہ ہزار ہو یا ہیجدہ ہزار یا فوزدہ ہزار مجھے اس سے کچھ مطلب نہیں کیونکہ یہاں عالم کی تحلیل کیمیاوی مقصود نہیں ہے۔ البتہ شاعری سے جہانتک تعلق ہے۔ اس کے لحاظ سے۔ گرد و پیش کی دنیاوی چیزیں اور اُن کے

[1] انگلستان میں شاعری ۱۸۱۰ء کے بعد بہت مقبول ہوئی اسقدر کہ انیسویں صدی میں نہ تھی۔ ایڈیٹر + [2] مگر اب اقبال اور ٹیگور کا دور دورہ ہے۔ ایڈیٹر +

باہمی تعلقات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے دو عالم ہیں۔ عالم داخلی و عالم خارجی + ان کے سمجھنے کے لئے کسی آدمی کی مثال لے لیجئے۔ اُس کا عالم خارجی تو وہ ہے۔ جس میں دنیا کی مادی یا غیر مادی (جو اُس کی ذات واحد کی اندرونی کیفیتوں سے علیحدہ ہیں) چیزیں داخل ہیں + اُس کا عالم باطنی وہ ہے جس میں محسوسات۔ جذبات۔ وجدان۔ مدرکات۔ تخیلات وغیرہ کی مختلف النوع قوتیں شامل ہیں + جس طرح عالم ظاہری کا تجربہ کرنے اور جنس وار ترتیب دینے سے اک غیر متناہی سلسلہ میں۔ دنیا کی تمام چیزیں ہمارے پیش نظر ہوتی ہیں۔ وہی کیفیت عالم باطنی کی بھی ہے۔ مثلاً دنیا کی چیزوں کو حیوانات۔ نباتات۔ جمادات اور اسی قسم کی چیزوں میں تقسیم کیجئے۔ تو اُن میں ایک غیر متناہی سلسلہ ہمارے پیش نظر ہوتا ہے + یہی کیفیت ہمارے اندرونی عالم کی ہے + مثال کے طور پر محض دو کیفیتوں کو لے لیجئے۔ محبت اور عداوت +

اب صرف محبت پر غور کیجئے۔ والدین۔ اولاد۔ زوجین۔ اعزا۔ اقارب۔ احباب اور دیگر متعلقین کی محبت۔ اقسام محبت۔ اسباب محبت پر غائر نگاہ ڈالئے۔ تو محبت میں ایک غیر محدود کیفیت دکھائی دیگی + ان کے بعد رشک۔ حسد۔ طمع۔ عداوت۔ اور ایسی ہی کیفیتوں پر نگاہ تعمق ڈالئے تو اندرونی عالم کی وسعت بیرونی عالم سے ہرگز کم نہیں + اس طرح ہر شخص کے لئے دنیا دو صورتوں میں وجود رکھتی ہے + اس طرح دنیا کی چیزوں کو دیکھ کر اُن کے آثار سے متکیف ہونا اور اُن کے بعینہٖ اظہار سے دوسروں کو متاثر کرنے کا نام شاعری ہے + اس طرح پر شاعری کی تعریف کی جائے تو تین لوازم شاعری لاینفک معلوم ہوتے ہیں۔ جنہیں عناصر شعر کہہ سکتے ہیں (۱) مشاہدات سے متاثر ہونا (۲) اُن کی سچی اور موافق فطرت تصویر کھینچنا۔ (۳) اظہار مطالب کے لئے حُسنِ ادا[1] +

جس شخص میں یہ تینوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جائیں۔ وہ پورا شاعر ہے اور جس جس طرح ان قوتوں میں کمی پائی جاتی ہے۔ شاعری میں اُتنا ہی نقص رہ جاتا ہے + شاعر کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اُس کا نتیجہ فکر بالکل موافق فطرت۔ حقیقت و واقعیت لئے ہوئے ہو + فطرت سے جتنی دوری ہوتی جائے گی۔ شاعر اُتنا ہی نفس شاعری سے علیحدہ ہوتا جائیگا + شاعر کے رشحات طبع چاہے کتنے ہی خوش آیند کیوں نہ ہوں۔ ان میں جبتک اصول فطرت کا سچا اور گہرا اثر نہ پایا جائیگا۔ ان پر شاعری کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ عناصر شاعری سے دو چیزوں کی کمی پائی جائے گی۔ اوّل یہ کہ فطرت کا غلط اثر اس پر قایم ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو تصویر اُس نے کھینچی ہے وہ اپنی اصل سے متغائر ہے + اگر ادائے مطلب میں کچھ نقص رہ گیا ہے۔ تو یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ تصویر بھونڈی ہے۔ رنگ و روغن بدنما ہے۔ مگر قالب بے جان کی مصداق نہیں ہو سکتی +

افہام و تفہیم کی غرض سے شاعری کے اتنے مدارج طے کرنے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ شاعری کی بکاولی کتنے بھیس بدل سکتی ہے +

آثار قدرت سے متکیف ہونے والی چیز انسان میں ایک ہی ہے جسے علوم قدیمہ کے اصول سے 'دل' اور علوم جدیدہ کے اصول سے 'دماغ' کہتے ہیں۔ دماغ ہی وہ کرّہ ہے۔ جسے ہم اندرونی عالم (ذہن) کا دار القرار کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اظہار مافی الضمیر کے لئے فطرت نے انسان میں کئی قوتیں اور اُن کے آلے ودیعت کئے ہیں + یہیں سے مختلف اقسام شاعری کی شاخیں پھوٹتی ہیں + اظہار خیالات و جذبات وغیرہ انسان دو طریقوں پر کرتا ہے۔ یا تو آواز سے یا افعال سے + اس طرح شاعری[2] کی دو قسمیں ہوتیں شاعری بالصوت اور شاعری بلاصوت + خاموش شاعری کے ذیل میں مصوری۔ نقاشی اور پنٹومائم داخل ہیں + پنٹومائم ایک انگریزی لفظ ہے جس کا ترجمہ 'محاکمات صامتہ' کیا جا سکتا ہے + اس سے مراد وہ خاموش افعال ارادی ہیں۔ جن میں مختلف اعضائے جسمانی کو حرکت دے کر اندرونی کیفیتوں کا اظہار یا کسی بیرونی منظر کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے +

شاعری بالصوت میں موسیقی یعنی آواز کی شاعری (جس میں لفظوں کی قید نہیں ہے) اور لفظی شاعری داخل ہیں + لفظی شاعری میں نظم و نثر داخل ہیں + یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ کہ نظم ہی وہ چیز ہے۔ جسے عرف عام میں شاعری کہتے ہیں + ہم نے شاعری کی جو تعریف کی ہے۔ وہ نہایت جامع ہے۔ اور اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ آزاد سے آزاد شاعر کے لئے اس کی جولانگاہ کس قدر وسیع ہے + تطویل لاطائل کے خیال سے ہم اس مقام پر شاعری کی مختلف شاخوں کا ذکر اور اس بیان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ کہ کن کن باتوں کے نہ پائے جانے سے بہ حیثیت شاعری نقص واقع ہوگا + مثال کے طور پر ہم پنٹومائم کو لیتے ہیں۔ اگر متفاعل غصہ کی حالت دکھانا چاہتا ہے۔ اور اُس کی مجموعی حالت سے غیظ کے آثار کا اظہار نہیں ہوتا۔ یعنی

[1] اظہار اور تاثر کا فرق اور سچی تصویر کھینچنے کی شرط اور پھر اسکا اظہار سے فرق شاعری میں بالکل بے وجود ہے (ایڈیٹر)
[2] شاعری کی بجائے آرٹ (صنعت) کا لفظ زیادہ واضح ہوتا۔ (ایڈیٹر)

اُس کی آنکھوں میں سرخی یا غصہ کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔ اس کے بُت نما چہرہ پر تبسم ہٹ نہیں ہے۔ اعضا و جوارح میں کسی طرح کا اضطراب نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سکون و اطمینان پایا جاتا ہے تو وہ شخص شاعر نہیں ہے۔ ایسی ہی مثالیں مصوری اور موسیقی کی بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ شاعری کی ذیل میں مصوری کو بھی میں نے لیا ہے۔ ممکن ہے کچھ حضرات اس خیال کے ہوں۔ کہ مناظر قدرت یعنی عالم بیرونی کا نقش تو مصور اُتار سکتا ہے۔ مگر غم و غصہ۔ فرحت و انبساط وغیرہ کی کیفیتیں کیونکر ظاہر کر سکتا ہے۔ ایسے حضرات کی خدمت میں یہ عرض ہے۔ کہ جس حد تک علم مصوری نے ترقی کی ہے۔ اُس پر نظر کرتے ہوئے مصوری پر یہ اعتراض کرنا اور اُسے شاعری کی حد سے خارج سمجھنا گویا اُس پر کند پھیرنا ہے۔

صناعی کے عمل اور اکمل سرتوں کو جانے دیجئے۔ محض خاکوں کی معمولی تصویروں پر نظر کیجئے۔ کس خوبی اور صفائی سے بنائی جاتی ہیں۔ کہ بالکل اپنی اصلیت سے مشابہ ہوتی ہیں۔ غصہ وغیرہ کے نرخ سے بشرہ پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ کس [illegible] کی کاغذی سطح پر نمایاں کی جا سکتی ہے۔ ابتدا میں ہم کہہ آئے ہیں۔ کہ شاعری [illegible] کے لئے [illegible] موسیقی اور مصوری میں بھی ترقیاں ہو رہی ہیں۔ وہ بھی اُن کی شاعری کی جو تعریف ہم نے کی ہے اُس میں موسیقی اور مصوری کو بھی داخل کیا ہے۔ وہ اسی بنا پر کہ [illegible] حیثیت سے ان فنون لطیفہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ [illegible]

[illegible]

شاعر [illegible] بیان کر چکا ہوں۔ محض لفظوں کا گورکھ دھندا نہیں ہے۔ نہ وہ چند الفاظ میں مقید ہے اور اک شاعر کی جولانگاہ کائنات کی تمام سرحدوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ایک ایک ذرہ (خواہ لفظ کی صورت میں ہو یا مرکبات کی شکل میں) شامل ہے۔ قوائے ذہنیہ پر جو ہم غور کرتے ہیں۔ تو ہمیں یہ چیزیں صاف نظر آتی ہیں۔ انسان اپنے حواس خمسہ سے تمام چیزوں کو محسوس کرتا ہے۔ اپنے ذہن کی بدولت مختلف کیفیتوں طبعی سے لذت اُٹھاتا ہے۔ گویا ذہن ایک آئینہ ہے۔ جس پر ہر چیز [illegible]

پڑتا ہے۔ اور اُس کا عکس جم جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ ذہن ایک لحاظ سے آئینہ سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ ذہن کے لئے کسی شے کا سامنے ہونا لازم نہیں۔ جیسا کہ آئینہ کے لئے ہے۔ کہ وہ شے سامنے سے ہٹ گئی تو نقش بھی غائب ہو گیا۔ ذہن یعنی اُس کا دارالقرار (دماغ) ایک ایسی شے ہے۔ کہ جب کوئی چیز اس کے سامنے آتی ہے۔ تو اس پر منطبع ہو جاتی ہے محو نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ ہم میں قوت استحضار نہ ہو یعنی حسب خواہش بعض وقت وہ ہمارے پیش نظر نہ ہو سکے۔ لیکن دماغ پر جو نقش مرتسم ہوتا ہے وہ ایک مستقل شے ہے۔ جو کسی نہ کسی وقت مناسب ماحول۔ مناسب ربط و سلسلہ میں ضرور ہمارے پیش نظر ہو جائیگا۔ اس کے علاوہ ہمارے ذہن میں ایک اور خصوصیت ہے جو آئینہ میں نہیں ہے وہ یہ کہ ہمارا ذہن بغیر کسی شے کی موجودگی کے۔ بغیر کسی مشاہدہ کے بھی اک بات پیدا کر لیتا ہے۔ ذہن کے اس فعل کا نام ادراک ہے۔ اس کے علاوہ ذہن کی کچھ اور حالتیں بھی ہیں جن کا سمجھنا لازمی ہے۔ مثلاً ہم کسی شے کے وجود یا اُس کی ماہیت کو خیال کریں۔ اور وہ پہلے [illegible] ذریعوں سے ہمارے ذہن میں گزرتی ہے۔ ذہن کے اس فعل کو تصور کہتے ہیں۔ جب ہم دو تصورات کو ملاتے ہیں اور اُن میں ایک حکم قائم کرتے ہیں تو اسے تصدیق کہتے ہیں۔ [illegible] خود بخود [illegible] ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ تصور و تصدیق کے پیدا ہونے کے لئے ایک اور قوت کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی قوت حافظہ۔ شاعر کو عالم خارجی یا داخلی کا ادراک اور احساس ہوتا ہے۔ مگر غیر شاعر اور شاعر میں یہ فرق ہے۔ کہ شاعر بدرجہ غایت شدید الادراک و شدید الاحساس ہوتا ہے۔ اُس کے دماغ میں تمام نقوش محفوظ رہتے ہیں۔ اور وہ بالکل [illegible] اُسے آجاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے ظاہری حواس [illegible] کر رہا ہے۔ اس سے اک اور بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ کہ [illegible] شاعر کے لئے شدید الحافظہ ہونا بھی لازمی ہے۔ شدت حافظہ کے [illegible] جہاں [illegible] کیفیت و کمیت چاہے وہ اس سے کتنی ہی بعید ہوں۔ [illegible] گئی ہے۔ بنسبت دوسرے کے جن میں یہ قوت کم ہے اُس کے پیش نظر [illegible] تصورات و تصدیقات کو اک باقاعدہ تنظیم کے ساتھ شاعر اپنے [illegible] رکھتا ہے۔ اور جس وقت جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے [illegible] ربط و ترتیب سے۔ گویا بکھرے ہوئے پھولوں کا اک گلدستہ تیار کر دیتا ہے۔ [illegible] کسی شے یا کسی امر کی بابت غور و خوض کرنے یا خود بخود

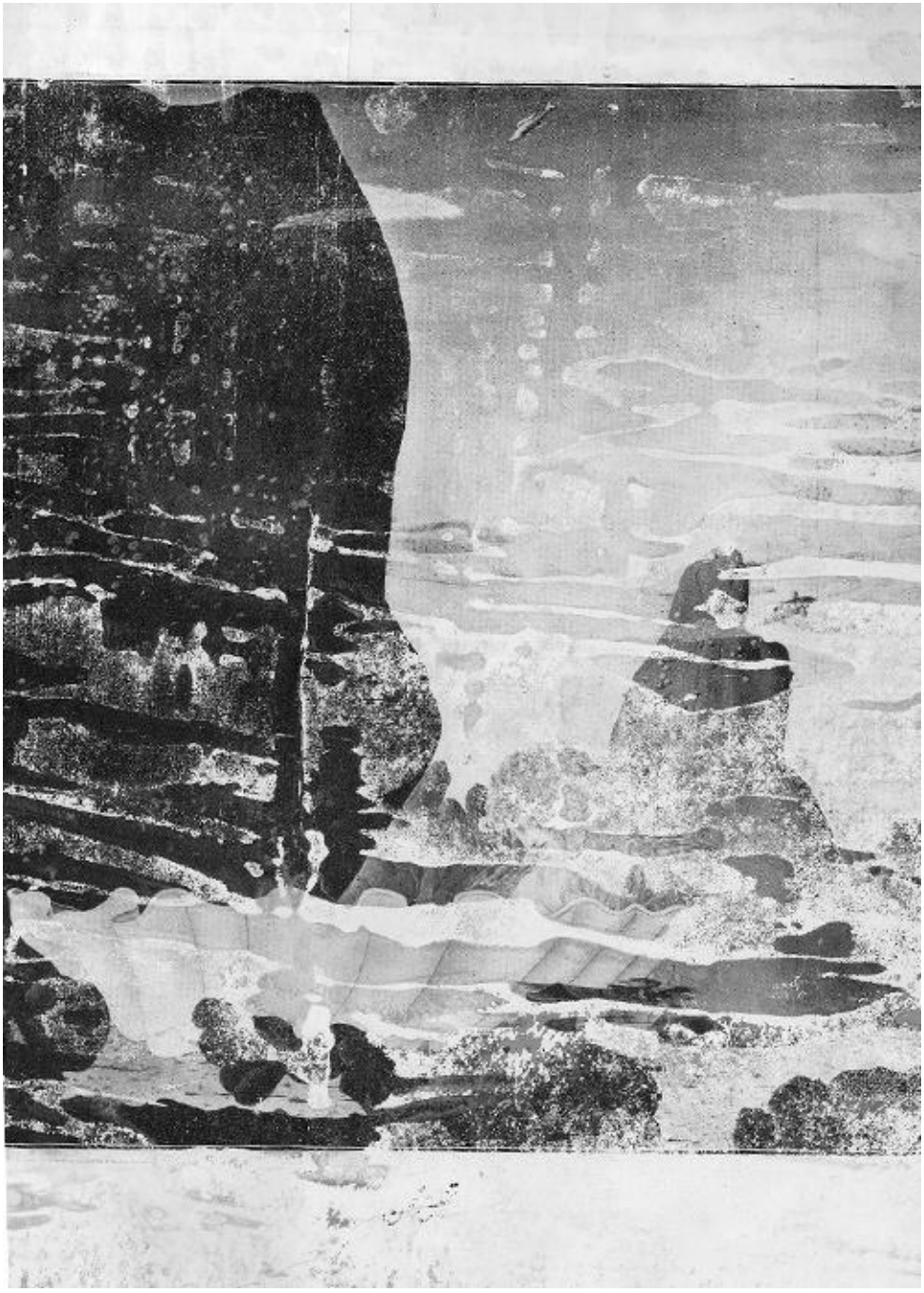

بطور الترتیب ان کے نقش قایم کرنے کا مجموعی نام تخیل ہے۔ اگر ہم غور کریں۔ تو ہمیں شاعری کے مختلف اصناف پیدا ہوتے ہیں۔ تخیل میں تمام درکا محسوسات شامل ہیں۔ ان کے صحیح صحیح اظہار کا نام شاعری ہے۔ یہ اظہار اشارات واصوات کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اشارات چاہے منقوش ہوں یا غیر منقوش۔ اصوات لفظی ہوں یا غیر لفظی۔ ہر شخص پر وجدانیات وحسیات کے لحاظ سے ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جس سے متاثر ہوکر وہ اپنے داخلی جذبات کو عالم ظاہری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ در اصل اسی کا نام شاعری ہے۔ اگر شاعر نے عالم خارجی کا نقش کھینچا ہے۔ وہ شاعری خارجی ہوگی۔ اگر باطنی کیفیتوں کا اظہار کیا ہے تو وہ داخلی ہوگی۔ یہاں ایک بات خود بخود ہمارے پیش نظر ہوجاتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم زیادہ تر بذریعہ الفاظ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لئے شاعری کی حدیں سمٹ کر لفظوں میں محدود ہوجاتی ہیں۔ الفاظ کے ذریعہ سے خیالات کا اظہار دو طریقے پر ہوتا ہے

ایک نثر کی پریشان آرائی۔ دوسرے نظم کی موزونیت۔ اب ظاہر ہے کہ خیال میں کتنی ہی قوت کیوں نہ ہو۔ لیکن محض اس لئے کہ وہ پریشان ہے۔ کس میں وہ قوت۔ صولت۔ شوکت۔ ہیبت اور دبدبہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ جو مربوط و موجز موزونیت یعنی صورت منظومہ میں ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری نظم میں اگر مقید ہوگئی۔ اس کے آگے ایک اور درجہ ہے۔ انسان فطرۃً ہم وزن ہم پایہ۔ ہم درجہ ہمشکل ہم صل۔ اور ہم رنگ چیزوں کو ایک جا پاکر زیادہ محظوظ ہوتا ہے۔ یہاں سے شاعری کی اک اور شاخ پیدا ہوتی ہے۔ یعنی صنایع لفظی ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگر ایک کلام موزوں کا انتظام کسی خاص ادائے صوت سے ہوتا ہے جس کی ترتیب برابر قائم رہتی ہے۔ تو وہ کانوں کو زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح ہماری نظم کی شاعری قافیہ اور ردیف میں اگر مقید ہوگئی۔ جس کے بغیر اردو زبان میں شاعری اک ادھورا چیز نظر آتی ہے +

پروفیسر محمد ابو البقا بی اے جونپوری

احساساتِ شاعری

انیسویں صدی میں انگریزی شاعری زیادہ تر رسم الخط اور قوافی کا آلہ پھیر ہو گئی۔ جذبات اول تو مفقود تھے اور اگر تھے تو دور انحطاط کی جملہ اعتدالیوں کا نمونہ تھے۔ شرافت کو جس نے مغرور گردانتے تھے ..... کہ یہ قوم ..... ہے اور یہ محض اس لئے مرغوب سمجھتے تھے کہ ..... عام ..... ایک ہے۔ اور تو اور یہ جدت پسندی بہت جلد بدی سے بھی ہوگئی۔ اور جذبات کے پیاسے شعرا بلند و ..... پر کرنے لگے

دردِ آشامی زجام معصیت ہم کردہ ام
چہ ..... خواہم دگر بیداریٔ احساس را (تاثیر)

اس دور میں شاعر نہ تو فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ ..... کرتے۔

فطرت سے گریزاں اس لئے تھے کہ ان کا دل احساسات سے عاری ہوچکا تھا۔ اور کوئی احساس تھا تو عدم احساس کا۔

فسانۂ عجائب اور باغ و بہار

از ابو الخیرات سید غلام محی الدین قادری ام۔اے (عثمانیہ)

(۱)

ابھی تیرھویں صدی ہجری کو شروع ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرنے پایا تھا۔ اور ہندوستانیوں کی سیاسی قوتیں ایک نئی اور تازہ دم قوم کی سرگرمیوں کے مقابلہ میں پسپا ہو کر پوری طرح نیست و نابود نہیں ہوئی تھیں کہ زبان اُردو کی فطری دل کشیوں نے ہندوستان کے جدید فاتحوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے اپنی بزرگداشت پر مجبور کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو۔ وہ اُردو جس کا تمام سرمایہ صرف شاعروں کے دیوانوں پر منحصر تھا اور جس میں نثر آرائی اس وقت ملک معیوب سمجھی جاتی تھی بہت جلد ایک وسیع اور مستقل زبان بن گئی۔ اور وہی اُردو جس میں بارھویں صدی ہجری کا آفتاب غروب ہونے سے پہلے نثر کی معدودے چند کتابیں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ چند ہی سال میں قصوں۔ کہانیوں۔ مذکروں۔ تاریخوں اور اخلاقی اور صوفیانہ تصنیفات کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال ہو گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تمام ہندوستان طوائف الملوکی کا گہوارہ بنا ہوا تھا دہلی کبھی کی اُجڑ چکی تھی۔ اور۔ اگرچہ لکھنؤ میں بظاہر کچھ شان و شوکت باقی رہ گئی تھی۔ لیکن وہ بھی ہندوستان کے اس بیمار سطوت و اقبال کا ایک آخری سنبھالا تھا جس کے بعد ہی سے اس کی حقیقی آزادی بظاہر ہمیشہ کے لئے اس سے سلب کر لی گئی۔

اس زمانہ میں اگرچہ اُردو کی بساط میں کچھ اضافہ ہوا۔ اور اس وقت کی علمی و ادبی یادگاروں میں سے کئی ایک ایسی بھی ہیں جن کی وجہ سے اُردو نثر کو ارتقائی منزلوں سے گذرنے میں بہت زیادہ آسانی حاصل ہو گئی۔ لیکن ان سب میں ہمارے اس مضمون کے موضوع باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کو خاص طور پر امتیاز حاصل ہے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور اور میر امّن دونوں تقریباً ایک ہی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ لیکن مختلف ماحول میں رہنے کے باعث ان کی ذہنیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ اور یہی وہ فرق ہے جو ان دونوں کتابوں —— یعنے فسانۂ عجائب اور باغ و بہار —— میں ایک خاص نمایاں حیثیت کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ اور ادبیات اُردو کے مطالعہ کرنے والوں کو اس امر کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ ان دونوں کا بالمقابلہ مطالعہ کریں۔

فسانۂ عجائب باغ و بہار سے ٹھیک تیئس۲۳ برس بعد لکھی گئی۔ باغ و بہار کے آخر میں میر امّن نے اپنی کتاب کے نام اور اُس کے لکھے جانے کی تاریخ کے متعلق لکھا ہے۔ کہ "جب یہ کتاب فضل آلٰہی سے اختتام کو پہنچی۔ جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں۔ کہ اس میں تاریخ نکلے، جب حساب کیا ۱۲۱۵ھ کے آخر میں لکھنا شروع کیا تھا۔ باعث عدم فرصتی کے بارہ سو سترہ کے سنہ ابتدا انجام ہوئی۔ اسی فکر میں تھا کہ دل نے کہا باغ و بہار اچھا نام ہے۔ کہ ہم نام و تاریخ اس میں نکلتی ہے۔ تب میں نے یہی نام رکھا"[1] اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر امّن نے باغ و بہار کی تکمیل تین سال کے عرصہ میں کی۔

فسانۂ عجائب کی طرح باغ و بہار ایک تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا ترجمہ ہے۔ جو غالباً خود بھی ایک دوسرے ترجمہ پر مبنی ہے۔ میر محمد حسین خاں تحسین نے (جو میر باقر خاں شوق کا بیٹا اور اوّل اوّل جنرل اسٹنگ کا ملازم تھا) نواب شجاع الدولہ کے متوسلوں میں شامل ہونے کے بعد جب فیض آباد کی سکونت اختیار کی۔ تو امیر خسرو کی چہار درویش کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ یہ کام نواب آصف الدولہ کے عہد میں بھی جاری رہا۔ لیکن نواب کی وفات موقوعہ ۱۷۹۵ء سے قبل اختتام پا چکا تھا۔ کیونکہ اس میں نواب کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے۔ اس سے نیز دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کتاب کے اختتام کے وقت نواب آصف الدولہ بقید حیات تھے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر بلوم ہارٹ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سنہ تصنیف تقریباً ۱۷۸۸ء ہے۔

[1] دیکھو باغ و بہار مطبوعہ یونین پریس لاہور ۱۹۲۷ء صفحہ ۲۷۸۔ آئندہ بھی اسی ایڈیشن سے حوالے پیش کئے جائیں گے۔

اگرچہ تحسین کے کارنامے نے "نوطرز مرصع" کے نام سے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس کا اسلوب نہایت رنگین اور پُر تکلف تھا۔ اس لئے اُردو زبان و ادب کے ایک محسن ڈاکٹر گلکرائسٹ نے میر امّن سے فرمائش کر کے چہار درویش کا ایک اور ترجمہ کرایا۔ جو باغ و بہار کے نام سے مشہور ہوا۔ اور جو موجودہ مضمون کا موضوع ہے۔ اس ترجمہ کے علاوہ اُردو میں چہار درویش کے اور بھی ترجمے ہوئے تھے۔ جن کی تفصیل "کتب خانہ انڈیا آفس ہندوستانی قلمی نسخوں کی فہرست" کے نمبرات ۱۲۸ تا ۱۳۲ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس تفصیل کے مطالعہ سے ہمیں امیر خسرو کی چہار درویش کی مقبولیت کے اس غیر معمولی درجہ پر حیرت ہوتی ہے۔

اگرچہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب کا قصہ ——— جیسا کہ اُنہوں نے اس کے دیباچہ میں بیان کیا ہے ——— ایک ہی سال میں قلمبند کر لیا۔ لیکن وہ ایک عرصہ قبل ہی اس قصہ کو لکھنؤ کی ایک دلچسپ صحبت میں سُنا چکے تھے۔ اور ان سے وہیں ان کے احباب نے اس کو قلمبند کرنے کی فرمایش کی تھی۔ چنانچہ اُسی وقت سے اُن کو اسکا خیال تھا۔ اور جب وہ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ میں تلاش معاش کی خاطر کانپور پہنچے تو وہاں اس قصہ کو ضبط تحریر میں لانے کا موقع ملا۔ ایک ہی سال میں اُنہوں نے اس کو اختتام تک پہنچا کر حسب ذیل تاریخ لکھی[1] ؎

جس نے کہ سُنا اس کو جی میں یہ لگا کہنے — یا رب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا
تاریخ سرور اس کی منظور ہوئی جس دم — بیساختہ جی بولا نشتر ہے رگ دل کا

(۲)

یہ بات ادبی انصاف کے خلاف ہے کہ ایک ترجمہ کا ایک تصنیف کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ لیکن میر امّن کی باغ و بہار ایک ایسا ترجمہ ہے جو اصل چہار درویش اور نوطرز مرصع دونوں سے غالباً کئی امور میں مختلف ہے۔ میر امّن نے نہ صرف اسلوب میں نوطرز مرصع سے علیحدگی اختیار کی بلکہ بعض اصولی امور میں بھی وہ آزاد نظر آتے ہیں۔ مثلاً نوطرز مرصع میں قصہ کے ہیرو بادشاہ (جس کے ذریعہ سے چاروں درویشوں کے مطلب برآتے ہیں) کا نام فرخندہ سیر لکھا ہے۔ لیکن باغ و بہار میں اس کو ہر جگہ آزاد بخت کے نام[2] سے یاد کیا گیا ہے۔ میر امّن نے باغ و بہار کی ترقیم کے وقت جس قسم کی آزادی اختیار کی۔ اس کے متعلق تفصیل وار بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں صرف اس امر کا اظہار ضروری تھا۔ کہ وہ بالکل آزاد ترجمہ ہے۔ ایک ایسا ترجمہ ہے جس میں میر امّن نے اپنی تخلیقی قوت سے اسقدر کام لیا ہے۔ کہ وہ قریب قریب ایک تصنیف کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے۔

فسانہ عجائب کے متعلق بھی فی الحال کوئی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ آیا وہ خالص تخلیق ہے یا کسی قدیم فسانہ کا ترجمہ؟ تاہم اتنا ضرور ہے کہ باغ و بہار کی طرح اس میں بھی مصنف نے اپنی طبیعت اور اپنے زمانہ کی مخصوص کیفیتوں کے اثرات نمودار کر دیئے ہیں۔ اور چونکہ دونو بالکل قریبی زمانہ میں لکھی گئی ہیں۔ اس لئے ان کا مقابلہ ناانصافی نہیں ہے۔

۲۔ قریب قریب ایک ہی زمانہ کی پیداوار ہونے کے علاوہ یہ دونو فسانے موضوع کے لحاظ سے بھی بالکل متحد ہیں۔ لیکن اس بارے میں بھی وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اسقدر مختلف ہیں۔ کہ اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کرنا ایک خاص دلچسپ ادبی شغل معلوم ہوتا ہے ——— ایک ایسا ادبی شغل جس کے لئے کوئی صاحب ذوق مجبور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۳۔ تاریخ ادبیات اُردو میں ان دونوں کتابوں کا مرتبہ ایک اور نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ کتابیں اُردو کے دو خاص دبستانوں کی ترجمان ہیں۔ یعنے باغ و بہار ایک دہلوی کا کارنامہ ہے۔ اور فسانہ عجائب ایک لکھنوی کا۔ اس لحاظ سے جب ہم ان دونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں ان دونوں دبستانوں کے نقاط خیال کا خاص طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ جس طرح باغ و بہار میں میر امّن کی ذہنیت کے علاوہ دہلی کے مخصوص اثرات جھلک پڑتے ہیں۔ فسانہ عجائب میں اس کے مصنف کی قلبی کیفیات کے علاوہ اس کے ہم وطنوں کے دماغی رجحانات بھی ہویدا رہتے ہیں۔

مقابلہ کے یہ دو تین اسباب تو ایسے تھے۔ جو غیر ارادی طور پر ان دونوں کتابوں میں ان کے مصنفین کی جانب سے پیدا کر دیئے گئے تھے۔ لیکن ایک دو سبب ایسے بھی ہیں۔ جو عمداً اختیار کئے گئے تھے۔ اور جن کی وجہ سے ان دونوں کا بالمقابلہ مطالعہ ایک ادبی فرض کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

۴۔ پہلا سبب تو یہ ہے۔ کہ فسانہ عجائب عمداً باغ و بہار کے مقابلہ میں

[1] دیکھو فسانہ عجائب مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۵ء صفحہ ۲۲۰۔ آئندہ بھی فسانہ عجائب کے صفحات کے جو حوالے آئینگے وہ اسی اڈیشن کے لحاظ سے ہونگے۔

[2] یہ تو کچھ ایسی موقر آزادی نہیں (ایڈیٹر)

لکھی گئی ہے۔ کیونکہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنے دیباچہ میں میر امّن پر طعن کرکے اس کا علی الاعلان اظہار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "اگرچہ اس ہیچمیرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اُردو زبان پر لائے۔ یا اس افسانہ کو بہ نظر نثاری کسی کو سُنائے۔ اگر شاہجہان آباد کہ مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا۔ وہاں چندے بود و باش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا۔ جیسا میر امّن صاحب نے چار درویش کے قصہ میں بکھیڑا کیا ہے۔ کہ ہم لوگوں کے ذہن و حصہ میں یہ زبان آئی ہے۔ دلّی کے روڑے ہیں۔ محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بیہودگی سے انکار۔ بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔ یہ وہی مثل سُننے میں آئی۔ کہ اپنے مُنہ سے دُھنا جائی"۔

سرور نے اپنے اس مقالہ کے خیال کا عملی ثبوت فسانہ عجائب میں اکثر جگہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں اس کا ایک پہلا ثبوت ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جس طرح میر امّن نے کتاب کے شروع میں اپنے وطن دلّی کی کچھ تعریف کی ہے۔ سرور نے بھی آغاز کتاب میں لکھنؤ کی تعریف کا التزام کیا ہے۔ اور اس میں خاص طور پر رنگینی اور عبارت آرائی سے کام لیا ہے۔

۵۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جس طرح میر امّن نے قدیم طرز انشا پردازی کو چھوڑ کر ایک بالکل علیحدہ اور آزادانہ اسلوب استعمال کیا۔ سرور نے بھی عمداً ایک ایسا طرز بیان اختیار کیا۔ جو ہر طرح سے میر امّن کی طرز تحریر کا ضد تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے خاص دبستان کی طرز تحریر سے علیحدہ کوئی اسلوب نہیں بنایا لیکن میر امّن کے مقابلہ کی خاطر اس میں ہر جگہ اور ہر بات میں اضافے کر دیئے۔ ان اضافوں کے باعث ان کے اسلوب کو اُردو انشا پردازی کی تاریخ ارتقا میں جو حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس پر بھی ایک خاص تفصیلی بحث کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم اپنے اس مضمون میں متذکرہ بالا چند ضروری امور کا اظہار کرنے کے بعد جن نقاط نظر کے لحاظ سے ان دونوں کتابوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں وہ خالص فسانوی ہیں۔ یعنے ہم آئندہ ان دونوں کتابوں کے صرف اسی پہلو پر نظر ڈالیں گے جس کا تعلق براہ راست اُردو زبان کے افسانوں اور اُنکے فنّی ارتقا سے ہے۔

(۳)

فسانہ عجائب اور باغ و بہار جس زمانہ کی پیداوار ہیں وہ اُردو زبان کا عبوری دور تھا۔ اور اُس وقت ..... فن افسانہ ارتقائی منزلوں سے گذر رہا تھا۔ ان ارتقائی منازل میں اُردو کے افسانے چند متعین اصولی خصوصیات پر منحصر تھے اور فسانہ عجائب اور باغ و بہار دونوں میں وہ تمام خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو اس وقت قصوں اور داستانوں کے لئے اجزائے لاینفک کا مرتبہ رکھتی تھیں۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ قصہ گو اپنی وسیع معلومات اور قوی حافظہ کی مدد سے اثنائے بیان میں ایک ہی قسم کی چیزوں کی پوری پوری فہرست اور کیفیات پیش کر دیتا تھا۔ یہ فہرستیں اور کیفیتیں اگرچہ بعض بعض مقامات پر ناگوار بھی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ لیکن ان کے ذریعہ سے کسی تنقیدی نظر سے مطالعہ کرنے والے کو کئی قسم کی آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔

جس طرح "مناقب بازی" میں کمال اور کامیابی متعدد اور مختلف الموضوع اشعار کے یاد ہونے پر منحصر رہتی ہے داستان گو کے ماہر خصوصی کے لئے مختلف النوع اشیا کی تفصیلی معلومات کی کماحقہ واقفیت اور مکمل فہرست کا ورد زبان ہونا ضروری ہے۔ قصہ کو طول دینے اور سامعین کو اسمیں محو رکھنے کے لئے ہوشیار قصہ گو کو اس قسم کے گُر سے ضرور کام لینا پڑتا ہے۔ اس پر عمل کرتے وقت وہ اس تیزی سے متعدد نام گنا جاتا ہے اور ایک ہی سانس میں اتنی کائنات پیش کر دیتا ہے۔ کہ سامعین بجائے ناموں کی کثرت سے بیزار ہونے کے اس کی کامل اُستادی اور مہارت کی داد دینے لگتے ہیں۔

اُستاد قصہ گو اپنی قابلیت کے اظہار اور اپنی اسی قسم کی طاقت کے صرف کرنے میں نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے لفظی مرقعوں میں... متانت قایم رکھنے کے لئے اپنی تمام معلومات ایک ہی مرحلہ میں نہیں صرف کر دیتے۔ بلکہ تنوع کی خاطر کبھی ایک قسم کی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اور کبھی دوسری قسم کی۔ اور ایک ہی قسم کی اشیاء میں بھی سب کا نام ایک ہی دفعہ نہیں کہہ جاتا۔ بلکہ کچھ آئندہ کے لئے بھی اُٹھا رکھتے ہیں۔ مثلاً بعض دفعہ انہیں کسی بہت بڑے باغ کا ذکر کرنا ہوتا ہے تو اس کے ذکر سے پہلے جتنے بھی باغوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اُن سب کے لوازمات کا معمولی اظہار کرتے ہیں۔ اور جب اس خاص باغ کا بیان آتا

تو اپنی ساری معلومات پیش کر دیتے ہیں۔ تاکہ سُننے والوں پر اس کی اہمیت ظاہر ہو جائے۔

اُردو کے ہر قدیم حصّہ میں داستان گوئی کی اس خصوصیت کے آثار کثرت سے نمایاں ہیں۔ چنانچہ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب بھی ان کی متفرق مثالوں سے ثبوت موجود ہے۔

اگرچہ مرزا رجب علی بیگ سرور کو اپنے طبعزاد قصّہ میں اپنے خارجی معلومات کے پیش کرنے کا میر امّن سے ——— جن کا قلم ایک خاص فضا میں محدود تھا ——— زیادہ موقع اور آزادی حاصل تھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنہوں نے جو کچھ بھی خارجی مرقع پیش کئے ہیں۔ اُن میں اپنے اس کمال کو معراج تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن ہر قسم کی چیزوں کی پوری فہرست اور معلومات پیش کرنے میں وہ میر امّن سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ فسانۂ عجائب میں اس چیز کا فقدان نہیں۔ لیکن باغ و بہار کے مقابلہ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فسانۂ عجائب میں یہ عنصر تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ اور اس کے علاوہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سرور کی نظر روزمرہ کی ضروریات اور معمولی معمولی چیزوں پر بہت گہری نہیں پڑتی تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک وہ شخص جو طبعزاد قصّہ قلمبند کر رہا ہو۔ اور قلمبند کرنے سے پہلے اس کو دوست احباب میں سُنا بھی چکا ہو۔ قصّہ سُنانے والوں کے اس عام گُر سے ناواقف رہے!! اور اگر واقف بھی ہو۔ تو اسقدر بے پروائی کے ساتھ اس سے برتاؤ کرے! اس کے برخلاف ایک ایسا شخص جو دوسروں کی فرمایش پر ایک پہلے سے لکھے ہوئے قصّہ کا ترجمہ کر رہا ہو۔ دوران تحریر میں معمولی معمولی چیزوں کے متعلق نہایت تفصیل کے ساتھ بے ساختہ لکھ جاتا ہے۔ موخر الذکر کی یہ بے ساختگی ظاہر کرتی ہے کہ وہ ان باتوں سے اوّل الذکر کے بہ نسبت زیادہ واقف ہے۔

جب ہم فسانۂ عجائب اور باغ و بہار میں جو تفصیل وار قیمتی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ان کا بالمقابلہ مطالعہ کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تو ہمیں ایک سرسری نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہ دونوں کے مصنفوں کو ایک ہی قسم کی اشیا کے تذکرہ کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ دونوں کتابوں میں اقسام طعام کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں میر امّن کے قلم سے حسب ذیل نام پہ در پہ ظاہر ہو جاتے ہیں:-

بخنی پلاؤ۔ قورما پلاؤ۔ متنجن پلاؤ۔ کوکو پلاؤ۔ زردہ قلیہ۔ دو پیازہ۔ نرگسی بادامی۔ روغن جوش۔ روٹیاں۔ باقرخانی۔ تنکی۔ شیرمال۔ گاؤدیدہ۔ گاؤزبان۔ نان نعمت۔ پراٹھے۔ کباب۔ کوفتے۔ مرغ کے خاگینے۔ ملغوبہ۔ شب دیگ۔ دم پخت۔ حلیم۔ ہریسہ۔ سنبوسے۔ ورقی۔ قبولی۔ فرنی۔ شیر برنج۔ ملائی۔ حلوا۔ فالودہ۔ پن۔ تھبائش۔ آب شورہ۔ ساق عروس۔ لوزیات۔ مربا اچار۔ دہی کی قفلیاں (دیکھو صفحہ ۸۷۔ اور ۸۸)۔

اس کے برخلاف سرور کی زبان سے کھانے کی بہت کم قسموں کے نام نکلتے ہیں:- مثلاً

پلاؤ۔ قلیہ۔ زردہ۔ قورمہ۔ شیرمال۔ فرنی۔ کباب (مسلمانوں کے کھانے) پوری کچوری۔ مٹھائی۔ اچار (ہندوؤں کے کھانے) (دیکھو صفحہ ۸۶)

کھانوں کی اقسام کی طرح دونوں نے شکاری جانوروں کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ میر امّن نے باز۔ بہری۔ جرہ۔ باشہ۔ سرخاب (دیکھو صفحہ ۲۱۹) کے نام۔ اور سرور نے۔ باز۔ بحری۔ باشے۔ شاہین۔ عقاب (دیکھو صفحہ ۲۱۵) کے نام پیش کئے ہیں۔

اسی طرح عورت ملازمین کا تذکرہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ باغ و بہار میں اس موقعہ پر ازدہنگنیاں۔ قلماقنیاں۔ حبشیاں۔ ازبکنیاں کشمیرنیاں ترکھینیاں وغیرہ (دیکھو صفحہ ۹۸) ناموں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جو زیادہ تر نسلی امتیاز پر مبنی ہیں۔ اس کے برخلاف فسانۂ عجائب میں مختلف پیشوں کی عورتوں کے نام پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً:- دائی۔ ددا۔ آتوں بغلانیاں (دیکھو صفحہ ۸۴) انا۔ چھد چھد۔ چٹھی نویس۔ باریدار۔ لونڈیاں۔ باندیاں۔ (دیکھو صفحہ ۱۱۷)۔

پھولوں کا ذکر کرتے وقت باغ و بہار میں صرف لالہ۔ فرمان۔ نرگس گلاب (دیکھو صفحہ ۱۷۸) کے نام لکھے گئے ہیں۔ اور فسانۂ عجائب میں انکی فراوانی ہے۔ مثلاً:- بیلا۔ چنبیلی۔ موتیا۔ موگرا۔ مدن بان۔ جوہی۔ کیتکی۔ کیوڑہ۔ نسرین و نسترن۔ سوسن۔ داؤدی۔ صدبرگ۔ گل مہندی۔ عباسی گل شبّو۔ نافرمان (دیکھو صفحہ ۵۴)۔

یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ سرور ایک دو قسم کی چیزوں کے ذکر میں امّن سے بہت زیادہ فیاض نظر آتے ہیں۔ لیکن نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل کے بمصداق اگر سرور نے میر امن کی پیش کی ہوئی چیزوں میں زیادتی کی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ

جو چیز قابل غور ہے وہ یہ ہے۔ کہ سرور ان ہی چیزوں کی تفصیل پیش کرتے ہیں جو ان کی طرز انشا پردازی میں انہیں استعمال کرنی پڑتی ہیں، وہ خارجی حالات کی ترجمانی کرنے اور واقعہ کو رنگینی کے ساتھ بیان کرنے میں اُستاد ہیں۔ اس لئے ان دونوں سے متعلقہ خاص چیزوں کی معلومات کا حاصل کرنا اور ان کا اظہار سرور کے لئے ضروری تھا۔ چنانچہ متذکرہ بالا قسم کی اشیا کے علاوہ فسانہ عجائب میں حسب ذیل چیزوں کا ذکر ہے۔ جو باغ و بہار میں بہت کم پائی جاتی ہیں:۔

۱۔ رمال۔ نجومی۔ پنڈت۔ جفروان ہیئت اور ہندسہ کا ماہر (صفحہ ۸)

۲۔ مشتری۔ مریم شمس۔ زہرہ۔ عطارد۔ قمر۔ زحل + (صفحہ ۸۵)

۳۔ حمل۔ ثور۔ جوزا۔ سرطان۔ اسد۔ سنبلہ۔ قوس۔ عقرب۔ جدی دلو۔ حوت۔ میزان + (صفحہ ۸۵)

۴۔ تلابر۔ چھیک۔ دھن۔ کمر کنجھ۔ مین۔ سیکھ۔ برکھ۔ متھن۔ کرک سنگھ۔ کنیاں + (صفحہ ۸۵)

۵۔ فاختہ۔ قمری۔ مور۔ تدرو۔ قاز۔ قرقرے + (صفحہ ۵۴)

۶۔ لولے۔ لنگڑے۔ کانے۔ کھدرے۔ گونگے۔ بہرے + (صفحہ ۸۵)

۷۔ بھانڈ۔ بھگتیے۔ ہیجڑے۔ زنانے۔ کشمیری قوال۔ بین کار۔ رباب۔ سرود۔ رنڈیوں کے طائفے + (صفحہ ۹۰)

۸۔ عربی۔ ترکی۔ تازی۔ عراقی۔ یمنی۔ کاٹھیاواڑی۔ دکھنی گھوڑے (صفحہ ۱۱۴)

اسی طرح حسب ذیل اشیا کی تفصیل خاص طور پر باغ و بہار میں پائی جاتی ہے:۔

۱۔ پھلجھڑی۔ انار۔ داؤدی۔ بھجنپا۔ مروارید۔ مہتاب ہوائی چرخی ہتھ پھول۔ جاہی جوہی۔ پہاڑے۔ بتاسے +

۲۔ چور۔ چکار۔ جیب کترے۔ صبح خیزے۔ اُٹھائی گیرے۔ دغاباز (صفحہ ۹) غنڈے۔ پھانکڑے۔ سفت پر کھانے پینے والے۔ جھولے۔ خوشامدی + (صفحہ ۲۳)

۳۔ بادام۔ پستے۔ انگور۔ ناشپاتی۔ انار۔ کشمش۔ چھوہارے + (صفحہ ۸۵)

۴۔ یتیم۔ یسیر۔ عیال دار۔ محتاج۔ رانڈ۔ بیوہ + (صفحہ ۱۴)

۵۔ چوپڑ۔ گنجفہ۔ شطرنج۔ تختہ نرد + (صفحہ ۲۱۸)

۶۔ شطرنجی۔ قالینیں۔ سیتل پاٹی۔ منگل کوٹی۔ دیوار گیری۔ چھت پردے۔ چلونیں۔ سائبان۔ ٹگیرے۔ چھپر کھٹ۔ غلاف۔ لوچے توشک۔ بالاپوش۔ سیج بند۔ چادر۔ تکیئے۔ تکیئے گل تکیئے۔ مسند گاؤ تکیئے + (صفحہ ۹۹)

۷۔ دیگ۔ دیگچے۔ پتیلے۔ طباق۔ رکابی۔ بادیئے۔ تشتری۔ چمچے پکاؤلی۔ کف گیر۔ طعام بخش۔ سرپوش۔ سینی۔ خوان پوش۔ تورہ پوش۔ آب خورے۔ بجھرے۔ صراحی۔ لگن۔ پاندان چوگڑہ چنگیر۔ گلاب پاش۔ عود سوزے۔ آفتابہ۔ سلفچی + (صفحہ ۹۹)

ان تفصیلات پر نظر ڈالنے کے بعد ہم جس نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ میر امّن کی نظر گھریلو اور معمولی معمولی اشیا پر زیادہ پڑتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں اس قسم کی اشیا کی کثرت ہے۔ اور اس کے برخلاف سرور کی اکثر قیمتی معلومات علمی دنیا کے متعلق ہیں۔ جو میر امّن کی علمی دنیا سے بالکل علیحدہ ہے + ایک اپنی علمی معلومات سے روزمرہ کی زندگی کا نقشہ کھینچکر ہماری زندگی کے علمی شعبہ کو تقویت بخشتا ہے۔ اور دوسرا اپنی علمی معلومات کے ذریعہ سے ہمارے دماغ کی علمی فضا کو وسیع کرنے اور ان پر اپنی قابلیت کے نقوش ثبت کرنے میں محو رہتا ہے +

(۴)

اُردو قصّوں اور داستانوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے۔ کہ ان میں پڑھنے یا سننے والے کی دلچسپی کو زیادہ کرنے کے لئے کئی اور ضمنی قصّے اور داستانیں بیان کی جاتی ہیں + جہاں قصّہ گو دیکھتا ہے کہ سامعین اُکتانے لگے ہیں۔ اصلی قصّہ کہتے کہتے ایک ایسی بات کہہ جاتا ہے۔ جس کی توضیح کسی دوسرے قصّہ میں پائی جاتی ہو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ دوسرا قصّہ شروع کر دیتا ہے + اس طرح سے سامعین کی دلچسپی از سر نو تازہ ہو جاتی ہے۔ اور اس ضمنی قصّہ کو سُن چکنے کے بعد ان کے دلوں میں پھر گذشتہ قصّہ کا باقی ماندہ حصّہ سُننے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر ہماری زبان کی اکثر داستانیں نہایت طول طویل ہو گئی ہیں +

ان قدیم قصّوں پر تنقیدی نظر ڈالنے سے نہ صرف داستان گویوں کے اس نفسیاتی گُر اور اصل قصّہ کو طویل بنانے کا فائدہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ بلکہ ایک اور ادبی منفعت بھی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان

مثالی اور ضمنی قصوں کے باعث قصہ گو کے ماحول اور ذاتی حالات کے متعلق تحقیق و تفتیش کرنے میں بھی نقاد کو نہایت آسانی حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان ضمنی قصوں میں بالعموم قصہ گو کے زمانہ کی معاشرتی جھلکیں آشکار رہتی ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے کسی درباری کے حالات بیان کرتا ہے۔ اور کہیں کسی تاجر کی زندگی کے اسرار پر روشنی ڈالتا ہے۔ کہیں شکاری کے حالات پیش کر دیتا ہے۔ اور کہیں کسی اور پیشہ ور کا سانحہ کہہ سناتا ہے۔ اس طرح ان قصوں کی بدولت قصہ نویس کا ماحول ہماری نظروں کے سامنے پیش ہو جاتا ہے +

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے ضمنی قصے اکثر دفعہ پرانے قصوں پر بھی مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن قصہ گو ان کے پرانے چربوں پر بھی اپنے ماحول اور ذات کے اثرات کو غیر ارادی طور پر ضرور نمودار کرتا جاتا ہے۔ یہ تو جدید اور طبعزاد قصوں کا ذکر تھا۔ اکثر قدیم قصے سناتے وقت قصہ گو اپنی طرف سے کچھ کمی زیادتی ضرور کر دیتے ہیں۔ اور اس کمی و زیادتی کے عمل میں ان کی طبیعت اور مذاق کو بھی ضرور دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مشترک قصے مختلف داستانوں میں عجیب عجیب تغیرات کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں +

جہاں تک قصوں کا تعلق ہے۔ ہم باغ و بہار اور فسانہ عجائب کا کامل طور پر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایک کے قصے طبعزاد ہیں اور دوسرے کے ترجمے۔ ان دونوں کے ضمنی قصوں سے ان کے ماحول کے متعلق کیا کیا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کا ذکر کئے بغیر یہاں ہم ان کے قصوں کی تعداد اور نوعیت پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں +

باغ و بہار میں اصل داستانیں پانچ ہیں۔ ایک بادشاہ قسطنطنیہ کی اور چار درویشوں کی۔ پہلے درویش کی سیر میں کوئی خاص ضمنی قصہ نہیں۔ شروع سے آخر تک ایک ہی شخص کے حالات ہیں۔ جن کے ضمن میں درویش کی بیوی ——— سلطان دمشق کی بیٹی ——— کے حالات بھی آجاتے ہیں۔ جن کو وہ خود اپنی زبان سے بیان کرتا ہے +

دوسرے درویش کی سیر کے بیان میں ایک ضمنی قصہ حاتم طائی کا ہے جو عرب قصوں سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ درویش کے حالات کے ضمن میں بصرہ کی شہزادی اور ملک نیمروز کے شاہزادے کے حالات بھی آجاتے ہیں۔ جو درویش ہی کی مہمات میں شامل رہنے کی وجہ سے مستقل قصے نہیں کہلائے جا سکتے۔ حالانکہ دراصل دو علیحدہ علیحدہ قصے ہیں +

بادشاہ آزاد بخت کے قصہ کو اگرچہ مستقل اہمیت دیدی گئی ہے لیکن اس میں دراصل قصہ نویس کو خواجہ سگ پرست کا قصہ پیش کرنا منظور تھا۔ جو بعض حیثیتوں سے باغ و بہار کا مرکزی قصہ کہلایا جا سکتا ہے۔ خواجہ سگ پرست کے قصہ میں ایک اور ضمنی قصہ ملک زیرباد کی رانی کا بیان کیا گیا ہے۔ جس میں ہندوستانی راجاؤں کی طرز معاشرت دکھائی دیتی ہیں + خواجہ ہی کی مہمات میں سراندیپ کی شہزادی کا قصہ بھی شامل ہے۔ جو خواجہ کے حالات کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اسی طرح آذربائیجان کا قصہ اگرچہ خواجہ ہی کے حالات میں شامل ہے۔ لیکن اس کا اصلی ڈھانچ ایک جداگانہ واقعہ پر مبنی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو ایک مستقل ضمنی قصہ کہنا بیجا نہ ہوگا +

تیسرے درویش کی سیر میں صرف نعمان سوداگر اور فرنگ کی شہزادی کا قصہ ایک مستقل اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اور چوتھے درویش کی سیر میں کوئی علیحدہ ضمنی قصہ نہیں +

فسانہ عجائب میں قصوں کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔ اگرچہ باغ و بہار کی طرح اس میں بھی ان کی تعداد کم ہے لیکن اس کے تمام قصے علیحدہ علیحدہ اور مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ باغ و بہار میں پانچ جداگانہ داستانیں ہیں۔ (اگرچہ اختتام کے وقت وہ سب مل کر ایک ہو جاتی ہیں) اس کے برخلاف فسانہ عجائب میں شروع سے آخر تک ایک ہی قصہ ہے۔ جس کے ضمن میں کئی اور مثالی قصے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً (پہلا ضمنی قصہ) شہزادہ جانعالم کے فراق میں ملکہ زرنگار کی جو بری حالت ہوئی تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے سرور لکھتے ہیں "حضرت عشق دشمن جان عاشق و معشوق ہیں۔ ان کا حال کیا کہیں۔ چنانچہ یہ مثل ضرب المثل ہے اور حقیقت میں اصل ہے"۔ اس کے بعد کلکتہ کے ایک انگریز سوداگر کی بیٹی پر ایک دوسرے انگریز (جو لندن سے تازہ وارد ہوا تھا) کے عاشق ہونے اور آخرکار دونوں کے جان دینے کے متعلق ایک طویل قصہ سنایا جاتا ہے۔ جس کے ضمن میں انگریزوں کے متعلق ایک اور مثالی قصہ پیش نظر ہو جاتا ہے +

ان دونوں قصوں میں اگرچہ فوق الفطرت عنصر ضرور شامل ہے۔ اور اگرچہ دونوں انگریزی طرز معاشرت کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کرتے۔ لیکن ان میں سرور نے اپنے زمانہ اور ماحول کے معتقدات کی نہایت ہی صحت و اہتمام

کے ساتھ ترجمانی کی ہے جس کی وجہ سے یہ دونو قصے خاص طور پر اہم ہو گئے ہیں۔ ایک اور قصہ شاہ یمن کی فیاضی کا ہے جو بہت ممکن ہے کہ کسی قدیم قصہ پر مبنی ہو۔

فسانہ عجائب کا چوتھا مثالی قصہ "برادران توام" کے متعلق ہے جو تیسرے قصہ کی طرح غالباً کسی قدیم قصہ سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح ایک اور قصہ (جسکے بعد فسانہ عجائب میں کوئی اور ضمنی قصہ نہیں) قوم بنی اسرائیل کے بادشاہ سے متعلق ہے۔ جو اس طرح شروع کیا گیا ہے۔ "جناب جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ تھا"۔

فسانہ عجائب اور باغ و بہار دونوں کے قصوں کا ایک سرسری مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فسانہ عجائب کے قصوں کو باغ و بہار کے قصوں پر فوقیت حاصل ہے۔ باغ و بہار کے قصے داستانی خصوصیتوں پر پوری طرح سے حاوی نہیں۔ سوائے قصہ حاتم طائی کے کوئی اور قصہ مثالی اور مستقل حیثیت سے نہیں پیش کیا گیا۔ اس کے برخلاف فسانہ عجائب میں پانچ بڑے بڑے قصے داستان گویوں کے اس اہم گر پر مبنی ہیں۔ جس کے ذریعہ سے وہ سامعین کی توجہ کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فسانہ عجائب کے اکثر ضمنی قصوں کی ایک خوبی یہ ہے۔ کہ ان میں فوق الفطرت عنصر کو زیادہ دخل نہیں (حالانکہ فسانہ عجائب کا مرکزی قصہ سرتاپا فوق فطری عناصر سے معمور ہے) اس کے برخلاف باغ و بہار میں سوائے قصہ حاتم طائی کے ہر قصہ فوق الفطرت عنصر پر مشتمل ہے۔

(۵)

ایشیائی فسانوں کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں فوق الفطرت عنصر کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ایشیائی قوموں کے معتقدات پر بالعموم فوق الفطری اشیا اور خیالات حاوی رہتے ہیں۔ اور ان کی معاشرت میں جگہ جگہ توہمات کا دخل ہے۔ لیکن قصوں میں اس کی کثرت کا ایک بڑا سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب قصہ گو سمجھتا ہے کہ میں اپنا قصہ زیادہ حاوی نہیں رکھ سکتا۔ اور روزمرہ کی دنیا اور قوانین فطرت کی مطابقت سے قصہ میں کوئی دلچسپی اور کمال باقی نہیں رہتا۔ تو فوراً اپنے تخیل کی قوت خالقیت سے کام لیتا ہے۔ اور یکایک ایک ایسا نیا حربہ اختیار کرتا ہے کہ تمام سامعین متحیر ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے دل و دماغ پہلے سے اس قسم کی نت نئی اور غیر معمولی اشیا کے تذکروں سے مانوس ہوتے ہیں۔ اور نہ صرف مانوس بلکہ ان کے حقیقی ہونے پر بھی یقین کامل رکھتے ہیں۔ اس لئے قصہ گو اپنے اس کمال کی خاطر خواہ داد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اگرچہ اب وہ مذاق باقی نہیں رہا۔ کہ اس فوق فطری عنصر پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔ اور اس کی خوبیوں اور دلچسپیوں کو اچھال اچھال کر دکھایا جائے۔ نیز قصہ گوئی استادی اور کمال کی داد دی جائے۔ تاہم چونکہ ہم دو قصوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے فوق فطری عناصر پر ایک سرسری نظر ڈال لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ ان دونوں کا مذاق اور اس زمانہ کے فن افسانہ نویسی کی بعض خصوصیات پر روشنی پڑ سکے۔

باغ و بہار کے قصہ کے اصلی اور مرکزی اجزا اردو زبان کے اکثر قصوں کی طرح فوق فطری ہیں۔ لیکن ان کے ضمن میں اکثر جگہ قوانین فطرت کی مطابقت کی نہایت پاکیزہ جھلکیں بھی نمودار ہیں۔ اس کے بالکل برخلاف فسانہ عجائب کا مرکزی اور اصلی جزو بادشاہوں کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہے۔ اور جس کی ابتدا اور انتہا دونو موافق فطرت ہیں۔ تاہم سارے قصہ میں فوق فطری عناصر اسقدر زیادہ تابناک ہیں۔ کہ ان کی چمک کے آگے موافق فطرت چیزیں بالکل دھندلی نظر آتی ہیں۔

باغ و بہار میں چاروں داستانوں کی زندگیاں فوق فطری انجام حاصل کرتی ہیں۔ جب یہ چاروں دنیا اور اس کے کاروبار میں ہر طرح سے ناکام رہ کر خودکشی کرنے لگتے ہیں۔ تو حضرت علی نقاب ڈالے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان کو خودکشی سے روکتے اور آئندہ ان کے مقاصد بر آنے کی خوشخبری دیتے ہیں۔ جس کے بعد سے وہ چاروں درویش بنکر نکلتے اور قسطنطنیہ کا رخ کرتے ہیں۔

پہلے درویش کی سیر میں فوق فطری عنصر ایک موقعہ پر پیش کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب پہلا درویش (تاجرزادہ یمن) بے حد دقتوں کے بعد اپنے مطلوب کو حاصل کر کے نکلتا ہے۔ تو راستہ میں ایک درخت کے نیچے سے یکایک اس کا معشوق غائب ہو جاتا ہے (دیکھو صفحہ ۷۴) جس کے بعد سے وہ پہلے تو آوارہ و پریشان پھرنے لگتا ہے۔ اور پھر خودکشی پر تیار ہو جاتا ہے۔

دوسرے درویش کی سیر میں فوق فطری عنصر پہلی دفعہ بصرہ کی بادشاہزادی کا جنگل میں ایک درویش کو دیکھنا تھا جو غیب سے اس کا حال معلوم کر کے

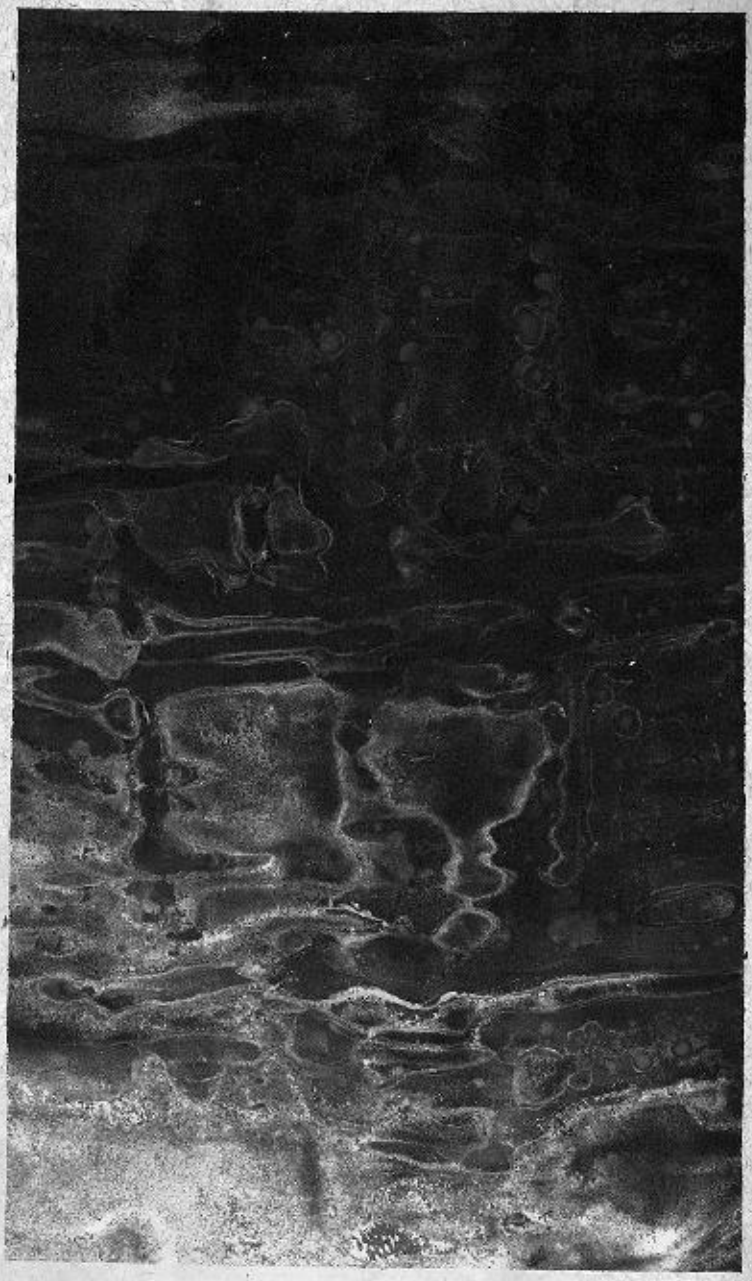

اس کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور پھر اس کے بعد ہی اسی بادشاہزادی کا ایک غیبی خزانہ حاصل کرنا بھی مافوق الفطرت ہے۔ (صفحہ ۱۰) اسی درویش کی سیر میں جہاں ملک نہروز کے شاہزادے کے حالات بیان کئے گئے ہیں غیر فطری عنصر سے کام لیا گیا ہے۔ (صفحہ ۱۲۵) گوسائیں کی وفات پر خزانہ کا عجیب و غریب چیزیں حاصل کرنا اور پھر ان کے ذریعے سے جنوں کے بادشاہ پر قابو حاصل کرنا (صفحہ ۱۲۰) دوسرے درویش کی سیر کے فوق فطری عنصروں میں زیادہ اہم ہے +

باغ و بہار میں دوسرے درویش کی سیر کے بعد بادشاہ آزاد بخت کا قصہ پیش کیا گیا ہے۔ جو بہت زیادہ موافق فطرت ہے۔ خواجہ سگ پرست کے احوال میں بھی قصہ نویس نے روزمرہ کی زندگی سے بہت کچھ مواد حاصل کیا ہے۔ اس کی فوق فطری عنصر کی مثالوں میں صرف ملک زیرباد کی رانی کا خواب دیکھنا۔ اور کسی کو یہ کہتے ہوئے سُننا کہ "شتابی اُٹھ اور گھوڑا جوڑ اور تقدیر کے واسطے لیکر اس غار پر جا اور اس بیچارے کو وہاں سے نکال"۔ زیادہ قابل ذکر ہے +

تیسرے درویش (بادشاہزادہ عجم) کی سیر میں فوق فطری عنصر سے دو جگہ کام لیا گیا ہے (۱) شاہزادہ کو قتل کرنے کے لئے بڑھتے ہی وزیر کی پیشانی میں ایک غیبی تیر لگنا (صفحہ ۲۳۰) — (۲) اختتام سفر کے وقت ملکہ اور ہزاد خاں کا یکایک دربار میں غائب ہو جانا + (صفحہ ۲۴۲)

باغ و بہار کا آخری حصہ لیتے چوتھے درویش کی سیر قطعاً فوق فطری عنصر پر مبنی ہے۔ چین کے شاہزادے کا اپنے چچا کے ظلم سے موت کے پنجے میں پھنسنا اور اس کے ایک خیر خواہ حبشی مبارک کا اس کی مدد کرنے وقت فوق فطری عناصر سے مدد لینا تمام قصہ پر حاوی ہے۔ جنوں کے بادشاہ ملک صاوق کے تعلقات بادشاہ چین کے ساتھ۔ اور اس کے کم عمر بیٹے سے ہمدردی کرنے پر تیار ہونے کی نوعیت بالکل مافوق الفطرت طریقوں پر مشتمل ہے + (دیکھو صفحات ۲۴۴ تا ۲۶۶) +

چاروں درویشوں کے ملنے کے بعد جب بادشاہ کے گھر شہزادہ بختیار پیدا ہوتا ہے۔ تو پھر فوق الفطرت عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ یعنے ملک شہپال کا شہزادہ پر (اپنی لڑکی سے شادی کرنے کی خاطر) مہربان ہونا۔ اور اسکو جھولے میں سے غائب کر کے اپنی لڑکی کے ساتھ کھیلنے بلا لینا اور پھر لڑکی کے والد ملک شہپال سے ملاقات کرنے کے لئے شاہ آزاد بخت کا ایک تخت پر بیٹھ کر ہوا پر اُڑتے ہوئے جانا اور پھر شہپال کی مدد سے اپنے اور تمام درویشوں کے مقصدوں کو پورا کرنا نہایت مافوق الفطرت کام ہے۔ یہی وہ امر ہے جسکی بنا پر ہم باغ و بہار کے اصولی اجزا کو فوق فطری عنصر پر منحصر قرار دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں +

فسانہ عجائب یعنی باغ و بہار کی طرح ابتدا تو موافق فطرت طریقہ سے کی گئی ہے۔ لیکن جب جان عالم (فسانہ عجائب کا ہیرو) ملک زرنگار کی شہزادی انجمن آرا کے لئے گھر بار چھوڑ کر وزیرزادے اور طوطے کے ساتھ نکلتا ہے تو راستے میں دو ہرنیں ملتی ہیں۔ جن کے شکار کی خاطر جان عالم راستہ بھٹک جاتا ہے۔ اور اپنے ساتھیوں سے چھوٹ کر جادو کے پھندوں میں پھنس جاتا ہے۔ (صفحہ ۳۱) اور جب اس وحشت پرسحر کی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے منت وزاری دعا کرتا ہے تو فوراً ایک پیر مرد سفید داڑھی والے۔ سبز عمامہ سر پر۔ عبائے عنابی کندھے پر ڈالے۔ ہاتھ میں عصا خوبصورت بزرگ سیرت پارسا وارد ہوتے ہیں اور اس کو نہ صرف تشفی بخشتے ہیں۔ بلکہ اس کی شدت خواہش پر اس کو وہیں سے ایک آنکھ کی جھپک میں ملک زرنگار اور ملکہ انجمن آرا کی زیارت کرا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ نیند ہی میں اُسے اُس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں سے اُس نے ہرن کا پیچھا شروع کیا تھا۔ (صفحہ ۳۴)

جب شہزادہ ملک زرنگار کی تلاش میں آوارہ گردی کرتا ہے۔ تو اس کو ایک اور فوق فطری حادثہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو پہلے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یعنے اب وہ ایک حوض میں پانی پینے کے لئے جھکتے ہی گر پڑتا ہے۔ اور ایک جادوگرنی کے باغ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس جادو کے باغ کا جس طرح سماں کھینچا ہے وہ سرور کی تخیلی قوت کی بلند پروازیوں کی کافی شہادت دیتا ہے۔ (صفحہ ۳۶-۳۷)

جادوگرنی کے پنجے سے آزاد کرنے کے لئے بھی سرور کو ایک مافوق الفطرت حربہ سے کام لینا پڑا اور وہ نقش سلیمانی تھا جس کو خود جادوگرنی نے اپنے صندوق سے نکال کر جان عالم کے بازو پر باندھا تھا۔ چنانچہ "ایک دن عالم تنہائی میں جان عالم کو یہ خیال آیا۔ اس نقش کی تعریف اس نے بہت کی تھی۔ کھولو تو۔ شاید عقدہ کار بستہ کھلے۔ یہ سوچ کے اسے کھولا۔ اس کا یہ نقشہ تھا۔ بست در بست کا نقش ہر خانے میں اسمائے الٰہی مع ترکیب و [illegible] تحریر تھے۔ دیکھتے دیکھتے خانۂ مطلب میں نظر پڑی۔ لکھا

تھا کہ کوئی شخص کسی ساحر کی قید میں اگر ہو یہ اسم پڑھے نجات پائے۔ یا مکان طلسم میں پھنسا ہوا اُسے پڑھتا جدھر جا چاہے چلا جائے۔ اور جو کوئی سحر کرتا ہو اُس پر پڑھ کر پھونک دے۔ اسی دم اس کی برکت ساحر کو پھونک دے۔ (صفحہ ۴۲) یہ دیکھ کر جا فاعالم بہت خوش ہوتا ہے۔ اور اسم یاد کر کے رہائی حاصل کرتا ہے۔ جب جادوگر فی آتی ہے۔ تو اپنی نقش سلیمانی دینے کی غلطی پر افسوس کرتے ہوئے یہ شعر پڑھتی رہ جاتی ہے ؎

کس نیاموخت علم تیر ازمن کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

فسانہ عجائب میں تیسری دفعہ فوق الفطرت عنصر اس موقعہ پر روشناس کرایا جاتا ہے۔ جب جا فاعالم ملک زرنگار میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اپنے مطلوب کے حاصل کرنے میں کوئی چیز اُس کے سدراہ نہیں ہے۔ لیکن قصہ نویس گوارا نہیں کرتا کہ اس کا قصہ اسقدر جلد ختم ہو جائے۔ اس لئے وہ اپنے مخصوص گر بننے فوق فطری عنصر سے کام لے کر سامعین کی دلچسپی کے ساتھ قصہ کے پلاٹ کو بھی زیادہ وسیع کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب جان عالم شہر زرنگار میں پہنچکر ملکہ کے متعلق دریافت کرتا ہے۔ تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی روز قبل اس کو ایک جادوگر اُڑا لیگیا ہے۔ اور ایک آہنین قلعہ میں قید رکھا ہے۔ جا فاعالم ملکہ مہرنگار کے والد کی عنایت کی ہوئی لوح کی مدد سے اس آہنین قلعہ پر غالب آجاتا ہے۔ اور انجمن آرا کو چھڑا لاتا ہے ؎ (صفحہ ۳۷-۴۷)

چوتھی دفعہ سرور نے جس فوق فطری عنصر سے کام لیا ہے۔ وہ اگرچہ پہلے تین عناصر کی طرح محیر العقول نہیں۔ لیکن فوق فطری ضرور ہے۔ یہاں ایک انگریز شخص ہیپر مجسٹس کا ایک ضمنی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جس کا ایک اہم حصہ فوق فطری عنصر سے مملو ہے۔ (صفحہ ۴۰۰) اس کے علاوہ اور کئی مقامات پر اسی عنصر سے خاطر خواہ کام لیا گیا ہے۔ جن کی تفصیل یہاں باعث طوالت ہے ؎

باغ و بہار اور فسانہ عجائب دونوں کے مافوق الفطرت عنصروں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ باغ و بہار میں اس عنصر کو ایک حد تک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن وہ دراصل اس زمانہ کے توہمات اور معتقدات کے موافق ہے۔ اس کے برخلاف فسانہ عجائب میں (اگرچہ عام قصہ گویوں کی طرح .... اسے طوالت کے لئے ضمنی طور پر شامل کیا گیا ہے) جو جو عجیب و غریب واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ وہ اس درجہ محیر العقول ہیں۔ کہ شاید ہی اس کے مصنف کا اہل بھی ان کو کسی طرح صحیح سمجھ سکتا ہو۔ باغ و بہار میں غیر فطری عنصر بھی موافق فطرت نظر آنے لگتا ہے۔ اور فسانہ عجائب کے موافق فطرت واقعات بھی مافوق الفطرت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باغ و بہار میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے۔ وہ اپنے زمانہ اور ماحول کی صحیح ترجمانی ہے۔ اُس زمانہ میں مسلمان عاملوں کا جنوں کو قبضہ میں لانا اور ان سے کام لینا کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص اتفاقاً دریا میں ڈوب مرتا تو عام لوگ یہی سمجھتے تھے کہ کسی جن نے اس کو غائب کر دیا ہے اگر کوئی عورت بیمار ہو جاتی۔ تو اُس کے گھر والوں کو یقین ہو جاتا کہ اس پر کسی دیو یا پری کا سایہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں سے بچنے کے لئے کئی ذریعے اختیار کئے گئے تھے جن میں سب سے بڑا ذریعہ عاملوں اور تعاویذ کے تعویذ بلیتوں وغیرہ کا تھا ؎

یہ باتیں نہ صرف باغ و بہار کے مصنف اور مترجم ہی کے زمانہ میں رائج تھیں۔ بلکہ آجکل بھی ہندوستانیوں کی ذہنیت اس سے متاثر ہیں۔ اور چونکہ باغ و بہار میں صرف انہی کی وفاداری کے ساتھ نمایندگی کی گئی ہے۔ اس لئے اس کا آجکل کا پڑھنے والا بھی اس سے اسی طرح متاثر ہو سکتا ہے جس طرح وہ شخص متاثر ہوا ہوگا جس کو باغ و بہار کے تصنیف کئے جانے کے بعد ہی سب سے اوّل سننے یا دیکھنے کا موقع حاصل ہوا ہو ؎

فسانہ عجائب میں جو باتیں فوق الفطرت عنصر کے تحت میں پیش کی گئی ہیں۔ وہ اگرچہ مصنف کی کمال انشا پردازی اور پرواز تخیل کے لحاظ سے نہایت قابل وقعت اور لائق ستایش ہیں۔ لیکن وہ اسقدر رنگین اور کثیر الوقوع ہیں کہ ان کو بار بار کرنا بھی پڑھنے والے کے لئے بار ہو جاتا ہے۔ اور پڑھنے والا جو بہت ممکن ہے باغ و بہار کو ایک حقیقی قصہ سمجھ لے ؎

فسانہ عجائب کے قصہ کو ایک صحیح واقعہ۔ ایک ایسا واقعہ نہیں سمجھ سکتا جو بنی نوع انسان پر گذر سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پر اس قصہ کا کوئی اثر نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ اس کا قلب اور دماغ دونوں اس کے خلاف ایک ردعمل شروع کر دیتے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس قصہ کی جانب سے اگر پڑھنے والے کی طبیعت میں ایک نفرت سی پیدا ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ؎

مرزا رجب علی بیگ سرور نے دیگر امور کی طرح فوق الفطرت عنصر میں بھی باغ و بہار کے مقابلہ کا لحاظ رکھا۔ ان کے غیر فطری قصوں میں کچھ

چیزیں ایسی ہیں جو باغ و بہار میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کا بالمقابلہ مطالعہ کرنا ہمارے موضوع کے حدود سے باہر نہیں۔ لیکن طوالت کے خیال سے ہم اس کو چھوڑ کر صرف ایک بڑے واقعہ کا ذکر پیش کر دیتے۔ اور وہ جنوں کے بادشاہ شہپال کا ہے۔ باغ و بہار کے قصہ کا اختتام اسی کی مدد اور ہمدردی پر منحصر ہے۔ مصنف باغ و بہار نے اس خیال سے کہ جن بھی مسلمان ہیں اور انسان اسلمانوں کی مشکلات میں وہ ان کی مدد کیا کرتے ہیں ان کے بادشاہ شہپال کے ذریعہ سے اپنے رجال داستان کے مقاصد کو برلانے کی کوشش کی ہے جو اسلامی معتقدات کے لحاظ سے کوئی ناممکن اور غیر فطری شے نہیں ہو سکتی۔ سرور نے مقابلہ کے خیال سے اپنے قصہ میں بھی شہپال نام ایک مافوق الفطرت ہستی پیش کی ہے۔ لیکن فرق یہ رکھا ہے کہ باغ و بہار کا شہپال جنوں کا بادشاہ تھا۔ اور فسانہ عجائب کا شہپال ساحروں کا بادشاہ ہے۔ باغ و بہار میں وہ رجال داستان کا دوست بنا دیا گیا ہے۔ اور فسانہ عجائب میں غالباً مقابلہ ہی کی خاطر اس کو دشمن بنا کر اس سے اپنے رجال داستان کا مقابلہ کرایا گیا ہے۔ اور آخر میں شکست دلا کر لشکر سمیت تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔

بہت ممکن ہے کہ مصنف فسانہ عجائب کو اس بات پر فخر ہو کہ میں نے اپنے اشخاص قصہ کے مقاصد خود اُن ہی کے ہاتھ سے پورے کرائے اور کسی غیر فطری عنصر کی مدد نہیں حاصل کی! یہ فخر کہاں تک بجا ہو سکتا ہے اور کہاں تک بے جا۔ اس بحث کو چھیڑے بغیر ہم اس امر میں ضرور ان کی قوت تخیل داد دیتے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے قصہ کا اس طرح خاکہ ڈالا کہ وہ آخر میں چل کر موافق فطرت ذریعوں سے انجام کو پہنچتا ہے۔

(۶)

جذبۂ عشق کی ترجمانی کرنا آغاز کائنات ہی سے انسان کا ایک دلچسپ اور ضروری مشغلہ رہا ہے۔ اور جوں جوں تمدن میں ترقی ہوتی گئی ہے۔ اظہار عشق کے ذریعہ زیادہ نفیس اور مکمل ہوتے گئے ہیں۔ دنیا کی کسی زبان کا ادب اس عنصر سے محروم نہیں۔ کسی وحشی قوم کا جاہل سے جاہل فرد اور کسی مہذب سے مہذب قوم کا کوئی روشن دماغ رکن بھی محبت کے عالمگیر اثرات اور اس کے ہوشربا واقعات میں دلچسپی لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جس کی بنا پر زبان کے ادیب اپنے کارناموں میں عشق و الفت کے عناصر شامل رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہر زبان و ادب کا عشقیہ عنصر اس کے بولنے اور لکھنے والوں کے ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا جاتا ہے۔ جو قوم تہذیب و تمدن کے لحاظ سے جسقدر زیادہ ترقی یافتہ ہوگی۔ اس کے ادب کا عشقیہ عنصر بھی اسی مناسب کے لحاظ سے نفیس اور مکمل ہوگا۔ اردو کے ادبی کارناموں میں جو عشقیہ عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کے ترقی یافتہ ذہنوں کی پیداوار ہے۔ ہندوستان کے زمانہ میں ہندوستانیوں کا ذہنی ارتقا معراج کمال کو پہنچ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اردو ادب میں عشق و محبت کے وہ بے ڈھب اور بھونڈے مرقعے نہیں پاتے۔ جو کسی ایسی زبان سے بکثرت فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ جس کا ارتقا اس کے بولنے والوں کے دلی و دماغی ارتقا کے ہم دوش نہ ہو۔

چونکہ اردو زبان نے ایسے ملک اور ایسے انسانوں کے درمیان جنم لیا۔ جو تہذیب و تمدن میں کافی طور پر ترقی کر چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنے وطن اور ابنائے وطن کی ہمنیوں کے تمام ترقی یافتہ شعبوں سے بہت جلد متاثر ہو گئی۔ اس کی ابتدا کے وقت اس کے بانیوں میں عشق عاشقی نہ صرف درجہ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ بلکہ حد سے متجاوز ہونے کے باعث بعض بیہودگیوں سے بھی روشناس ہو چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب میں عشق عاشقی کے نہ صرف مکمل مرقعے بہت جلد پیش کر دیئے گئے۔ بلکہ اس سے متعلقہ وہ تمام بدعنوانیاں اور سرمستیاں بھی جلوہ گر ہو گئیں۔ جو کسی قوم کے کافی ترقی کر چکنے کے بعد عیش و عشرت میں پڑ جانے کی وجہ سے اس کے دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں۔

اردو زبان کے عام عشقیہ فسانوں کی طرح فسانہ عجائب اور باغ و بہار میں بھی ان دونوں قسموں کے مرقعے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ باغ و بہار اُس زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ اس کے مصنف کے ملک و قوم پر ابھی کالی کالی گھٹائیں نہیں چھائی تھیں۔ اور اسکے برخلاف فسانہ عجائب اُس زمانہ کی پیداوار ہے۔ جس میں عیش و عشرت کی کثرت نے مصنف کے ہموطنوں کو نکمے اور بیہودہ اشغال میں محو کر دیا تھا۔ اور جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کا اقبال ان سے منہ موڑتا جا رہا تھا۔ اس لئے ہم ان دونوں کے عشقیہ عنصر کا صحیح طور پر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایک کے عشقیہ قصے قوم کے عروج اور جدوجہد کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اور دوسرے کے قوم کے تنزل و پستی کے ترجمان ہیں۔

غلام محی الدین ایم اے۔ (مقیم لندن)

دسمبر ۱۹۲۷ء

جنسِ لطیف

عورت بظاہر کمزور مگر اُس کے قبضہ میں قدرت نے سب سے بڑی طاقت دی ہے۔ وہ تمام دنیا پر حکومت کرتی ہے۔ اُس کی حکومت کے کئی طریقے ہیں۔ ایک سے ایک مختلف۔ عورت مستعد اور مستقل مزاج ہے۔ اس کی خواہشات نفس مرد کی طرح ناقابلِ ضبط نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک چابکدست سوار کی طرح اس منہ زور گھوڑے کی باگیں مضبوطی سے تھامے رکھتی ہے۔ اور اپنی مرضی کے مطابق جدھر چاہے چلا سکتی ہے +

اس کی آنکھیں ایک فاتح کی طرح چمکتی ہیں۔ اور جس قلعۂ دل پر وہ چاہے۔ خواہ وہ کیسا ہی مستحکم کیوں نہ ہو۔ آسانی سے قابض ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کے دل میں الوالعزم خواہشات کا طوفان مچلا ہو تو وہ آپ کے دل پر سے پردہ ہٹا دیگی۔ اور آپ کو ترقی اور عزت کا راستہ بتا دیگی +

اگر آپ خود کو بیزار اور مضمحل پاتے ہیں تو اس کے سینے میں آپ کے لئے راحت پوشیدہ ہے۔ اگر آپ خود کو شکست خوردہ محسوس کرتے ہیں تو وہ آپ کو ازسرِ نو جوان ہمت بنا دیگی۔ اور آپ کے ادراک پر فسائی جادو کا پردا ڈال کر شکست کو فتح سے بدل دیگی۔ وہ یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ کیونکہ قدرت ہمیشہ اُسی کا ساتھ دیتی ہے۔ اور جب وہ ایسا کرنا چاہتی ہے۔ تو اپنے خیالات اور رازوں کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالتی ہے جس میں آپ کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اور یہی بڑی وجہ ہے کہ وہ تمام دنیا پر حکومت کرتی ہے۔ اسی کے لئے لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ طاقت و قوت صرف کی جاتی ہے۔ اچھا اور بُرا کیا جاتا ہے۔ اور عظمت و بزرگی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے +

لیکن اس پر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو عورت ایک بُت کی طرح خاموش ہے۔ جس کا تبسم ابھی تک مردوں کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ اور اس کے دل کا راز ایک معمہ +

اسے مذاق نہ سمجھو۔ اسے ہنسی میں نہ اُڑاؤ! یقیناً وہی شخص دنیا میں کامیاب ہو سکتا ہے جس نے عورت کی قوت کو ناچیز نہ سمجھا ہو۔ عورت فضا کی طرح مرد کو ہمیشہ گھیرے رہتی ہے۔ اور اُس وقت مادی قوت حاصل کر لیتی ہے جب انسانی حواس بھی مشکل سے اس کا پتہ لگا سکتے ہوں +

(شکیب)

(رائیڈ ہاگرڈ)

پھول

موسمِ بہار میں جب سمندری ہوائیں میری خلوت گزینی میں خلل انداز ہوئیں، میں نے اوخنگفتہ پھول! تجھ کو جنگل میں ایک چشمے کے قریب پایا۔ جہاں تو اپنی خوبصورتی کی بہار جنگل اور چشمے کو دکھلا رہا تھا۔ تیری سرخ پتیوں نے سیاہ پانی کو خوشرنگ بنا دیا تھا۔ یہاں پر کوئی سرخ پرندہ آتا ہوگا۔ اور تجھ کو دیکھ کر محوِ تماشا ہو جاتا ہوگا۔ تیری خوبصورتی اس کے دل میں سرایت کر جاتی ہوگی اور وہ تجھ سے سرگرمِ نیاز ہو جاتا ہوگا +

او پھول! اگر کوئی تجھ سے پوچھے کہ دنیا میں تجھ سے کونسا کام انجام پاتا ہے۔ تو اُن سے کہہ کہ اگر آنکھیں دیکھنے ہی کے لئے بنائی گئی ہیں تو خوبصورتی آپ اپنا جواب ہے +

مگر مجھ سے کبھی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ نہ میں نے کبھی تجھ سے ایسے طفلانہ سوالات کئے اور نہ ہی میں جانتا ہوں۔ لیکن اپنے ناقص خیال میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس قادرِ مطلق نے مجھ کو پیدا کیا۔ تجھ کو بھی بنایا اور چونکہ اپنا سلسلہ ایک ہی مرکز سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے فطری طور پر مجھ کو تجھ سے محبت ہے۔ اور ہم دونوں ایک ہی رشتۂ ارتباط میں منسلک ہیں +

(ایڈیسن)

محمد بدرالدین شکیب عثمانیہ یونیورسٹی منظم بی اے

دسمبر ۱۹۲۷ء

حکمت خانم کا روزنامچہ

از جناب نسیم الدین احمد صاحب نسیمی بی۔اے آنرز۔ایم۔اے (علیگ)

یکم مارچ ۱۹۱۹ء

میں امی جان کے ساتھ دریچہ کے سامنے بیٹھی ہوئی شاہراہ عام کے نظر فریب نظارے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ امی جان چپ چاپ اور گم سم بیٹھی تھیں۔ لیکن اُن کے اُترے ہوئے چہرے سے صاف ظاہر تھا۔ کہ کوئی اندرونی غم ان کو دُکھ پہنچا رہا ہے۔ کبھی کبھی اپنی الفت بھری نگاہوں سے میری طرف تک لیتی تھیں۔ لیکن اُن کی نگاہیں پتہ دے رہی تھیں کہ کسی رنج والم کو دبانے اور ضبط کرنے کی بے سود کوشش کر رہی ہیں۔

آہ بیچاری امی! ان کو اس بات کا غم گھلائے دیتا ہے۔ کہ میں اپنی عمر کی بیس منزلیں طے کر چکی اور اب تک غیر شادی شدہ ہوں۔ دوسری لڑکیاں جن سے وہ واقف ہیں۔ تیرہ یا چودہ ہی برس کی عمر میں بیاہی جا چکی ہیں۔ ان کی دلی آرزو ہے۔ کہ جلد از جلد میری شادی سے فراغت حاصل کریں۔ تاکہ میری مسرت انگیز اُمنگیں شباب کی رنگینیوں سے پوری طرح بہرہ اندوز ہو سکیں۔ لیکن میں پوچھتی ہوں کہ کیا شادی میں حقیقی خوشی پنہاں ہے؟ کیا اپنی شادی کے بعد وہ خود بھی مسرور ہیں۔ جبکہ ان کی ازدواجی زندگی میں رشک و رقابت کو بھی دخل تھا؟ کیا میری سہیلی احسان خانم بھی اپنے خاوند کے ساتھ پُر کیف زندگی کے لطف اُٹھا رہی ہیں؟ کاش! میں کسی طرح یہ اُن کے ذہن نشین کر سکتی کہ میں اپنی موجودہ زندگی پر قانع ہوں۔ اور اس کو تبدیل کرنا نہیں چاہتی۔

۱۰۔ مارچ

آج دو خاتونیں۔ جن سے ہم پہلے ناواقف تھے۔ ملنے کے لئے آئیں ان میں ایک ادھیڑ عمر کی پستہ قد خاتون تھیں۔ جو ایک نہایت بیش قیمت لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے متین اور بارعب چہرہ پر جس میں کبر سنی کی علامات ہویدا ہو چلی تھیں۔ ایک باریک جالیدار نقاب پڑا ہوا تھا۔ دوسری شادی کی دلالہ تھی۔ وہ صرف ایک سیاہ فرغل میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں ان دونوں کو دیکھتے ہی ان کے آنے کی غرض و غایت کو تاڑ گئی۔ اور امی جان کے اشارے کا انتظار کئے بغیر اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ تاکہ اپنا نفیس ترین جوڑا زیب بدن کروں۔ بالوں کو برش سے جماؤں۔ اور اپنے پژمردہ موہی چہرہ پر پوڈر لگاؤں۔ جس سے دونوں مہمانوں پر میری خوبصورتی کا اچھا اثر پڑ سکے۔ لیکن میرے سنگھار شروع کرنے سے پہلے ہی امی جان، سرتاپا نجمہ عجمت بنی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئیں۔ اور کہنے لگیں "حکمت! بہترین کپڑے پہننا۔ حسن بیگ کی والدہ تمہیں دیکھنے کے لئے آئی ہیں"۔

میں نے اپنے آپ کو قطعی لاپرواہ ظاہر کیا۔ بلکہ متفکرانہ انداز سے بے نیازی کے لہجے میں پوچھا "اور یہ دوسری عورت کون ہے؟" لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے سُنا ہی نہیں۔ کیونکہ وہ فوراً ہی کمرہ سے باہر چلی گئیں۔ اس خیال سے کہ مہمان خواتین کو تنہائی سے تکلیف نہ پہنچے۔ میں اپنے بالوں کو درست کر رہی تھی۔ کہ میرے دل میں ایک قسم کی خلش پیدا ہوئی اور ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس سے پہلے مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور اسی لئے میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دل کی اس سوزش سے مجبور ہو کر مجھے اپنی آرائش کو روک دینا پڑا۔ تاکہ اس خلش کی وجہ پر غور کروں۔

"کیا شادی میری طبیعت سے سازگار ہو سکتی ہے۔ وہ آشنا جسکے میں اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے حاصل سے ہنوز ناواقف ہوں! یا کسی فطری نسوانی جذبہ کی بنا پر میرے دل میں یہ خوف جاگزیں ہو گیا ہے کہ مہمان خواتین کی نظر میں اپنی خواہش کے مطابق حسین نہ معلوم ہونگی؟" میں نے ان موہوم لیکن پریشان کن خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بیسود کیونکہ میں غور و فکر کی عادی نہیں۔ میرے دل میں بار بار انہیں خیالات کا ہجوم ہو رہا تھا۔ "میری یہ تمنا کیوں ہے کہ میں انہیں حسین معلوم ہوں؟ کیا اس وجہ سے کہ وہ مجھے چاند کا ٹکڑا کہکر مخاطب کریں؟ یا اس غرض سے

کہ وہ فضول خوشامدانہ اور بچوں کی سی باتیں کرنے لگیں"؟ لیکن نہ یہ صحیح ہے اور نہ وہ درست۔ جتنا زیادہ میں غور کرتی ہوں۔ میرے دل میں کسب کمال کی ایک زبردست خواہش پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ خواہش جس سے مجبور ہو کر ہر عورت یہی چاہتی ہے۔ کہ نامعلوم دنیا کے راز ہائے سربستہ اس پر منکشف ہو جائیں +

میں کمرہ سے نکل کر مہمانوں کے سامنے آئی۔ جنہوں نے نہایت مہربانی اور خندہ جبینی سے میرا خیر مقدم کیا۔ بالخصوص دلارا عورت نے میری تعریف میں سینکڑوں خوشامدانہ الفاظ کہہ ڈالے + تھوڑی دیر خاموشی رہی لیکن اسی اثنا میں معزز خاتون اپنی تیز بیں نگاہوں سے میرا جائزہ لیتی رہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا اُن کی نگاہیں میرے تمام جسم کو چیرتی ہوئی پار ہوئی جا رہی ہیں۔ میں نے شرمندہ ہو کر اپنا سر جھکا لیا۔ دلارا اس بات کو فوراً تاڑ گئی۔ اور اس خیال سے کہ معزز خاتون کے آخری فیصلہ پر اپنی رائے کا بھی اثر ڈال سکے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "پیاری بہن! تمہارے خدوخال کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ناک اپنی لطافت میں پھول کو شرما رہی ہے۔ اور غنچہ سا دہن شیرینی میں شہد کو مات دے رہا ہے" اس کے بعد وہ خاتون سے مخاطب ہوئی۔ اور ایسے انداز میں گویا کہ امر واقعہ کا اظہار کر رہی ہے۔ ان سے کہنے لگی۔ کیوں محترم خاتون! حکمت خانم کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ گذشتہ سال تک بچوں کے ساتھ سڑک پر کھیلا کرتی تھیں؟ اب تو یہ حسن و شباب کا مجسمہ معلوم ہوتی ہیں" خاتون نے نرمی کے ساتھ جواب دیا "ہاں بہن! ٹھیک ہے حکمت ایسی ہی معلوم ہوتی ہیں" لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ خاتون نے یہ الفاظ صرف اخلاقاً کہے تھے۔ کیونکہ اُن کی نگاہیں صاف طور پر ان کے الفاظ کی مخالفت کر رہی تھیں +

اسی دوران میں اپنی خوشامدانہ گفتگو کے ہر جملہ پر دلارا عورت ایک نگاہِ غلط انداز امی جان پر بھی ڈالتی جاتی تھی۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان سے اپنی مفروضہ خدمات کی اہمیت کو تسلیم کرالے۔ تاکہ اس معاملہ کے بحسن و خوبی انجام پانے پر اس کا انعام کہیں نہ جائے۔ لیکن امی جان کی حرکات سے اُسے مایوس ہو جانا پڑا۔ کیونکہ وہ برابر زمین کی طرف دیکھتی رہیں +

میں نے محترم خاتون کی طرف دیکھا۔ وہ میرے جسم کے ایک ایک عضو کا نہایت غور کے ساتھ معائنہ کر رہی تھیں۔ میں نے پھر یہی محسوس کیا کہ اُن کی تیز نگاہیں میرے بدن کے پار ہوئی جا رہی ہیں۔ میں بے حد گھبرا رہی تھی۔ اور میرے اضطراب میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جب خاتون موصوف نے پینے کے لئے مجھ سے پانی مانگا۔ میرا جی تک خیال ہے۔ انہیں پیاس بالکل معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ کہ میرے چلنے کا انداز کیا ہے۔ اور میرے قدم کس طرح پڑتے ہیں۔ میں اُٹھی اور شاہانہ انداز سے چلنا چاہا۔ تاکہ وہ میرے تناسب اعضا اور سبک خرامی کو بخوبی ملاحظہ کر سکیں۔ لیکن اضطرابِ قلب نے میرے اوپر غلبہ پا لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ تیز نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ میں لڑکھڑا گئی۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے پاؤں زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ بمصداق مشکل میں پانی لے کر پہنچی۔ خاتون سے درد سر کا بہانہ کیا۔ اور اپنے اضطراب کا خود ہی مذاق بناتے ہوئے کمرہ میں آ کر پڑ رہی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سنا۔ کہ خاتون نے امی جان کو بوسہ دیا۔ اور خوش اخلاقی سے فرمایا "اب آپ غریب خانہ پر تشریف لا کر مجھے مشرف فرمائیے" امی جان نے جواب دیا "ہمیں یہیں شرف حاصل ہو گیا۔ یہی بہت ہے"

آخر اس بے رخانہ اخلاق کا سبب؟ کیا میں محترم خاتون کی نگاہ میں کوئی وقعت حاصل نہ کر سکی؟ کیا وہ اپنے لڑکے کے لحاظ سے میری عمر زیادہ سمجھتی ہیں؟ +

۱۵۔ مارچ

جتنا زیادہ میں شادی کے معاملات پر غور کرتی ہوں۔ مجھے صاف نظر آتا ہے۔ کہ شادی میری سہیلیوں اور میری دوسری ہمجنسوں کے لئے صرف ایک وبال۔ ایک مصیبت عظمیٰ ثابت ہوئی ہے۔ متضاد خیالات میرے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں۔ اور دل میں زیادہ تر ایسے گرے ہوئے جذبات کا ہجوم ہے۔ جو ایک نئی اور نامعلوم جگہ پہنچ کر شخص محسوس کیا کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ میں اپنے مستقبل کا خیال کر کے خوف و دہشت سے کانپنے لگتی۔ میرا بدن ایک قلبی ابتہاج کی وجہ سے مرتعش ہو رہا ہے۔ میں نے اس پر اکثر غور کیا ہے۔ اور یہی پایا کہ اس کی وجہ ذررت کی ان لاانتہا فیاضیوں میں مضمر ہیں۔ جو ایک مشرقی خاتون کو خصوصاً ودیعت کی گئی ہیں۔ کیونکہ ہمارے مذہبی معتقدات اور آبائی اطوار مایوسی

اور رنج والم کے تباہ کن جذبات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہی جذبات باشندگانِ مغرب کے دلوں پر ہمیشہ تصرف کئے رہتے ہیں۔ درآنحالیکہ ہم فضلِ خداوندی پر بھروسہ رکھ کر آیندہ کے متعلق شاداب اُمیدیں رکھتے ہیں (لاتقنطوا من رحمۃ اللہ) مشرق کی ہزاروں عورتیں باوجود انتہائی نکبت و ادبار کے نہایت اطمینان کے ساتھ متبسم ہو کر کہا کرتی ہیں "خداوند تعالیٰ رحیم و کریم ہے ..... اگر آج ہم مصیبت میں گرفتار ہیں۔ تو کل بہتر حالت میں ہونگے ..... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے" کیا یہ الفاظ امید کی دلربا جلوہ ریزیوں کی طرف اشارہ نہیں کرتے ——— وہ اُمید جو ہم کو اطمینانِ قلب کے علاوہ اپنے مستقبل پر کامل اعتبار اور اعتماد کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

۲۵- مارچ

میں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی ڈاکٹر محمد بیگ کی کتاب "سرگذشت زینب" پڑھنے میں مصروف تھی۔ کہ میری سہیلی مریم ناؤم کمرہ میں داخل ہوئیں۔ یہ ملک شام کی رہنے والی ایک عیسائی لڑکی ہیں۔ اور میری ہم جماعت رہ چکی ہیں۔ میں اب تک پرانی دوستی کو قائم رکھتی ہوں۔ مریم کو معلوم ہے کہ ان کی صرف ایک ملاقات میرے دماغ سے اندرونی بخارات کو خارج کر دیتی ہے۔ ہم بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ عورتوں کی آزادی کے متعلق بحث چھڑ گئی۔

میں نے اس آزادی کی مخالفت کرنا شروع کی۔ جس نے مغربی عورتوں کی معاشرت کو کئی پہلو سے خراب کر ڈالا تھا۔ اسی کے ساتھ مشرق کے اُن اصولوں کی تعریف کی۔ جن کی وجہ سے ہمارے اخلاقیات کی پاکیزگی آجتک برقرار ہے۔ مریم نے سختی کے لہجہ میں اپنے رسوم کی مدافعت کی۔ جس نے میرے تمام دلائل و براہین پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہوس اور محبت کے جذبات ان عورتوں میں بہت کم ہوتے ہیں۔ جو پرانی رسوم و قیود سے آزاد کر دی گئی ہوں۔ لیکن اس کے برخلاف پردہ نشین لڑکیوں میں یہ جذبات بہت شدّ و مد کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اپنے دعوے کی دلیل میں وہ کہنے لگیں۔ کہ پردہ نے مشرقی عورتوں کو مردوں کی صحبت سے الگ رکھ کر ان کو عیاش زندگی کے اسرار سے واقف نہ ہونے دیا۔ اور اس طرح ان کی سادہ لوحی کو برقرار رکھا۔ بلکہ ان کے پرواز تخیل کو تیز تر کر دیا اور تخیل محبت کا دروازہ ہے۔ نشۂ جوانی میں سرشار اور پھر اُمنگوں سے لبریز ہو کر مشرقی عورت اس نامعلوم دنیا کے رازہائے سربستہ پر نظر ڈالتی ہے۔ اور عشق و محبت کے جو خواب اس کے دماغ کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ اس کی نظر میں واقعات سے بھی کچھ زیادہ حقیقت رکھتے ہیں۔ انہی اسباب کی بدولت نوجوان مرد اس کو نہایت آسانی کے ساتھ فریب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی نوجوان اس کی محبت کا دم بھرنے لگتا ہے اور اس کے کانوں کو رس بھرے الفاظ سے آشنا کر دیتا ہے۔ تو وہ بیچاری اس کا یقین کر لیتی ہے۔ کیونکہ اس کا دل ابلہانہ خلوص سے معمور ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف زمانۂ موجودہ کی عورت کو دیکھئے۔ وہ برابر مردوں سے ملتی رہتی ہے۔ اور قبل اس کے کہ وہ اسے دھوکہ دے سکیں۔ یہ خود ہی انکو فریب دیدیتی ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ یہ اپنے جذبات پر حکمران ہے ان کو اپنی مرضی کے موافق جہاں چاہے لے جا سکتی ہے۔ اور شباب کی اُمنگوں کے مقابلہ میں اندھا دھند سر تسلیم خم نہیں کرتی۔

ان سطور کو لکھتے ہوئے میں نے مریم کی غلط دلیلوں پر غور کرنا شروع کیا۔ اور ان کی تردید میں ثبوت بہم پہنچانے لگی۔ ہاں وہ غلط تھیں۔ اور کسقدر غلط۔ جزئی آزادی نے ان کے تخیل کو ناکارہ کر دینے کے علاوہ ان کے جذبات و محسوسات کو بھی زہریلا کر دیا ہے۔ آہ! کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے قدیم شریفانہ رسوم پر اسقدر خطرناک بدگمانیاں کی جا سکتی ہیں؟

۲۸- مارچ

آج امی جان بہت مسرور نظر آتی ہیں۔ کیونکہ والد صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ آہ کیا وجہ ہے کہ میرا قلم والد صاحب کے لئے "ابا جان" کا لفظ لکھنا گوارا نہیں کرتا؟ کیا وجہ ہے کہ میں ان کو اس پیارے نام سے مخاطب نہیں کر سکتی۔ جیسے کہ میں والدہ صاحبہ کو صرف "امی جان" کہہ کر پکارتی ہوں؟ کیا وجہ ہے کہ میں ان سے اسقدر بے تکلفی کے ساتھ باتیں نہیں کر سکتی۔ اور نہ اپنی واردات قلب کی سرگذشت ان کو سنا سکتی ہوں۔ حالانکہ امی جان سے میں اکثر کہتی رہتی ہوں؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

میرا جہانتک خیال ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے۔ کہ میں اُن سے اس قدر محبت نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ امی جان کے لئے سخت دلی تکالیف کا باعث ہوئے ہیں۔ سب سے آخری مگر سب سے بڑی مصیبت ان سے

پہنچی۔ کہ اُنہوں نے مجھ سے بھی ایک سال کم عمر لڑکی سے شادی کرلی ہے علاوہ ازیں وہ خود بھی مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ اُنہوں نے کبھی بیرانہ شفقت کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ کبھی محبت سے مجھے بوسہ دیا۔ ان کو میری مطلق فکر نہیں۔ اور مجھ کو اس طریقہ سے نظر انداز کرنا کھاہے۔ جس سے میرے جذبۂ افتخار کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ آج ایک ہفتہ کی غیر حاضری کے بعد وہ واپس تشریف لائے ہیں۔ لاپرواہی کے انداز میں صرف "او ہو حکمت" ایسا اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ میں بھی اپنے تاثرات کو چھپانے کی غرض سے اپنے کمرہ میں چلی آئی ✦

یکم اپریل ۱۹۱۹ء

آج شہر کے دو زبردست تجار۔ ماسٹر میسحا اور شیخ عبدُ ربّہ میں سخت جھگڑا ہوگیا۔ تجارت اور اقتدار کی دیرینہ رقابت دوبارہ ایک خطرناک بلوہ کی شکل میں رونما ہوئی۔ اور ہر ایک کے اعزا و اقارب بھی اس فساد میں شامل ہوگئے۔ ..... اور کافی خون خرابہ ہوگیا۔ لڑائی نے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی تھی۔ کہ شیخ عبدُ ربّہ کے سر میں ایک پتھر لگنے سے گہرا زخم آگیا۔ اور ایک مکّے کی ضرب سے ماسٹر میسحا کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

شہر اور مضافات کے سمجھدار تاجران دو مختلف المذہب تاجروں کی خاصمت کے نتائج سے پریشان تھے۔ ان کو خوف تھا کہ کہیں دشمنانِ ملک اس قضیہ کو مذہبی تعصّب کے سلسلہ میں نہ لے لیں۔ اُنہوں نے کئی مرتبہ اس عداوت کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ اور ان دونوں کو مصالحت کے ساتھ رہنے کی ترغیب دی۔ لیکن یہ تمام کوششیں دونوں کی خطرناک عداوت کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام ثابت ہوئیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ناقابلِ تسلیم شرائط کا طلبگار رہا ✦

مسلم تاجر اس بات پر مُصر تھا۔ کہ ماسٹر میسحا کو اپنی دُکان شہر کے کسی دوسرے محلہ میں منتقل کرلینی چاہئے۔ وہ کہتا تھا کہ عیسائی سوداگر اپنے مزدوروں اور عملہ والوں کے ذریعہ سے میری تجارت اور میرے چال چلن کے خلاف افواہیں پھیلاتا رہتا ہے۔ قبلی سوداگر کے مطالبات بھی بعینہٖ یہی تھے۔ کیونکہ اس کی دُکان زیادہ عرصہ سے قایم تھی۔ ان شرائط کو تسلیم کرنا ہر ایک اپنی عزت کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس مرتبہ ان کے فساد کی وجہ سے پولیس کو بھی دخل دینا پڑا ✦

۷۔ اپریل

آج صبح سے شہر کی سڑکوں پر ایک عجیب ہنگامہ برپا رہا۔ مختلف وضع و قطع کے آدمی تنہا یا ایک مجمع کی صورت میں اِدھر سے اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ اور ان کے چہروں سے مسرت و شادمانی کے آثار نمایاں تھے اکثر لوگ معصر کے قومی جھنڈے اُٹھائے ہوئے تھے۔ اور بہت دُور سے فلک شگاف نعروں کی صدائیں متواتر چلی آرہی تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ قلبِ شہر میں خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ میں ان آوازوں کا مفہوم سمجھنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ کہ تھوڑی دیر میں طلبہ کی ایک جماعت فوجی قواعد کے ساتھ ہمارے محلہ سے گذری۔ سب سے آگے ایک شخص ایک بڑا مصری جھنڈا اُٹھائے ہوئے تھا جس پر ہلالِ صلیب باہم بغلگیر نظر آرہے تھے۔ اور اس نشان کے نیچے ..... "آزادی پائندہ باد" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ تمام جماعت کے چہروں سے پُرخلوص جوشِ قومی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور سب لڑکے چلّا چلّا کر کہتے جاتے تھے۔ "سعد زاغلول پاشا زندہ باد، وفد مصری زندہ باد" اس جوشِ قومی اور وطن پرستی سے مجبور ہو کر ان شہیدوں کی طرح جو اپنی جانیں اپنے خالقِ اکبر کی راہ میں فدا کر دیتے ہیں۔ وہ برابر نعرے لگا رہے تھے "مصر پیارے وطن! ہم تیرے لئے قربان ہو جائینگے" اس نظارہ نے میرے جذبات قومی میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ جس سے میرا تمام بدن جھومنے لگا ..... اور میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے ✦

آخر اس واقعہ کی حقیقت کیا ہے؟ نیک یا بد؟ کیا برطانی حکمرانی اُٹھالی گئی جس کی بابت کہا جاتا تھا۔ کہ فوجی نقطۂ نگاہ سے لازمی و لابدی ہے؟ کیا ارکانِ وفد کی جلاوطنی کو منسوخ کر دیا گیا۔ اور انہیں یہ اجازت مل گئی کہ وہ گفتگو سے صلح میں حصّہ لے سکیں؟

شور و غل برابر ترقی کرتا رہا۔ اور لوگ ہر گلی کوچہ سے آآ کر مجمع کو بڑھاتے جاتے تھے۔ میرے دل میں بھی ایک زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ کہ اس قومی مظاہرہ میں شریک ہوں۔ اور اماں جان سے باہر جانے کی اجازت چاہی۔ تاکہ مادرِ وطن کی آواز پر لبیک کہوں۔ جو میری رگ رگ و پے میں سرایت کر کے مجھے اپنی خدمت کے لئے پکار رہی تھی۔ لیکن اماں جان نے اس خوف سے انکار کر دیا۔ کہ اس عظیم الشان مجمع میں عورتوں کا جانا خطرناک ہے۔ میں نے نرم الفاظ میں اُن کو راضی کرنا چاہا۔ اور اس بات کا یقین دلا دیا کہ



خانۂ عنکبوت

مجھ کو کوئی نقصان جو کچھ وہ خیال کئے ہوئے ہوں، ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ اسی اثنا میں کسی نے دروازہ کو زور شور سے کھٹکھٹانا شروع کیا۔ اور میں بیحد خوفزدہ ہوگئی۔ لیکن فوراً ہی میری تین سہیلیاں حریت۔ سواد اور محبت اندر داخل ہوئیں۔ ان میں سے حریت ایک وزیر کی بیٹی تھیں جو اپنے عہدہ کو برقرار رکھنے کی وجہ سے انگلستان کی طرفدار تھے۔ دوسری سواد شہر کے ایک غریب کی لڑکی تھیں۔ اور محبت جن کی عمر ابھی پورہ برس سے بھی کم تھی۔ مصر کے ایک بڑے نامی بنبرل کی بیٹی تھیں۔ جن کی یہ خواہش تھی کہ قابل سوڈان کی بغاوت دور کرنے میں انہوں نے جو خون بہایا ہے۔ وہ ان کے وطن، مصر کی بہتری کا حاصل ہو۔ محبت ایک فرنچ پہنے ہوئے تھیں جس کا کپڑا خوبصورت مصری نشانات سے مزین۔ اور ان کے سینے پر ہلال و صلیب کا قومی طغرا بنا ہوا تھا۔ حریت نے ہم آپ کو بیدار کر دینے آئے ہیں۔ کیونکہ آج ہمارا وطن اغیار کے پنجہ سے آزاد ہو گیا۔

میں نے پوچھا کہ کیا مصر نے پوری آزادی حاصل کر لی۔ سواد کے چہرہ پر مرگ کیف اور شرر تبسم نمودار ہوا۔ اور عمر بھر نہیں بھلا سکتی۔ اور انہوں نے فوراً جواب دیا اب ہم اپنے معاملات کا آزادانہ کساتھ ہی انتظام کریں گے۔ ... کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس وقت محبت نے ان کی باتوں میں ... پ کلام پایا۔ ... موجودہ تھا۔ سواد کی گفتگو کو کاٹ دیا۔ اور ... بلاکر کہا کہ مصر بھی ... ہمارے ساتھ رہ کر ... ہم سب آزادی کی ... میں شریک ہونے کو تیار ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنا نوخیز سینہ اُبھارا۔ گویا کہ وہ وطن کی گولیاں کھانے کے لئے واقعی تیار ہیں۔ ہیں۔ ... ہماری محبت! ہم اس وقت کس قدر دل پر معلوم ہوتی ہیں۔ اگر ... جو ... ہوئی ہوتی۔ تو معلوم کن کارناموں ... اسی وقت ... اور ... آمینہ ... ہماری گفتگو فضل ... ہماری باتیں ... جب خیالات کے جوش میں آکر ... شروع کر دیا۔ اور ... مصر ایک گانے لگیں۔ جو ہماری فہم سے ... بلکہ ... سمجھ ... لڑکیوں ہم نے کئے ہیں کیا ... ان کا ... جوڑا ...

ان کے گانے اور ناچنے سے ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ اور میری نوعمر سہیلی کا جوش بھی ذرا کم ہو گیا۔ حریت ان کی معصوم روح کا اندازہ لگانے کی غرض سے تیز میں نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کو یہ بھی خیال تھا کہ نہ معلوم یہ سادہ دل خاتون ان الفاظ کا مطلب بھی سمجھتی ہیں جن کو وہ اس آسانی کے ساتھ ادا کر رہی ہیں۔ یا صرف ہجوم خلائق کے متعدی اثرات نے ہمارے دماغ سے ان کو بھی پُرجوش بنا رکھا ہے۔ اور اس خیال سے ہی کہ یہ لڑکیاں غیب دانی میں سرشار ہیں اس کے چہرہ پر بھی سب وطن کا جوش چھلکنے لگا جس کی ہلکی سُرخی سے چہرہ کے گندمی رنگ پر غازہ پھیر دیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ حریت اور وطن پرستی کے جذبات انسان کے دل میں خود قدرت کے ہاتھوں سے نقش و نما پاتے ہیں۔ قدرت ہی ان کی محافظ و نگراں بن کر ان کو فنا نہیں کر سکتی۔ خصوصاً جبکہ ملک و ملت کا ہر فرد ان سے اثر پذیر ہو چکا ہو۔ یہاں تک کہ جاہل اور غریب بھی اسی نشہ میں مخمور ہوں۔

اس عرصہ میں اتنی جان ... کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرتی پھر رہی تھیں۔ محبت نے یہ دیکھ کر کہ شاید ہماری جان کسی فساد کے اندیشہ سے خوفزدہ ہیں۔ اطمینان بخش لہجہ میں کہا "آپ اندیشہ نہ کیجئے۔ آزادی حاصل کرنے کی غرض سے مصری حکومت کے ارکان اور غیر ملکی کے مہر باہم متحد و متفق ہو گئے ہیں۔ مصر کا کوئی ... ایسا نہ کریگا"۔

محبت نے بمشکل یہ الفاظ ختم کئے تھے کہ کھڑکیوں آتشی حریت ہوا۔ حریت نے ان پر ایک جج کی سی ... کی نظر ڈالی۔ ... سر جھکا لیا۔ کیونکہ ان کے والد ہی انگلستان اپنے ... کی وجہ سے حکومت کی طرف داری اور حمایت کا دم بھرتے ... طور پر اس ... وطن پرست لڑکی کو شرمندہ ہونا ... حریت نے ... اور اپنے اعمال کی تبدیل کرنے کی غرض سے کہا کہ ... ان نامہ اور غرب وطن کی وجہ سے انہوں نے خطرہ اور تنہائی کے ... میں اس ذمہ داری کا بار اپنے سر ... ہے۔ بلکہ ... خوشی ... ان کا نصب العین ہے۔ اور یہ بھی خوف ہے کہ کہیں انگلستان سے جو کچھ ملنے کی اُمید ہے اس سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔

محبت کے اس جملے سواد کو بھی حریت کی وجہ سے مغلوب ...

اور اُنہوں نے فوراً جواب دیا "نہیں محبت غلطی پر ہیں۔ ہمارے وزرائے بالآخر ہیں تو مصری ہی، لیکن وہ اب تک اس نظریہ پر قائم رہے کہ انگلستان ملکِ مصر کی بہتری اور سود کا خواہشمند ہے۔ اور اب وہ بھی اس غلطی سے متنبہ ہو کر پھر قوم کی آغوش میں آجائیں گے" حریت نے ایک نگاہ سے ان کا شکریہ ادا کیا +

میری سہیلیوں نے اب مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا۔ ان کی گاڑی خوبصورت جھنڈیوں سے سجی ہوئی باہر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ اسوقت امی جان بھی، جو پہلے میرے باہر جانے کے خلاف تھیں۔ اجازت دینے پر راضی ہوگئیں +

ہم سڑک پر پہنچے ہی تھے۔ کہ ایک سنسنی خیز منظر نے ہماری توجہ کو منعطف کر لیا۔ ہم نے دیکھا کہ شیخ عبدربہ اور ماسٹر میسحا ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے ہیں۔ شیخ عبدربہ انتہائی خوشی سے مخمور ہو کر جامہ سے باہر ہو رہا تھا۔ اور میسحا سے کہنے لگا "میسحا آؤ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہمارے لئے ایک دوسرے سے جھگڑنا مناسب نہیں"۔ اس کے بعد قبطی تاجر نے اس کو بوسہ دیا اور اپنے سینہ سے لگا لیا۔ گویا کہ وہ ایک مدت کے بچھڑے ہوئے پیارے بھائی سے بغلگیر ہو رہا ہے۔ ان کے چاروں طرف ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا تھا۔ اور ان وطن پرستانہ جذبات پر جو اس دلاویز انداز میں رونما ہو کر ہر قلب کو جوشِ مسرت سے معمور کر گئے تھے۔ اظہارِ تحسین و آفرین کر رہا تھا۔ تمام لوگ اپنی پوری آواز کے ساتھ "اتحادِ ملت پائندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے +

جذبات حریت کے اس شاندار مظاہرہ پر میں نے دیکھا کہ میری ہم نشینوں کی شفاف آنکھوں سے ایک سیلابِ اشک رواں تھا۔ ہماری گاڑی شہر کے وطن پرست حصوں میں سے گذرتی ہوئی عابدین کے چوک پر گھنٹہ بھر تک کھڑی رہی۔ جہاں اژدہام خلائق کی وجہ سے ایک قدم آگے بڑھنا دشوار تھا۔ تمام چوک جامع الازہر، مدارس عالیہ اور مدارسِ ثانویہ کے طلبہ سے بھرا پڑا تھا۔ اور ان میں وطن پرست جماعت کے ممبران بھی شامل تھے۔ یہ تمام مجمع ایک جلوس کی شکل میں سعد زاغلول پاشا اور دیگر ارکان وفد کے مکانات پر جا رہا تھا۔ تاکہ ان کی قومی اور وطنی خدمات پر اظہارِ مسرت کیا جائے +

ہم نے دیکھا کہ غیر ملکی لوگ اپنی ڈیوڑھیاں اُتار اُتار کر اس پرخلوص اور پُرامن جلوس کی تعظیم کر رہے تھے۔ مصری اور غیر ملکی خواتین مکانات کی چھتوں سے رومال ہلا ہلا کر اور تالیاں بجا بجا کر جلوس پر پھولوں کی بارش کر رہی تھیں جلوس کے آگے چھوٹے چھوٹے بچے خوشی میں اُچھل اُچھل کر چلاتے تھے "زندہ باد فوجیانِ مصر، ہم آزاد رہینگے یا قومی عزت کے لئے اپنی جانیں قربان کر دینگے۔ فونمالانِ وطن زندہ باد" اوّل اوّل تو شرم و حجاب کی وجہ سے میں ان لوگوں کی ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ لیکن آخرکار میں نے شرم کو بالائے طاق رکھا اور پھر میری رگوں میں جرأت و ہمت کا دَور دَورہ تھا +

سب سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے۔ کہ قدامت پسند حضرات بھی اس جلوس سے نہ تو خائف تھے اور نہ بیزار بلکہ اکثر تو خود تبسم چہروں کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر اور خوشی کے نعرے لگا لگا کر ہماری ہمت افزائی کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ انقلاب ہمارے رسوم و عقاید پر بہت گہرا اثر چھوڑ جائیگا۔ اور ہماری اجتماعی زندگی کے نظام میں فوری تبدیلی پیدا کر دیگا +

متوسط طبقہ کی عورتیں بھی اس جلوس کے ساتھ تھیں۔ وہ کرایہ کی گاڑیوں میں بیٹھی ہوئی ڈھول اور تماشوں کی آواز پر جدید قومی گیت گا رہی تھیں۔ اور دیہاتی انداز میں رقص کرتی جاتی تھیں۔ شہر کی تمام سڑکیں ان وفود سے معمور تھیں۔ جو قاہرہ کے قرب و جوار کے دیہات سے اس قومی مظاہرہ میں شریک ہونے کو آئے تھے۔ ان کے آگے زرق برق اونٹوں کی قطاریں تھیں اور دف اور نفیری کے باجے بج رہے تھے۔ گویا کہ وہ کسی تقریب میں شرکت کی غرض سے آئے ہیں۔ تمام سڑام گاڑیاں اونٹ کی شاخوں اور کھجور کے پتوں سے سجائی گئی تھیں۔ اور ان میں طلبا بھرے پڑے تھے بعض لڑکے تو ہمت کر کے ان کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور وہاں سے آزادی اور حریت کے نعرے لگا رہے تھے۔ مصری فوج کی ایک رجمنٹ بھی فوجی قواعد کے ساتھ عباسی بارکوں سے نکل کر مظاہرہ میں شامل ہو گئی۔ جس سے ہمیں اور زیادہ تقویت حاصل ہو گئی۔ ہم نے تمام مجمع نے اس کے شمول پر اظہار مسرت کیا۔ اور "زندہ باد افواجِ قاہرہ مصر" کے نعرے لگائے۔ فوج والوں نے بھی اسی جرأت سے۔ جو مصر خاصہ ہے۔ جواب دیا۔ "زندہ باد اہل وطن۔ مصر برائے مصریاں" انگریزی افواج کے سپاہی بھی بغیر ہتھیار لگائے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ میں ان کے چہروں کو غور سے دیکھتی رہی۔ اور جو کچھ خیالات ان کے

دماغ میں گذر رہے تھے، ان کا مشاہدہ کرکے اپنی طبیعت کو مسرور کرتی رہی۔ بعض فیاض منش انگریزوں کو میں نے دیکھا۔ کہ وہ ہمارے وطن پرستانہ جذبات کے اس طوفان کو دیکھ کر اطمینان اور رضامندی کا اظہار کر رہے تھے لیکن بعض لوگ اس بے ضرر اور پرامن مظاہرہ سے بیزار نظر آتے تھے۔ ان کے مصنوعی تبسم سے غصہ اور حقارت کا اظہار ہو رہا تھا۔

آج کا مظاہرہ ایک افسوسناک وقوعہ پر ختم ہوا جس کی تہیں وہ مخفی ہاتھ کام کر رہا تھا۔ جو ہمارے اتحاد ملی کے ظہور۔ ہماری حب وطن کی طاقت اور ہماری حیاتِ قومی کے نشوونما سے خائف تھا۔ اس پوشیدہ طاقت کی وجہ سے چند غیر ملکی سپاہیوں نے جلوس پر فیر بھی کئے۔ تاکہ ہم لوگ غیض وغضب کی حالت میں قانون کی حدود سے باہر ہو جائیں۔ اور پھر مسلح فوجیں امن عامہ کے قیام کے لئے آزادی کے اس جلوس کو منتشر کردیں۔ کچھ فوجیں اس غرض کے لئے بلائی بھی گئیں۔ اور ازبکیہ باغ میں مقیم کردی گئیں۔ انہوں نے باغ کی قلعہ بندی کرکے دیوار کے پیچھے سے گولیاں چلانی شروع کردیں۔ جس سے تین مصری سپاہی زخمی ہو گئے۔ تمام مجمع میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور قریب تھا کہ ہمارا یہ پرامن مظاہرہ ایک خطرناک بغاوت کی شکل اختیار کر لیتا۔ کہ چند مشہور مصری مدبرین نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کردیا +

اس وقت ہم شاہراہ رآمی اور کاسل کے قریب تھے۔ اور ہمارے چاروں طرف خواتین مصر کی سینکڑوں گاڑیاں تھیں۔ گولیاں برابر سنسناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گذر رہی تھیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہم خوفزدہ ہو کر اپنی خودداری کو ہاتھ سے چھوڑ دیتے۔ اس وحشیانہ طاقت کے اظہار نے ہماری جرأت کو اور مشتعل کردیا۔ ہم نے اسی بنا پر پیچھے لوٹنے سے انکار کردیا۔ اور باغ کے گرد برابر آگے بڑھتے رہے۔ فیر ملکی سوار فوج کے دستے چھاؤنی سے فوراً طلب کئے گئے۔ اور اس مظاہرہ کو منتشر کرنے کے لئے لوگوں کو روکنے لگے۔ جو کوئی بھی ان کے احکام کی خلاف ورزی کرتا۔ یہ اس پر بلا تکلف فیر کردیتے۔ اس موقع پر ہماری گاڑی سب سے آگے تھی۔ لہٰذا ہم نے کوچوان سے کہا کہ وہ فوج کی غلطی پرواہ نہ کرے۔ اور بلا تکلف گاڑی کو آگے بڑھائے۔ ہماری گاڑی اور اس کے بعد چند موٹر کاریں چند ہی قدم آگے بڑھی تھیں۔ کہ ایک سپاہی نے ہم کو ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ اور فوراً ہی گولیاں ہوا میں تموج پیدا کرتی ہوئی ہمارے کانوں کے پاس سے گذرنے لگیں۔ لہٰذا ہم کو سپاہیوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اور چلا کر ان سے کہا "اپنی ان غیر منصفانہ اور ظالمانہ حرکات سے باز آؤ۔ مصر کو آزاد اور خود مختار رہ کر جینے دو" +

۸-اپریل

آج مجھے معلوم ہوا کہ انگلستان نے وفد کے چار مقید ارکان کو رہا کردیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پبلک کی خواہشات سے مجبور ہو کر اس کو ایسا کرنا پڑا +

مصر طبعاً ایک خاموش اور راضی برضا ملک واقع ہوا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ہموار میدانوں میں نہ تو پہاڑ ہیں نہ صحرا۔ جہاں انقلاب پسند احرار مفرورین حکومت کے دست جفا سے بھاگ کر پناہ گزین ہوں۔ یا طلب! کہ یہی امن پسند عناصر اپنے ملک کی کامل آزادی کے لئے آج اسقدر جلد مشتعل ہو گیا +

انگلستان جبر وقوت کے بجائے جس روادارانہ پالیسی کا اظہار کر رہا ہے۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ ہم لوگ آزادی کی متاع عزیز کو خود ہی حاصل کر کے رہینگے۔ علاوہ بریں جو قوم دنیا میں آزادی کی خواہشمند ہو اس کے لئے خود اعتمادی ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے +

یا ربنا! ہم ایک مہذب اور تربیت یافتہ قوم ہیں۔ امن وامان کے دلدادہ۔ قانون وعمل کے شائق۔ لیکن ہم دل وجان سے یہ تہیہ کر چکے ہیں۔ کہ اپنی آزادی۔ اپنے حقوق۔ اور اپنی خود مختاری واپس لے کر رہیں گے۔ خواہ ہمیں کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ کرنی پڑیں۔ خداوندا! ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے پاکیزہ مقاصد میں کامیاب ہوں +

۹-اپریل

میں محسوس کر رہی ہوں۔ کہ حب وطن کی آگ میرے رگ وپے میں مشتعل ہے۔ اور مجھے اس بات پر آمادہ کر رہی ہے کہ کوئی بہادرانہ کام کرکے ملک وملت پر قربان ہو جاؤں اور سرزمین وطن کو اپنے خون سے لالہ زار بنا دوں۔ لیکن ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کون سا کام

میرے وطن کے لئے سب سے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوگا +

۱۱- اپریل

آج نہ معلوم کیا بات ہے کہ مجھے ایک کتاب کا بار بار خیال آرہا ہے۔ جو عرصہ ہوا میں نے فرقۂ نہیلسٹ[1] پر پڑھی تھی + میرے سامنے ان خطرات و مصائب کا خاکہ کھنچ گیا۔ جو رُسی عورتوں کو اپنے ملک کی آزادی کے لئے اُٹھانے پڑے تھے۔ قید۔ جلاوطنی۔ بیماری۔ سردی۔ اور بھوک پیاس کی تکالیف جو اُنہوں نے برداشت کیں۔ پیشِ نظر ہوگئیں۔ میرے دل میں محبت اور ہمدردی کے جذبات کا ایک تلاطم برپا ہوا۔ حسیات و خیالات نے اُن کے استقلال اور تحمل کی تعریف کی۔ اور دل ان جذبات سے اثر پذیر ہو کر ایثار اور قربانی کے لئے مضطرب ہوگیا +

۱۲- اپریل

اپنے وطن کی خدمت میں فنا ہو جانے کی اُمیدیں جس قدر میرے دل میں راسخ ہوتی جاتی ہیں۔ اُسی قدر ایثار کی خواہش بڑھتی جاتی ہے میں نے یہ تحریک پیش کی ہے۔ کہ عورتوں کی ایک جمعیت بنائی جائے۔ جس میں حریت۔ سواد۔ محبت اور دوسری ایسی ہی پُرجوش وطن پرست عورتیں شامل ہوں۔ تاکہ قوت و اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہم ان دنی الطبع اور رُذل لوگوں کو خائف کرسکیں۔ جو اپنے وطن اور اپنی ملت سے غداری کرنے پر آمادہ ہیں +

۱۳- اپریل

میری تحریک کو میری سہیلیوں نے دلی مسرت کے ساتھ قبول کیا۔ اور آج سے ہم سب اس بات پر تیار ہوگئے کہ ہر پہلو سے اس تجویز پر غور کریں۔ اور اس لئے زرِ نقد اور دیگر لوازمات کی فراہمی کا سامان کریں +

۱۴- اپریل

جس دن سے میں نے اپنی زندگی کو مفید اور کارآمد بنانے کا طریقہ معلوم کیا ہے۔ میرا کوئی دن بیکاری اور کوفت میں بسر نہیں ہوا۔ چنانچہ میری قومی مصروفیات۔ میری قابلیت عمل اور مسرت قلبی میں برابر اضافہ کرتی ہیں + ایک مشہور فلسفی کا قول ہے۔ کہ اپنے آپ کو ہمیشہ ضروری امور میں مشغول رکھو۔ اور قدرت کی ان فیاضیوں کو جو تم کو عطا کی گئی ہیں، مصروف کار رکھکر زیادہ کرتے رہو۔ میں بھی اسی زرّیں اصول پر عمل پیرا ہوں +

۱۵- اپریل

شادی کی دلالہ زکیہ۔ آج آئی۔ اور امی جان سے خلوت میں بات چیت کرتی رہی۔ گھنٹوں ختم ہونے ہی میں جان میرے پاس آئیں۔ مسرت و شادمانی کی علامات ان کے چہرہ سے مترشح تھیں۔ حالانکہ اس میں فکر کا رنگ بھی جھلک رہا تھا۔ "حکمت! تمہارے لئے خدا نے شوہر بھی دیا..... لیکن تم سے عمر میں ذرا زیادہ ہے..... پچاس کے قریب..... لیکن مالدار بہت ہے۔ اور گورنمنٹ کی ملازمت میں بڑی تنخواہ پا رہا ہے..... تمہارا کیا خیال ہے؟" اتنا کہکر وہ یہ دیکھنے لگیں۔ کہ ان الفاظ کا مجھ پر کیا اثر ہوتا ہے + میں نے حرکت تک نہ کی۔ بلکہ اسی سرد مہری کے انداز سے خاموش بیٹھی رہی۔ کیونکہ آئندہ شادی کی مطلق فکر نہیں۔ صرف اس خیال سے کہ یہ میری قوم تدابیر میں فعل انداز ہوگی۔ میرا خداوند اپنے مفروضہ حقوق کی بنا پر میرے کاموں میں ضرور دخل دیگا۔ اور میری حریت اس بات کو قطعی گوارا نہ کرسکتی + مجھے معلوم نہیں کہ میری زبان سے کس طرح یہ الفاظ نکل گئے "امی جان! جو آپ کا ارشاد ہو" میری سمجھ میں یہ بات اب تک نہ آسکی کہ آیا میں نے امی جان کی محبت سے مجبور ہو کر یہ جواب دیدیا۔ یا یہ خیال اس کا محرک ہوا۔ کہ میں امی جان کی مسرتوں میں ایک گونہ استقلال پیدا کرسکوں۔ کیونکہ میرے غیر شادی شدہ رہنے پر وہ بچاری رنج و فکر میں رہتی ہیں۔ میں نے جواب کے آخری الفاظ بمشکل ادا کئے تھے کہ انہوں نے فرطِ محبت سے مجھے گلے لگا لیا۔ "امی جان! میں آپ کے محبت بھرے دل کو کبھی ٹھیس نہ لگاؤنگی۔ اگر اپنی لڑکی کی شادی سے آپ کو اس دنیا میں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تو میں ضرور شادی کرلونگی +

---

[1] نہیلسٹ (NihiLiST)۔ زمانہ جنگ عظیم میں روس کی ایک سیاسی جماعت +

۱۶-اپریل

رات میں بالکل نہ سو سکی۔ کیونکہ مختلف پریشان کن خیالات میرے دماغ میں چکر لگاتے رہے۔ مجھے صرف اس بات کا رنج تھا کہ میرا امن ایک پیرکہن سال سے وابستہ کیا جا رہا ہے۔ جس کو بیوی کے بجائے تیماردار کی زیادہ ضرورت ہے۔ میری تمنا تھی کہ میں کسی نوعمر سے بیاہی جاؤں میں نے دل کی خلش کو کم کرنے کے لئے دلائل تراشنا شروع کئے۔ کیا شوہر کا بوڑھا یا جوان ہونا میرے نزدیک کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ درآنحالیکہ میرا دل محبت کے ولولہ انگیز جذبات سے ابتک مبرا ہے؟ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ بوڑھا فوندھ ہونے میں چند فوائد ہیں۔ اس کے جذبات خاموش مگر گہرے ہوتے ہیں۔ اس کے اوضاع و اطوار میں پسندیدگی اور نفاست پیدا ہو جاتی ہے۔ اور چال چلن کے اعتبار سے وہ غیر متزلزل اور مضبوط ہوتا ہے۔ وہ میرے دل میں حسد و رقابت کے سمندر کو متلاطم نہ کر سکیگا۔ درآنحالیکہ نوجوان اپنی عیاشی اور بدچلنی کی بدولت بہ آسانی کر سکتا ہے۔ اسے اپنے روزینۂ حیات کی طرف سے اطمینانِ کلی حاصل ہے۔ اور وہ مجھے طلاق دینے کا خیال بھی دل میں نہ لائیگا۔ لہذا میں اور میری اولاد فارغ البالی کی زندگی بسر کرینگے۔ اور ہر چہار طرف اطمینان و مسرت کے دل خوشکن نظارے ہونگے۔

ان بہجت افروز دلائل کے باوجود بھی میرے غم واندوہ میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اور اس دلی تکلیف کے صدمہ سے میں کراہنے لگی۔ جگر دوز آہیں رہ رہ کر چیرتی ہوئی اندرونِ قلب سے متواتر نکلتی رہیں۔ لیکن اسی دوران میں امی جان برابر کے کمرہ میں ہمہ تن مسرور و متبسم بیٹھی ہوئی زکیہ کے ساتھ شادی کے سامان کا اندازہ لگا رہی تھیں +

۱۷-اپریل

مجھ پر یہ ایک تازہ مصیبت نازل ہوئی ہے۔ اس شادی کا تصور ہی مجھے خوفزدہ کر رہا ہے۔ اور اس خوف کی وجہ سے تمام جسم میں اکثر ایک اہتزازی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا کہ میں ایک نہایت گہرے غار کی بلندی پر کھڑی ہوئی نیچے کو جھانک رہی ہوں + اکثر یہ ارادہ کر لیتی ہوں کہ شادی سے انکار کر دوں۔ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی امی جان کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ کہ وہ فرطِ مسرت سے مجھے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ پھر فوراً ہی یہ دیکھتی ہوں کہ ان کا شیریں تبسم انتہائی رنج و ملال سے مبدل ہو جاتا ہے۔ اور ان کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں + آہ امی جان! میں آپ کے غم والم میں ہرگز اضافہ نہیں کر سکتی۔ میں یقیناً آپ کے لئے مسرت کے ایسے سامان فراہم کروں گی جن سے آپ عمر بھر نہ آشنا رہی ہیں +

(امروہہ) انیس الدین احمد رضوی ایم اے۔ آنرز (علیگ)

مُحبّت!

محبت؟ ہر کوئی کہتا تھا محبت شاہنشاہوں کی شاہنشاہ ہے۔ اور کامرانی اُس کے سر کا تاج ہے۔ اور زمین اُس کے بازوؤں کیساتھ شعلہ بن کر بھسم ہو جاتی ہے۔ اور چاند اور سورج گردنیں خم کر دیتے ہیں!

لیکن میں خوب جانتا تھا کہ مجھ میں اتنا بوتا نہیں کہ فلک الافلاک کی بلندیوں تک پہنچ جاؤں۔ اسلئے جب میں کسی ملکہ سے دو چار ہوتا فوراً آنکھیں چرا لیتا +

محبت!۔ محبت؟ ہر کوئی کہتا تھا۔ محبت کانٹوں کا تاج اور زہر کا پیالہ ہے +

لیکن میں غم پسند نہیں ہوں۔ اور مسرت ہی پر قانع رہتا ہوں۔ اس لئے جب کوئی حزین حسینہ میری نظر پڑتی میں دوسری طرف کترا کر نکل جاتا۔ جب میں نہایت مطمئن ہو کر بے خوف و خطر چلا جا رہا تھا کہ تم مجھے راہ میں لہراتے ہوئے کھیتوں کے کنارے سرسری طور پر ملے۔ مجھے یہ کسی نے بھی نہیں بتایا تھا اور نہ میں جانتا تھا کہ یہ جو میرے ساتھ ساتھ ہے یہی میرا محبوب ہے۔ تم ہی میرے محبوب ہو!!——

دسمبر ۱۹۲۷ء

ابنِ خلدون اور اُس کا فلسفۂ تاریخ

(از جناب شیخ عنایت اللہ صاحب ایم اے معلم عربی۔ گورنمنٹ کالج)

(براہِ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا)

افریقہ کی اسلامی مملکت نے اپنے عہد ترقی میں ایک اعلیٰ درجہ کا فلسفی مورخ اور عالم عمرانیات پیدا کیا۔ اس کا نام نامی ابن خلدون ہے۔ اس سے پہلے کسی شخص کے دماغ میں تاریخ کے فلسفے کا ایسا صریح اور واضح تخیل پیدا نہیں ہوا تھا۔ جیسا کہ ابن خلدون نے قایم کیا۔ مختلف اقوام کی نفسیاتی خصوصیات کیا ہیں؟ ان کے اختلاف کے کیا اسباب ہیں؟ سلطنتیں کس طرح بنتی اور بگڑتی ہیں؟ تمدنوں کی بوقلمونی کیوں ہے؟ کن اسباب سے ان کی نشو و نمو ہوتی ہے۔ اور کن اسباب سے ان کی ترقی رُک جاتی ہے؟ اس قسم کے مسائل پر ابنِ خلدون نے اپنے مشہور عالم مقدمۂ تاریخ میں نہایت تفصیل اور آزادی کے ساتھ عالمانہ طریق پر بحث کی ہے

یورپ میں کہیں اٹھارہویں صدی میں جا کر ایسے مصنفین پیدا ہوئے جنہوں نے تاریخ پر اس انداز سے غور و فکر کیا۔ ابن خلدون مونٹ سکیو ( ) اور ابے دماہلی ( ) کے قبیل سے ہے۔ اور ہمارے عہد حاضر کے علما عمرانیات ( ) مثل تارد یا مستشرقین مثل گوبینو کا ابو الآبا ہے +

سوانح حیات

ہم یہاں ابن خلدون کی سوانح عمری کو شرح و بسط کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ ہم عجلت کے ساتھ اُس کے خیالات کی تشریح کرنی چاہتے ہیں۔ اس نے اپنے سوانح عمری کو خود قلمبند کیا ہے۔ اور اپنی تاریخ کے ساتھ شامل کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تونس (افریقہ) میں ۷۳۲ھ ہجری مطابق ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور مختلف حکمرانوں کی ملازمت میں رہا۔ ان میں سے خاندان بنی مرین کے تاجدار ابو عنان سلطان فاس نے اسکو کچھ مدت قید میں رکھا +

ابن خلدون کچھ عرصہ شاہ تلمسان کی خدمت میں بھی مامور رہا۔ یہہ بادشاہ بنی زیان کے خاندان سے تھا۔ اس نے تلمسان کو بنی مرین کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ ایبت باریے ( ) نے بنی زیان سلاطین تلمسان کے متعلق کئی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ جن کا تعلق ابن خلدون کے سوانح عمری سے بھی ہے۔ ابن خلدون کا ایک برادر خُرد اسی بادشاہ کے دربار میں کاتب کے عہدہ پر فائز تھا۔ جس نے ان ممالک کی تاریخ لکھی ہے۔ اور علاوہ ازیں ایک شاعر بھی تھا۔ باریے نے اس کی شاعرانہ قابلیت کی بہت تعریف کی ہے۔ ابن خلدون جو کئی دیگر اوصاف و کمالات کا مالک تھا افسوس کیا کرتا تھا کہ اُس نے اپنے بھائی کی طرح شعر و شاعری کی طرف توجہ نہیں کی۔ سلطان بھی جس کا نام ابو حمو تھا۔ ایک ممتاز شاعر تھا۔ اور ہمدردی اور خوش خلقی اس کی خصلت و سیرت کی نمایاں صفات تھیں۔ اس کی تعلیم و تربیت غرناطہ کے دربار میں ہوئی تھی۔ جہاں علوم و فنون کی بڑی قدردانی تھی اس نے بہت سی عمدہ عمارتیں بھی بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ باریے کی رائے ابن خلدون کے متعلق اچھی نہیں۔ اس کا اعتراض یہ ہے کہ ابن خلدون کا کلام بے ترتیب اور بے سلیقہ ہے۔ علاوہ ازیں وہ لکھتا ہے کہ ابن خلدون کا اصول اور سیاسی مسلک یہ تھا کہ وہ اپنے ذاتی مفاد اور سلامتی کی خاطر ایک فریق کو چھوڑ کر دوسرے فریق میں جا ملتا۔ مگر ہم جب ابن خلدون کے پُر آشوب اور ہنگامہ خیز عہد کا لحاظ کرتے ہیں۔ تو ہمیں اس کے متعلق رائے قائم کرتے وقت بڑی آشتی اور نرمی روا رکھنی پڑتی ہے +

ابن خلدون پیٹر شاہ کیسٹائل کے دربار میں سلطان غرناطہ کا سفیر بن کر گیا۔ پیٹر نے چاہا کہ ابن خلدون اس کی ملازمت اختیار کرے۔ مگر اس نے منظور نہ کیا۔ اس کے بعد وہ قاہرہ چلا گیا۔ جہاں وہ کبھی قاضی اور کبھی معلم کے فرائض بجا لاتا رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنی خرید کردہ جاگیر واقع فیوم میں چلا گیا۔ جہاں اُس نے اپنی کتاب کا ایک حصہ سپرد قلم کیا جس وقت تیمور لنگ نے شام پر حملہ کیا تو ابن خلدون نے اپنا مطالعہ ترک کر کے تاتاری فاتح کے خلاف مہم میں حصہ لیا۔ اور ممالک مصر کی شکست کے بعد دمشق ہی

میں اقامت گزین ہوگیا۔ اہل شہر نے اس کو صلح کی گفت و شنید کے لئے مغلوں کے لشکر میں بھیجا۔ تیمور اس کے ساتھ دیر تک ہم کلام رہا۔ اور اُس نے ابن خلدون سے بلادِ مغرب کا حال دریافت کیا۔ ابن خلدون نے اس طرح جواب دیا۔ گویا کہ مغرب کا ملک اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے بعد تیمور نے اپنی فتوحات کا حال سُنایا۔ ابن خلدون تیمور کی اجازت سے واپس قاہرہ چلا آیا۔ اور کچھ عرصہ یہاں عہدۂ قضاء پر مامور رہ کر ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۶ء میں تہتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ وہ ایک خوش وضع اور ذی وجاہت انسان اور ایک اعلیٰ مدبر اور سیاست دان تھا۔

تصانیف

اس نامور مصنف کی تصنیف سے ایک تاریخ عالم ہے جس کا آخری حصہ اقوام بربر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ موسیو دزلان (M.WAZLAN) نے اس حصہ کو فرانسیسی کا جامہ پہنایا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے پہلے ایک مقدمہ لکھا ہے۔ جو بذاتِ خود ایک مستقل کتاب ہے۔ یہی وہ مقدمہ ہے جس میں اُس نے اپنے فلسفۂ تاریخ کو بیان کیا ہے۔ یہ مقدمہ ایک ضخیم سا کلو پیڈیا ہے جس میں تمام متعلقہ مسائل پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے اور تاریخ کو فلسفہ کی ایک شاخ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"فن تاریخ اپنی ظاہری صورت میں قرون ماضیہ اور دول سابقہ کے حالات و واقعات کا مجموعہ ہے۔ جن کے تذکرہ سے لوگ اپنی رنگین بیانی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اور محفلیں گرم کرتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کن کن حالتوں میں سے ہو گذری ہے۔ کس طرح مختلف قوموں اور سلطنتوں نے روئے زمین پر اپنی حکومتیں قائم کیں اور عالم کو آباد کیا۔ یہاں تک کہ ان کا سورج رحلت بج گیا۔ اور ان کے زوال کا وقت آپہنچا"۔

"اگر ہم علم تاریخ کے باطن پر غور و فکر کریں تو نظر و تحقیق کے لئے ایک وسیع میدان موجود ہے۔ کیونکہ اس علم میں کائنات اور اُس کی ابتداء کی تعلیل اور واقعات تاریخ کی کیفیت اور اُن کے عمیق اسباب سے بحث ہوتی ہے۔ لہٰذا علم تاریخ حکمت پر مبنی ہے اور اسی کی ایک شاخ ہے۔ اور اس لائق ہے کہ اسے حکمت و فلسفہ میں شمار کیا جائے"۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے۔ کہ ابن خلدون کی رائے میں واقعات کی تحقیق و تنقید اور ان کے اسباب کی جستجو کا نام تاریخ ہے۔ اس تحقیق و تفتیش کا تقاضا یہ ہے کہ اقوام کی نفسیات اور اُن کے تمدن کا مطالعہ کیا جائے۔

ابن خلدون اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ اُس کے عہد میں عمران یعنی تمدن کی سطح پست ہو چکی ہے۔ اور یہ کہ اس سے پیشتر کئی تمدن دنیا میں رونما ہو کر فنا ہو چکے ہیں۔ "جو علوم ہم تک نہیں پہنچے وہ ان علوم سے جو ہم تک پہنچے ہیں کہیں زیادہ ہیں۔ اہل فارس کے علوم کہاں ہیں جو فتح ایران کے وقت حضرت عمرؓ کے حکم سے مٹ گئے[1]۔ کلدانیوں۔ سریانیوں اور اہل بابل کے علوم کو کیا ہوا؟ اور کہاں ہیں اُن علوم کے وہ آثار و نتائج جو ان اقوام کے درمیان ظاہر ہوئے۔ ان قبطیوں اور اُن کی ہمسر اقوام کے علوم کہاں ہیں؟ ہم تک صرف ایک قوم یعنی یونان کے علوم پہنچے ہیں اور وہ بھی خصوصاً خلیفہ مامون کے طفیل جس کو ان علوم کے ترجمہ کا شوق تھا۔ اور کثرت مترجمین اور صرف زر کثیر کی بدولت اس کام کو سرانجام دے سکتا تھا۔ یونانیوں کے سوا دوسری قوموں کے علوم و فنون سے ہم واقف نہیں ہوئے"۔

اس بیان میں شاید کسی قدر مبالغہ ہے۔ کیونکہ ایرانیوں۔ ہندیوں اور اسرائیلیوں کے علوم اور خیالات ایک حد تک مسلمانوں کے ہاں منتقل ہوئے ہیں۔ تاہم ابن خلدون کے بلیغ الفاظ سے اس قدر تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے تصور میں تہذیب و تمدن کا مفہوم کتنا وسیع ہے۔

فلسفہ تاریخ

اس کے بعد ابن خلدون یہ بیان کرتا ہے کہ جماعت ہائے انسانی کس طرح بنتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ انسان جماعتوں اور گروہوں میں ملکر رہتا ہے۔ یہ بات منفرد آدمی کی کمزوری اور بے بسی کا نتیجہ ہے۔ "شخص واحد کی قوت اس کے حوائج مثل غذا وغیرہ کے حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ اور اس کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کے لئے کافی نہیں۔ علاوہ ازیں اکیلے آدمی کی طاقت جو انات خصوصاً درندوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی"۔ جماعت انسانی کے لئے حکومت و سیاست ضروری ہے۔ ابن خلدون کی رائے کے مطابق بادشاہ ایک مدبر یا مصنف ہوتا ہے۔ جو لوگوں کو ایک دوسرے پر دست تعدی دراز کرنے سے روکتا ہے۔ اس قسم کا ایک حاکم علی ضرور ہونا چاہئے جس کا ہاتھ مضبوط ہو اور جسے باقی لوگوں پر غلبہ اور حکومت حاصل ہو۔ تاکہ وہ لوگوں کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روک سکے۔ ملک اور سلطنت کا مفہوم یہی ہے۔ اس کے بعد وہ انسانی جماعتوں کا حیوانات کے ساتھ ان الفاظ میں مقابلہ کرتا ہے "جیسا کہ حکماء نے ذکر کیا ہے بعض حیوانات مثل شہد کی مکھی اور مکڑی کے درمیان بھی ایک سردار پایا جاتا ہے

دسمبر ۱۹۳۶ء

[1] حضرت عمرؓ کے حکم سے مٹ گئے یا زمانے نے خود مٹا دیئے؟ (ایڈیٹر)

جس کی دوسرے ابناء جنس اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں۔ یہ سردار اپنی خلقت اور جسم میں دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے لیکن حیوانات میں یہ بات بمقتضائے فطرت پائی جاتی ہے نہ کہ بموجب عقل وسیاست +

آب وہوا کا اثر انسانی اخلاق وعادات پر

اقوام کی طبیعت واخلاق پر آب وہوا کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ ابن خلدون نے اس اثر کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ معتدل اقالیم کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ "جو اقالیم اعتدال سے دور ہیں یعنی اقلیم اوّل و دوم وسوم وہفتم۔ ان کے باشندے اپنے تمام خیالات میں اعتدال سے بہت دور ہیں۔ چنانچہ ان کے گھر گارے اور بانس کے بنے ہوتے ہیں ان کی خوراک باجرا اور گھاس پات ہوتی ہے۔ اور لباس کی جگہ وہ درختوں کے پتے یا جانوروں کی کھالیں اپنے گرد لپیٹ لیتے ہیں۔ اور اُن میں سے اکثر تو بالکل برہنہ رہتے ہیں۔ ان ملکوں کے پھل اور سامان خورونوش بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں"+

اقالیم معتدلہ متوسطہ یعنی اقلیم چہارم ودہیم وششم کے باشندے اسکے بالکل برعکس ہوتے ہیں "ان اقالیم کے رہنے والے اپنی شکل وصورت اور اخلاق وسیرت میں اعتدال پر ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمدن کے تمام طبعی لوازمات یعنی ان کے طرز معاشرت۔ مکانات۔ صنعت وحرفت۔ علوم و فنون۔ ریاست وحکومت میں اعتدال پایا جاتا ہے۔ انہیں میں انبیاء و رُسل مبعوث ہوئے اور دینی شریعتیں پیدا ہوئیں۔ حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں۔ علوم وصنائع کو فروغ حاصل ہوا۔ بڑے بڑے شہر آباد ہوئے عالی شان عمارتیں تیار ہوئیں۔ غرض یہ کہ وہاں کی ہر بات میں حُسن اعتدال پایا جاتا ہے۔ وہ اقوام جو ان اقالیم معتدلہ میں آباد ہیں اور جن کی تاریخ سے ہم واقف ہیں حسب ذیل ہیں:۔ عرب۔ رومی۔ ایرانی۔ بنی اسرائیل۔ یونانی۔ اہل ہند اور اہل چین"+

مختلف اقوام کے اخلاق وسیر کا مطالعہ کرتے وقت ابن خلدون نے بعض نہایت دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً وہ یہ سوال اُٹھاتا ہے کہ سُودان یعنی حبشی لوگ کیوں زندہ دل اور خوش طبع ہوتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ اس سے پیشتر مسعودی نے بھی اس کا سبب دریافت کرنا چاہا تھا۔ ابن خلدون کی رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں سامان خورونوش آسانی سے میسّر آتا ہے۔ زندہ دلی اور ناعاقبت اندیشی ان اقوام کی خصوصیات سے ہیں جو ایسے ممالک میں رہتے ہیں جہاں کھیتی باڑی آسان ہے۔ جن ملکوں میں کاشتکاری مشکل ہے وہاں اس کے برعکس حالت مشاہدہ میں آتی ہے "یہ بلاد مغرب میں شہر فاس چاروں طرف خشک اور بارومیدانوں سے گھرا ہوا ہے۔ تم وہاں کے باشندوں کو سوچ بچار میں سر جھکائے دیکھو گے کیوں کہ ان کی نظر ہمیشہ انجام کار پر لگی رہتی ہے۔ یہانتک کہ وہاں کا ہر ایک آدمی دو دو برس کے لئے غلّہ جمع رکھتا ہے۔ اور پھر بھی ہر صبح ردی سامانِ خوراک بازار ہی سے لاتا ہے۔ تاکہ اُس کے ذخیرہ میں کمی واقع نہ ہو۔ اسی طرح اگر تم دیگر اقالیم وممالک پر نظر ڈالو۔ تو تم دیکھو گے کہ آب وہوا کی کیفیت وہاں کے باشندوں کے اخلاق پر بڑا اثر ڈالتی ہے"+

خوراک کا اثر انسانی ابدان واخلاق پر

خوراک کا بھی انسانی طبائع پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ بعض ایسے ممالک ہیں جہاں غلّہ جات اور خوراک بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی زمین طاقتور اور زرخیز ہوتی ہے۔ بعض ایسے علاقے ہیں جہاں کھیتی باڑی اور گھاس پات کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ وہاں کے باشندے پالتو جانوروں کے دودھ اور اُون پر گذران کرتے ہیں۔ مگر باوجود اس امر کے یہاں کے لوگوں کی جسمانی اور اخلاقی حالت اُن لوگوں کی نسبت بہتر ہوتی ہے جو عیش وآرام میں رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے رنگ صاف ہوتے ہیں جسم تندرست اور شکل وصورت اچھی ہوتی ہے۔ ان کے اخلاق اعتدال سے نزدیک تر۔ ذہن تیز ہوتے ہیں+

بدوی اور حضری زندگی

ابن خلدون سادہ زندگی کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اگرچہ وہ خود مختلف علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور صنائع کی ترقی کے اسباب و شرائط سے خوب واقف تھا۔ تاہم وہ بدوی طرز زندگی کی تعریف کرتا ہے۔ اور بدوی یا صحرائی قوموں کا ہمدرد ہے۔ اس کی رائے میں بدوی اور حضری (شہری) دو قسم کی زندگی طبعی ہے۔ یعنی طبعی اسباب سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر بدویت۔ حضریت سے قدیم تر ہے۔ صحراہی سے تہذیب و تمدن کا آغاز ہوتا ہے۔ کیونکہ وہیں سے لوگ نکل نکل کر بستیوں اور شہروں کو آباد کرتے ہیں۔ بدوی لوگ شہریوں سے زیادہ بہادر اور نیکی سے نزدیک ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی مدافعت اور حفاظت کے خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں "شہری لوگ ناز ونعمت کے خوگر ہو کر عیش وعشرت میں ایسے مستغرق ہوتے

ہیں کہ وہ اپنے جان و مال کی حفاظت اور نگہبانی کو حاکم وقت اور فوج محافظ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور خود شہر کی فصیل یا قلعہ کے اندر مامون و مصئون ہو کر ہر قسم کے خطرہ سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اور بدن سے ہتھیار اُتار دیتے ہیں۔ اور جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے۔ ان میں بزدلی بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے برعکس چونکہ بدوی لوگ شہروں اور بستیوں سے دور میدانوں اور ویرانوں میں رہتے ہیں۔ جہاں نہ کوئی ان کا محافظ و مددگار ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں قلعہ و فصیل کی حفاظت میسّر آتی ہے۔ اس لئے وہ خود ہی اپنی مدافعت کرتے ہیں اور اپنے سوائے کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ہمیشہ مسلح اور چوکنے رہتے ہیں۔ کبھی غافل نہیں ہوتے۔ اور ناگہانی خطرات کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ غرض اس طریق پر بہادری اور شجاعت ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے +

اہل بدو کی سادہ اور آزاد زندگی کی تعریف میں ابن خلدون جس قدر رطب اللسان ہے اس سے صاف ثابت ہے کہ وہ شجاعت، آزادی اور خودمختاری کا بے حد متوالہ اور دلدادہ تھا۔ بلکہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ کسی قوم کو جائز حکومت کے سامنے بھی یونہی سر تسلیم خم نہیں کر دینا چاہئے اور بآسانی باجگذار نہیں بن جانا چاہئے۔ کیونکہ محکومی جرأت کو سلب اور قوت مدافعت کو کمزور کر دیتی ہے۔ اسی لئے نیم وحشی قومیں دوسری قوموں کی نسبت فتح و ظفر اور ممالک پر غلبہ حاصل کرنے کی زیادہ اہل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو چالیس برس تک تیہ میں سرگرداں رکھا تاکہ ان کی آنے والی نسل آزادی کی خوگر اور ارض موعودہ کی فتح کے قابل ہو جائے +

سلطنتوں کا عروج و زوال

ابن خلدون کو سلطنتوں کے نشوونما اور ارتقا کا کامل تصور تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "سلطنتوں کی بھی مثل اشخاص کے طبعی عمریں ہوتی ہیں۔ ان کی مثل وہ بڑھتی ہیں۔ پختگی کو پہنچتی ہیں اور پھر معرض زوال میں آجاتی ہیں۔ مگر اس نے ایک سلطنت کی مدت زندگی کو تین نسلوں کی مدت عمر یعنی قریباً ایک سو بیس برس قرار دیا ہے۔ مگر یہ مدت بہت قلیل ہے۔ کیونکہ ابن خلدون نے شرافت نسب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ ایک خاندان کی شرافت چار پشتوں میں کمال عروج کو پہنچتی ہے۔ لہٰذا اس کی رائے میں خاندان سلطنت کی نسبت زیادہ پائدار ہے +

جب بدوی یا صحرائی لوگ کوئی نئی سلطنت قایم کرتے ہیں۔ تو وہ آہستہ آہستہ حضری یعنی شہری زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ہر بات میں مفتوحہ ملک قوم کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ فتوحات عرب کے بعد یہی کچھ ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب عرب بدویوں کے سامنے چپاتیاں لائی گئیں تو انہوں نے ان کو چمڑا سمجھ کیا۔ اور جب کسریٰ کے خزانہ میں انہیں کافور ملا۔ تو انہوں نے اس کو نمک سمجھ کر آٹے میں استعمال کیا۔ اسی طرح اور کئی مثالیں ہیں۔ مگر جب انہوں نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو اپنا خدمت گذار بنایا۔ اور انہیں گھر کے کام کاج میں استعمال کرنے لگے اور ماہر فن اور ہوشیار آدمیوں کو ان کاموں کے لئے انتخاب کیا۔ تو ان لوگوں نے انتظام خانہ داری کے تمام طریقے انہیں سکھائے +

گرانبار نعمت کی افزونی اور اسباب عیش و عشرت کی فراوانی سے فاتحین کی قوت بتدریج ضائع ہو جاتی ہے۔ شہروں میں ان کی جدید طرز معاشرت ان کے قویٰ کو کمزور کر دیتی ہے۔ کیونکہ شہری زندگی کا سب سے نمایاں خاصہ یہ ہے کہ انسان انواع و اقسام کے عیش و عشرت کا دلدادہ بن جاتا ہے اور اپنی توجہ تمام تر خوراک و پوشاک۔ ظروف۔ فروش۔ محلات و عمارات اور دیگر اسباب خانگی کی آراستگی میں صرف کرتا ہے۔ اُن میں سے ہر چیز کو عمدہ اور پُرتکلف بنانے کے لئے مختلف صنعتیں مخصوص ہو جاتی ہیں۔ اور پھر جُوں جُوں انسانی نفوس ناز و نعمت کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ ان صنعتوں میں بھی کثرت و بوقلمونی پیدا ہوتی جاتی ہے +

جب کوئی سلطنت فرسودہ اور کمزور ہو جاتی ہے تو ایک اور سلطنت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے صوبجات کے والی اور حاکم سرکشی اختیار کر کے مستقل حکومتیں قائم کر لیتے ہیں۔ اور یا کسی بیرونی حملہ کی وجہ سے سلطنت بدل جاتی ہے اس دوسری صورت میں کوئی ہمسایہ طاقتور بادشاہ کسی خاص سیاسی یا مذہبی اصول کی حمایت کے بہانہ سے اپنی قوم کو جمع کرتا ہے اور حملہ بول دیتا ہے +

آغاز تمدن میں شہروں سے پہلے سلطنتیں قایم ہوتی ہیں۔ کیونکہ کسی شہر کے آباد ہونے کے لئے بہت سے آدمیوں کی شرکت کار اور ایک معاشرتی نظام کا ہونا ضروری ہے۔ ابن خلدون شہروں۔ دنیا کی مشہور عمارتوں صنائع و حروف اور تجارت کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ مختلف صنعتوں کی ترقی آبادی پر موقوف ہے۔ وہ صنعتیں جن کو زندگی کی عام ضروریات پیدا کرتی ہیں۔ صرف شہروں ہی میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ درزی۔ نوبار اور بُرہئی وغیرہ ہر بستی میں ملتے ہیں۔ مگر وہ پیشہ ور جن کی صرف پُرتکلف تمدن اور عیش و

تنعم ہی میں ضرورت پڑتی ہے۔ صرف بڑے بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شیشہ گر۔ زرگر۔ عطر فروش۔ باورچی۔ ظروف فروش۔ فراش۔ قصاب وغیرہم۔ جوں جوں شہریوں کے مزاج میں نفاست آتی ہے اور اسباب عیش کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ نئی نئی صنعتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ حمام بھی اسی باب میں شامل ہیں کیونکہ وہ صرف آباد اور معمور شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں امیر لوگوں کو ان کی ضرورت ہوتی ہے +

علوم وفنون کی تاریخ

ابن خلدون مختلف علوم وفنون پر بھی بحث کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہم یہاں ان مباحث کا بالتفصیل ذکر نہیں کر سکتے۔ وہ ان علوم کے موضوعات یا اصول سے بحث نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ہر علم وفن کے متعلق اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں عمیق ملاحظات اور خیالات وافکار پیش کرتا ہے۔ مثلاً وہ ہر علم کے متعلق علاوہ دیگر باتوں کے یہ بتاتا ہے کہ اس کا موضوع اور فائدہ کیا ہے۔ وہ کس حد تک صحیح اور درست ہے۔ وہ کن مدارج ترقی سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچا۔ ان تمام باتوں کی عمدہ مثالوں کے ساتھ تائید کی گئی ہے۔ اس دوران میں وہ بہت سے مصنفوں اور کتابوں کا ذکر کرتا ہے۔ جو اس زمانہ میں مقبول تھیں۔ اس قسم کے اشارات بذاتہ بڑے دلچسپ اور مفید ہیں +

ابن خلدون نے ہر علم وفن کی تاریخ۔ اس کے وضع ہونے کے اسباب۔ اس کی عہد بعہد ترقیوں کے متعلق جو تحقیقات کی ہیں۔ ان کی بدولت افریقہ کا یہ چودھویں صدی کا مصنف۔ موجودہ یورپ کے بہترین علما کے دوش بدوش نظر آتا ہے +

شیخ عنایت اللہ ایم اے

تمنّا

میری زندگی تمناؤں سے بھری ہے۔ لیکن ایک بھی تمنا پوری نہیں ہوتی۔ وہ ایک سمندر ہے جس میں تمناؤں کی بے اختیار موجیں پیدا ہوتیں اور کنارے سے سر ٹکرا ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں +

حیف اُس حرماں نصیب مسافر پر جو لق ودق صحرا میں سراب کی خوشنما اور زندگی بخش موجوں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اپنی زندگی تمام کرتا ہے۔ میرا حرمان زدہ دل بھی تمنا کی سرابی لہروں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر فنا ہو جائے گا +

جس طرح تپتے ہوئے ریگستان میں پانی کی چار بوندیں گرتے ہی فنا ہو جاتی ہیں اور ریگ کے ہر ذرہ کی تشنگی اور تپش کو زیادہ کر دیتی ہیں۔ اسی طرح میری زندگی کے تپتے ہوئے میدان میں مسرت کی چار بوندیں میری تمناؤں کو حسرت سے بدل دیتی ہیں +

محمد عبدالرؤف۔ بی۔ اے

حقیقت کی ایک جھلک

(از مولانا نواب علی صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر بڑودہ کالج)

قلم کے تین حرف ق ل م کو اُس شے سے جس سے لکھتے ہیں کسی قسم کی مشابہت ہے نہ مناسبت۔ لیکن جب یہ لفظ لکھا جاتا ہے تو پڑھنے والے کا ذہن اُسی شے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ کائنات بھی اسی طرح ایک قلم ابجد ہے جسے حکیم العلیم نے معانی اور اسرار کے خزانوں پر لگا دیا ہے۔ یہ قلم اُن قدسی نفوس کے لئے کھلتا ہے جو باطن کی روشنی میں دل کی زبان سے ان نقاشی نقوش کو پڑھتے ہیں۔ لیکن جس طرح ایک کج بحث جاہل کو یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ ق ل م سے مراد آلۂ تحریر ہے۔ اسی طرح ظاہر بیں منکر روحانیت کو یہ یقین دلانا سخت دشوار ہے کہ مظاہر کائنات کے پردہ میں "کلمات الٰہی" کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جس کے دیکھنے کے لئے دیدۂ باطن چاہئے۔ اور جس کے یقین کے لئے قلب سلیم درکار ہے +

واقعات اور حادثات عالم کا تماشا یوں تو سبھی دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن صرف چند ایسے نفوس تھے جن پر کسی خاص وقت میں ایسی کیفیت طاری ہوئی ہے کہ وہ نوع انسان کو ترقی کی شاہراہ پر لائی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں نے سیب کا درخت سے گرنا دیکھا ہوگا۔ لیکن یہ نیوٹن کا دماغ تھا کہ اُس نے اس معمولی واقعہ سے کشش کا ہمہ گیر قانون معلوم کر لیا۔ ہزاروں اشخاص نے بوڑھوں کو اور مُردوں کو دیکھا ہوگا۔ لیکن یہ گوتم کے دیدۂ عبرت بیں تھے جو ان دردناک مناظر سے متاثر ہو گئے اور نروان کا فلسفیانہ سکون تعلیم دیا۔ تاروں کا نکلنا چاند کا چمکنا اور پھر صبح کو آفتاب عالمتاب کا روشن ہونا کس نے نہیں دیکھا۔ لیکن یہ ابراہیم کی نگاہ دور بین تھی جس نے اجرام سماوی کے پردے میں ایک لازوال ہستی کی جھلک دیکھی پھر لا احب الافلین کا نعرہ مار کر توحید کی سچی تعلیم دی سائنس۔ فلسفہ اور مذہب کے یہ واقعات کیا معنی خیز نہیں ہیں؟

نوع انسان کی روحانی ترقی ان برگزیدہ ہستیوں کی رہین منت ہے جن کے متعلق سخت سے سخت منکر بھی بشرطیکہ اُسکا دماغ صحیح ہوا سقدر تو ضرور تسلیم کریگا کہ ان میں کوئی خاص بات ضرور تھی جس نے انہیں خلق خدا کی ہدایت کے بلند مرتبہ پر پہنچا دیا۔ ساڑھے تین ہزار سال کا عرصہ گذرا جب منکبر فرعون کے محل میں پرورش پایا ہوا ایک نوجوان مصر سے نکل کر پہاڑ پر ایک نورانی نظارہ دیکھتا ہے۔ اور ایک غیبی آواز سُنتا ہے کہ جا اپنی قوم کو نجات دلا۔ وہ واپس آتا ہے۔ اور تنہا دشمنوں پر غالب آکر اپنی قوم کو نجات دلاتا ہے اور اُنہیں دینی و دنیوی ترقی کے راستے پر لگاتا ہے۔ دو ہزار سال ہوئے جب ناصرہ کے ایک غریب یہودیہ کے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ جو جوان ہو کر ایک آواز سنتا ہے کہ اے میرے محبوب فرزند اسرائیلی گلوں کی حفاظت کر اور آسمانی بادشاہت کی خوشخبری سُنا۔ وہ اس خدمت کے لئے ناخواندہ اسرائیلیوں میں آتا ہے اور اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ قیصر اس کا حلقہ بگوش غلام ہو جاتا ہے اور لاکھوں نفوس اس کے نام پر جان دینے کو حاضر ہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس کا زمانہ گذرتا ہے جب مکہ کا ایک یتیم اُمّی چالیس سال کی عمر میں ایک غار میں محو عبادت ہے ایک ربانی کرشمہ دیکھتا ہے اور یہ بے آواز صدا سُنتا ہے کہ عالم کی ہدایت کے لئے اُٹھ۔ وہ اُٹھتا ہے اور اس شان سے اُٹھتا ہے کہ تیئیس ۲۳ سال کے اندر ایک دین کامل کی تلقین کرتا ہے۔ جو سارے عالم کے لئے رحمت ہے۔ کیا یہ تاریخی شہادتیں "آفتاب آمد دلیل آفتاب" نہیں ہیں؟

کوہ طور کا شعلۂ آتشیں۔ قدس کی پہاڑی کا کبوتر اور غار حرا میں شکل انسانی کا ایک نورانی پیکر غرضکہ یہ نظارے انہیں حقیقت بیں نگاہوں کے لئے تھے۔ جو اس لئے خلق ہوئے تھے اور جنہوں نے اس نظارہ کو دیکھ کر اپنا فرض ادا کر دیا +

وہ یگانۂ یکتا جو جسم و جسمانیت سے منزہ اور فہم و ادراک سے ارفع و اعلیٰ ہے اُسکا کلام حرف و آواز سے منزہ ہے۔ وہ صرف قلب صافی پر نقش ہوتا ہے۔ دیدۂ دل اُس کو پڑھتا ہے اور گوش باطن اُس کو سنتا ہے +

نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین (سورۃ الشعراء)

نواب علی۔ ایم اے

صحت عامّہ کے اقتصادی اثرات

(از جناب ریاض حسین صاحب بی۔ اے)

جنگ عالمگیر نے دُنیا کے اندر بے اندازہ تباہی اور ہولناک بربادی پھیلادی تھی۔ زرگاہ کے قرب وجوار میں جس قدر بستیاں اور شہر واقع تھے۔ ان کو بُری طرح تہ و بالا کر دیا تھا۔ اسی طرح تجارتی کاروبار اور صنعت و حرفت کو نقصان عظیم پہنچا تھا۔ اور ہلاکت و بربادی کے اس مُہیب دیو کے ساتھ خوفناک معرکہ آرائی کے بعد اگرچہ انسانیت ظفر و منصور ہو کر نکلی۔ لیکن لوگوں کی اخلاقی اور جسمانی حالت میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کو صرف ردِّ عمل کی قوت ہی اصلی حالت پر لا سکتی تھی +

ایسے انقلاب آفریں حادثہ کے بعد تہذیب و تمدّن میں ایک قسم کا احیا ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ آنے والی تہذیب اپنا سایہ پہلے ہی ڈال رہی تھی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ سیاسی ہو خواہ اقتصادی۔ حیات نو کا اثر نمایاں تھا۔ اور ایک بات سب میں مشترک تھی۔ کہ خواہ یہ احیا زندگی کے کسی شعبہ میں کارفرما ہو۔ اس کا واحد مقصد بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود تھا۔ اب انسانی فلاح و بہبود کا کوئی پہلو لیں۔ آپ دیکھیں گے۔ کہ جسمانی صحت و تندرستی کا اس سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے صدہا کوششیں ہوتی رہی اور ہو رہی ہیں۔ لیکن اس موضوع کا اقتصادی پہلو ابھی تک نشنہ رہا ہے۔ یعنے صحت کا انسان کی اقتصادی حالت کے ساتھ جو گہرا تعلق ہے۔ اس پر کافی توجہ نہیں دی گئی +

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے بہترین مثال افریقہ کے بعض ممالک سے دی جا سکتی ہے۔ ابتدا میں فرنگیوں کے لئے وہاں اقامت پذیر ہونا سخت مشکل نظر آتا تھا۔ کیونکہ وہاں قسم قسم کی بیماریاں تھیں۔ ملیریا تھا۔ بدخوابی تھی۔ اور مہیبوں خوفناک آلام پائے جاتے تھے جن کو دیکھ کر اہلِ یورپ نے اس سرزمین کو "فرنگی کی قبر" کا نام دے رکھا تھا اس وقت ان کو وہاں مقیم ہونے اور فارغ البال زندگی بسر کرنے کا خواب و خیال تک نہ تھا۔ مگر اب اسی سرزمین میں جہاں یہ بیماریاں پہلے ہزاروں لوگوں کو موت کی نیند سُلاتی تھیں۔ اب بہت حد تک کم ہو گئی ہیں۔ کیونکہ

ایک مثال

بعض لوگوں نے بطور خود ان بیماریوں کا قلع قمع کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں بعض حکومتوں نے تحقیقات کے لئے مہمات بھیجیں۔ جنہوں نے وہاں پہنچ کر مچھروں اور دوسرے زہریلے جراثیم کو تباہ کرنے کے ذرائع سوچے ان پر عمل درآمد کیا۔ نتیجہ کیا نکلا۔ کہ بیماریاں دور ہو گئیں۔ اموات کی اوسط بہت گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی تجارتی خوشحالی میں ترقی ہو گئی۔ اور اب وہی "فرنگی کی قبر" فرنگی کی بہشت بن رہی ہے +

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ خوشحالی کا دارومدار جسمانی صحت پر ہے۔ اور تندرستی کے اثرات انفرادی ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ اجتماعی بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایک شخص کی تندرستی اور صحت پر بہت سے لوگوں کی خوشی اور فارغ البالی کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر خاندان کو حکومت کا سررشتہ فرض کریں۔ تو خاندان کے افراد اس کے اعضا ہوں گے۔ اب جسم کی بہبودی اور ثبات کے لئے لازم ہے کہ فرد واحد کی صحت و تندرستی برقرار رہے کسی قوم کی قوت کا دارومدار اُس قوم کے افراد کی طاقت پر منحصر ہوتا ہے۔ اور اسی لئے انفرادی اور اجتماعی خوشحالی میں ایک گہرا تعلق ہے +

جنگ فرنگ جہاں ہمارے لئے کئی لحاظ سے سبق آموز ثابت ہوا ہے اس سے ایک سبق ہم کو یہ بھی ملتا ہے۔ کہ عوام کی صحتِ جسمانی کو برقرار رکھنا حکومت کا فرض ہے۔ اور اس کے دوران میں یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ قریباً ہر ملک میں ایک کثیر تعداد ایسے افراد کی بھی موجود تھی۔ جو جسمانی نقائص کے باعث میدانِ جنگ میں شریک ہونے سے معذور تھے۔ اور جو وطن میں رہ کر بھی پوری پوری خدمات بجا لانے کے ناقابل تھے۔ جنگ وجدال کا ایک ناخوشگوار نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے۔ کہ طاقتور اور مضبوط افراد میدانِ جنگ میں لڑائی کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ اور وہاں وہ داد شجاعت دیتے موت سے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ اور ملک میں کمزور اور جسمانی لحاظ سے ناقابل لوگوں کی تعداد آبادی کی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔ ان لوگوں کی توقعاتِ زندگی معیار سے پست ہوتی ہیں۔ اگر وہ شادی کرتے ہیں۔ تو نہ صرف ان کی اولاد

نحیف و کمزور ہوتی ہے۔ بلکہ وہ خود بھی یا تو قبل از عمر طبعی مرجاتے ہیں۔ یا ایسے وقت بوڑھے اور معاش پیدا کرنے کے ناقابل ہوجاتے ہیں جب کہ خاندان کو قوت لایموت کے لئے اُن کے دست و بازو کی انتہائی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کہ خاندان میں غربت و افلاس کا دور دورہ ہوجاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ہم انفرادی بہبودی کو اجتماعی خوشحالی سے علیحدہ نہیں کرسکتے +

اب ہمیں قدرتاً ان امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگوں کے جسمانی انحطاط کا موجب ہوتے ہیں۔ اور یہ روزمرہ کے معمولات یا عادات زندگی ہوتے ہیں۔ ہم عادات زندگی کو پہلے لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ عادات ہی ہیں جو انسان کی قوت برداشت یا استقلال پر سب سے گہرا اثر ڈالتی ہیں بعض لوگ اپنے عضلات سے ہمیشہ ضرورت کے مطابق تھوڑا یا زیادہ کام لے سکتے ہیں۔ مگر بعض ایسے ہیں۔ جو روزانہ کام تو بخوبی کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی غیر معمولی طور پر مشکل کام کرنا پڑجائے۔ تو فوراً تھک جاتے ہیں +

اس کی مثال یوں ہے کہ جنگ فرنگ کے آغاز میں جب فوجی بھرتی کے لئے جسمانی صحت کا اعلیٰ معیار مدنظر رکھا جاتا تھا۔ یہ دیکھا گیا۔ کہ اکثر رنگروٹ قواعد وغیرہ کی مشقت کی تاب نہ لاسکے۔ اور ہمت چھوڑ بیٹھے۔ ایک موقعہ پر انکے افسر نے ان کو اس بنا پر علیحدہ کردیا۔ کہ ان کو دل کی بیماری ہے۔ اس واقعہ کو دیکھ کر ایک تحقیقاتی کمیٹی نے اس کے اسباب تلاش کئے۔ تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں سے ایک بھی تو ایسا نہ تھا۔ جو دل کی کسی بیماری میں مبتلا ہوتا۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی۔ کہ ان کے دل میں طاقت ہی اتنی تھی جتنی کہ ایک معمولی کاروباری آدمی کی ضروریات روزمرہ کے لئے کافی ہو۔ اور اسی سبب سے وہ پُر مشقت جسمانی کام کرنے کے ناقابل تھے۔ اس تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بجائے اس کے کہ ایک ہی وقت سب رنگروٹوں کو ایک ہی قسم کی قواعد کرائی جاتی۔ اب اُن کو دلی طاقت کے لحاظ سے درجوں میں تقسیم کیا گیا۔ اور ہر درجہ کے لئے اُس کے مطابق قواعد تجویز ہوئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض وہ نوجوان جو پہلے بالکل ناقابل نظر آتے تھے۔ اب اس تدریجی تربیت سے اسقدر بہتر بن گئے کہ آخری درجے سے ترقی پاکر اولین صف میں جا پہنچے +

اس مثال سے ظاہر ہے۔ کہ جسمانی صحت کو بہتر بنانے کے لئے اعصاب و عضلات کو ہمیشہ کام میں لگائے رکھنا ضروری ہے +

خوراک کے متعلق بھی کئی باتیں ہیں۔ جن پر صحت و تندرستی کے ضمن میں غور نہیں کیا جاتا۔ کوئی شخص بھی جو بلاخوری کا عادی ہو تندرست نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح یہ فرض کرنے میں بھی ہم غلطی کرتے ہیں۔ کہ تمام انسان مختلف قسم کی خوراک کو کھانے اور ہضم کرنے کے لحاظ سے ایک ہی سی جسمانی بناوٹ رکھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ اکثر لوگوں میں ہر قسم کی خوراک کو ہضم کرنے اور جزو بدن بنانے کی معمولی سی قابلیت ہوتی ہے۔ لیکن ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جو اس ضمن میں نہیں آسکتے۔ ان میں سے بعض کو حیواناتی خوراک کی یا تو ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم۔ اور دوسرے ایسے ہوتے ہیں۔ کہ نباتاتی خوراک کو ہضم کرنے اور جزو بدن بنانے میں انکی قابلیت محدود ہوتی ہے۔ یہ اختلاف طبائع دراصل اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر انسان دو اجداد سے پیدا ہوا ہے۔ جن میں سے ایک تو نباتات پر گذارہ کرتی ہے اور دوسری گوشت پر۔ پس کامل انسان تو ہر دو قسم کی غذا کو ہضم کرنے اور جزو بدن بنانے کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن عوام میں بعض کی طبیعت نباتات کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے اور بعض کی گوشت کی طرف۔ اگر اس طبعی رجحان کے خلاف عمل کیا جائے۔ تو وہ غذا جزو بدن نہ بنیگی۔ اور آدمی بیمار ہوجائیگا +

جہاں کہیں لوگ اس طبعی رجحان کو پس پشت ڈال کر دوسری قسم کی غذا کھاتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ناموزوں اور انمل مرکبات کی بدولت ان کی صحت و تندرستی میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔ گٹھیا اور ذیابیطس کی بعض قسمیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ صرف اس لئے کہ بعض لوگ ایسی معمولی مگر مرکب غذائیں استعمال کرتے رہتے ہیں جن کو ہضم کرنے یا جزو بدن بنانے کے لئے ان کے اعضائے معدہ قابل نہیں ہوتے۔ اسی لئے آئندہ لوگوں کی صحت کو برقرار رکھنے اور بیماری کے خطرات سے بچانے کے لئے لازمی ہوگا۔ کہ ہر شخص کی قوت ہاضمہ اور غذا کو جزو بدن بنانے کی قابلیت کی تحقیقات کی جائے۔ تاکہ وہ اس قابلیت کے مطابق اپنی غذا کی فہرست مرتب کیا کرے +

محولہ بالا سطور سے ظاہر ہوگیا ہوگا۔ کہ صحت و تندرستی کا فقدان کئی اسباب کا نتیجہ ہوا کرتا ہے بعض کیمیاوی ہوتے ہیں۔ اور بعض ماحول کے اثرات کا نتیجہ۔ ہر انسان کا فرض ہے۔ کہ وہ سوسائٹی کا رکن ہونے کی حیثیت سے ان اسباب کے دفعیہ و انسداد کی ہر ممکن کوشش کرے۔ اور اُسے یہ معلوم ہونا چاہئے۔ کہ ان باتوں کا علم لوگوں کے اندر اپنے جسم اور تندرستی کے متعلق ذمہ داری کا احساس زیادہ کردیگا +

ذمہ داری کے سوال کے ساتھ ہی ایک خاص قسم کے امراض کا ذکر کرنا ضروری

معلوم ہوتا ہے۔ اب تک ہم نے تندرستی پر اسی حد تک بحث کی ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق جسمانی نشو و نما۔ غذا اور عادات زندگی کے ساتھ ہے۔ ان امور میں احساس ذمہ داری سے کیا مراد ہے۔ یہ کہ جسم کی ساخت کا علم ہو۔ اور اس علم کے مطابق اصول زندگی بنائے جائیں۔ اور ان پر عمل پیرا ہیں لیکن وہ امراض جن کا ہم ذکر کریں گے۔ اس سے زیادہ ذمہ داری کے مقتضی ہیں۔ نہ صرف ذاتی تندرستی کے خیال سے بلکہ تمام قوم کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے۔ میری مراد متعدی امراض مخصوصہ سے ہے۔ کیونکہ ان امراض کو پھیلانے کی ذمہ داری انہی کے سر ہوتی ہے۔ جو ان کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں +

کوئی آدمی انفرادی یا اجتماعی صحت و تندرستی کا ذکر کامل طور پر کر نہیں سکتا جب تک ان امراض کو خاص طور پر معرض بیان میں نہ لائے۔ کیونکہ یہی متعدی امراض کسی قوم کی عام تندرستی پر نہایت خوفناک اور تباہ کن اثرات ڈالتی ہیں +

متعدی امراض مخصوصہ میں اس قبیل کی دیگر بیماریوں کی نسبت کثیر التعداد اموات اور بہت زیادہ رنج و آلام کا باعث ہوتی ہے۔ یہ مرض بھی جراثیم کی اسی نوع سے پیدا ہوتا ہے۔ جو ملیریا یا ہیضہ کی بیماری اور گرم ملکوں کی دیگر بیماریوں کا موجب ہوتی ہے۔ ان بیماریوں کے جراثیم ایک شخص سے دوسرے شخص تک یا ایک مریض حیوان سے کسی انسان تک بیماری لے جاتے ہیں۔ مثلاً مچھر ملیریا کے اور اسی طرح مکھی بے خوابی کے جراثیم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ اور اس شخص پر جس کو یہ بیماریاں لگ جائیں۔ فقط اسقدر ذمہ داری عاید کی جا سکتی ہے۔ کہ اس نے ان مرض پھیلانے والے کیڑوں کے ڈنک سے اپنے بدن کو پوری طرح محفوظ نہیں رکھا ہوگا۔ مگر متعدی امراض مخصوصہ میں معاملہ بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ اس میں کلی ذمہ داری ابتدائی مریضوں پر عاید ہوتی ہے۔ اور یہ ذمہ داری یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ مرض براہ راست یا دانستہ ایک سے دوسرے میں منتقل کیا جا سکتا ہے +

اس مرض کا ہر وہ مریض جس نے علاج نہ کرایا ہو۔ یا جس کا علاج نیم حکیموں نے کیا ہو۔ عموماً ایک مرکز سا بن جاتا ہے۔ جس سے یہ لعنت خیز مرض گرد و نواح میں پھیلتا رہتا ہے۔ ابتدائی حالت میں یہ مرض اس قدر مضر نہیں ہوتا۔ جس قدر کہ آخری مدارج میں۔ یہ امراض آہستہ آہستہ یا تو مریض کو عمر بھر کے لئے مریض کو بیکار کر دیتے ہیں۔ یا اس کا خاتمہ کر ڈالتے ہیں +

ایک اور پہلو سے بھی اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ دنیا بھر کے پاگل خانوں میں داخل ہونے والے بدنصیب لوگوں میں سے ایک بہت بڑی تعداد ایسے مریضوں کی ہوتی ہے۔ جو براہ راست ایسی ناپاک امراض کی وجہ سے عقل ہی کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اور حکومتوں کو کروڑوں پونڈ سالانہ ان پر خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ محض انگلستان کو اس مرض سے مفلوج مریضوں پر تین لاکھ پونڈ سالانہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ صحت و تندرستی کو برقرار رکھنے میں اس مرض سے مقابلہ کرنے کا مسئلہ اقتصادی پہلو سے کس قدر اہم و ضروری ہے +

جنگ عالمگیر سے پہلے ہی ہر ملک میں کم و بیش اس قسم کے مرض پائے جاتے تھے۔ لیکن جنگ کے دوران میں اور جنگ کے بعد تو ان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ فوج میں بھرتی کے لئے نوجوان نہ صرف شہروں اور قصبوں سے بلکہ دیہات اور مواضع سے بھی حاصل کئے گئے تھے۔ اور نہ صرف جنگ کے لئے بلکہ لوازمات کے مہیا کرنے کے سلسلہ میں زن و مرد ہر ملک کے طول و عرض سے اکٹھے کئے گئے تھے۔ ان کے اس طرح ملنے جلنے سے بکثرت نئے مریض پیدا ہو گئے۔ اور جنگ کے ختم ہونے پر جب فوجوں کا بہت سا حصہ ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ تو ان لوگوں کا واپس اپنے اپنے علاقوں میں چلے جانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ ان متعدی امراض کے جراثیم اپنے ہمراہ لے گئے۔ آنے والی نسلوں کے لئے اس زہر کا بیج بویا۔ اور وہ معصوم ہستیاں جو ابھی عدم سے دنیا میں آ رہی ہیں۔ والدین کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتیں گی۔ اس خوفناک صورت حالات کو روکنے کے لئے حکومت کا فرض ہے۔ کہ ہر ممکن اور قابل عمل ذریعہ اختیار کرے۔ چونکہ یہ افسوسناک حالت لوگوں کی اخلاقی پستی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے تعلیم کی نشر و اشاعت کے ذریعہ اخلاق عامہ میں اصلاح و درستی پیدا کی جائے +

اگر خاندان کو فرد واحد خیال کیا جائے۔ تو بچے اس کے اعضاء و جوارح ہوں گے۔ نیز اصلاح و تہذیب کے متعلق کوئی تجویز ہو۔ اگر اس کا مقصد و مدعا انسانی فلاح و بہبودی ہے۔ تو سب سے پہلے اصلاح کا کام بچوں سے شروع کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان لوگوں کی اصلاح کی بہت کم امید ہے۔ جن کے اندر بیماری راسخ ہو چکی ہو +

ہماری غرض و غایت ایک اضمحلالی لائحہ عمل ہے۔ یعنی ہم کو ایسی تدابیر پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ جو مریض کو صحت دینے سے کہیں زیادہ تندرستوں کو مرض سے بچانے والی ہوں۔ اور بچوں کی اخلاقی و جسمانی صحت کا مسئلہ تو سوسائٹی میں

متعدی امراض

اجتماعی تدابیر اختیار کرنے سے حل ہو سکتا ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ بچوں کو پاکیزہ اصولوں کے مطابق تربیت دی جائے۔ اور اُن کی نشوونما ایسے ماحول میں ہو کہ جو نہ صرف اُن کی زندگی میں اُن کی اخلاقی و جسمانی صحت و تندرستی کفیل ہو۔ بلکہ ان کی اولاد کو بھی جسمانی۔ روحانی اور دماغی ہر قسم کی صحیح نشوونما بخشے ✦

ایک نوعمر ہستی کا دماغ خاص طور پر انفعال پذیر ہوتا ہے۔ اور جو اچھے یا برے نقوش اس پر ثبت کر دیئے جائیں۔ پھر زندگی بھر نہیں مٹتے۔ یہانتک کہ ابتدائی تعلیم و تربیت (اور اس سے مدرسہ کی تعلیم مراد نہیں) ہی وہ چیز ہے۔ جو ایک انسان کے افعال کو عادات و اطوار اور چال چلن کے سانچے میں ڈھالتی ہے

علم کا تصور اگر کیا جا سکتا ہے۔ تو زندگی اور لوازمات زندگی کے سلسلہ میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے علم الابدان کی کئی ضروری باتیں ایسی ہیں۔ جن کا خیال تعلیم دیتے وقت ہمارے خاص طور پر فکر کا محتاج ہوتا ہے۔ علم یا جہالت کسی ترازو میں نہیں تولے جا سکتے۔ لیکن ان میں یہ خصوصیت ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے سے اضافی تعین رکھتے ہیں۔ یعنے جہالت میں جس قدر کمی ہوتی جائیگی۔ علم میں اُسی قدر بیشی ہوگی۔ یا جب کوئی شخص کوئی نئی بات سیکھتا ہے تو اس خاص بات میں اس کی جہالت دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ علم لے لیتا ہے۔ پس جس طرح علم کا تعلق زندگی کے ساتھ ہے۔ ویسے ہی جہالت بھی اس سے وابستہ ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے۔ کہ پیدائش کے وقت بچہ تقطعاً بے علم ہوتا ہے۔ ہاں قدرے ذہانت رکھتا ہے۔ اور اپنے تمام کام جبلی طور پر سرانجام دیتا ہے۔ بتدریج اس کے دماغی قویٰ حواس خمسہ کے ذریعہ کچھ علم حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے۔ اس کی نشوونما اور اس کے علم میں بلند رتناسب اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انجام کار جب لڑکپن کا زمانہ آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ عالی قوتوں کی نشوونما ہونے لگتی ہے۔ وہ ہر حس کے ذریعہ سے تعلیم کے نہ مٹنے والے نقوش تیزی سے اخذ کرنے لگتا ہے۔ علم و جہالت کے باہمی تعلق اور بچے کے بذریعہ حواس تعلیم حاصل کرنے کی تمام بحث کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ بچے کے چال چلن اور عادات و اطوار پر ماحول کا نہایت گہرا اثر پڑتا ہے اور یہ اثر نہ صرف جسم پر ہوتا ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر دماغ اور اخلاق پر ہوتا ہے ✦

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ کہ بچے کے مستقبل پر اس کے والدین کے چال چلن کا اثر سعد رخوی نہیں ہوتا۔ جتنا کہ ماحول کا ہوتا ہے۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ ایسے احوال کا جو لوگوں کی فلاح و بہبود کو خطرہ میں ڈالنے والا ہو۔ انسداد کریں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ہی ہم اس اخلاقی ابتری کو روک سکتے ہیں۔ جو بیماری شراب خواری اور ارتکاب جرم پر انسان کو آمادہ کیا کرتی ہے۔ اور نسلاً بعد نسلٍ ان لوگوں میں جو مذموم ماحول میں تربیت پاتے ہیں۔ اپنا اثر پھیلاتی رہتی ہے ✦

یہ ماحول کے اثر سے ہی ہو سکتا ہے۔ کہ ہم بدی اور اس کے المناک نتائج و عواقب کو ان لوگوں میں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ پھیلنے سے روک سکتے ہیں۔ اور جب تک ہم بچوں کو مذموم اور زہریلے گرد و نواح سے محفوظ رکھیں اور ایسے حالات میں نہ رکھیں۔ جو ان کی صحیح تربیت کے مؤید ہوں۔ تو ہماری تمام کوششیں رائگاں جائینگی ✦

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی تربیت کی بنیاد اس اخلاقی و روحانی ذمہ داری پر ہونی چاہئے۔ کہ وہ گھر میں اور عزیز و اقارب کے ساتھ پاکبازی کے اعلیٰ معیار کو ہمیشہ مدنظر رکھینگے۔ اور یہ بھی ضروری ہے۔ کہ لڑکے اور لڑکیاں جب میدان زندگی میں قدم رکھیں۔ تو وہ زندگی کے ان مراحل میں جہاں اخلاق کی پامالیاں برائے نام ہوتی ہیں۔ اور ہوس پرستی کا دیو شرم و حیا کے پردے چاک کر دیتا ہے۔ داخل ہونے سے قبل ان خطروں کو اچھی طرح سمجھ لیں جو بداخلاقی سے خود ان کے لئے اور دوسرے لوگوں کی صحت و تندرستی کے لئے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے امراض کے خوفناک نتائج سے نوجوان محض ناواقف ہوتے ہیں۔ اور یہ قطعاً مناسب نہیں۔ کہ کوئی نوجوان آزمائش میں پڑ جائے۔ اور اسے قبل از وقت متنبہ نہ کر دیا جائے۔ کہ اگر تم نے نیکی سے اعراض کیا۔ اور بدی کے مرتکب ہوئے۔ تو یاد رکھو۔ تمہاری زندگی دردناک دکھوں اور دماغی مصیبتوں سے بھر جائیگی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ بچے کو اس قسم کی تعلیم دینا ناممکن ہوگا۔ کیونکہ وہ اس قابل نہیں ہوتا۔ کہ بدکاری اور بیماری کے باہمی تعلق کو سمجھ سکے ✦

بدقسمتی سے یہ دیکھا گیا ہے۔ کہ اس قسم کی تعلیم دینے سے لڑکے میں ایک خاص قسم کی نوعیت جاگ اُٹھتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ غلط اور فاسد خیالات نوعمر لڑکوں کے دلوں میں پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کی توجہ نامناسب طور پر جسم کے آن اعضا کی جانب مبذول ہونے لگتی ہے۔ جن کی طرف سے ان کو بالکل ایسا ہی بے خبر ہونا چاہئے تھا۔ گویا وہ کالعدم ہیں ✦

یہ قبل از وقت اشتعال لڑکے کی طبیعت کو بُری باتوں کی طرف مائل

کر دیتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ اسقدر کمزور ہو جاتی ہے۔ کہ وہ بدی کی خواہش کو ضبط نہیں کر سکتا۔ اور آخر کار ایسی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ بیماری ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ اشد ضروری ہے۔ کہ لڑکے کے والدین اس کی اخلاقی حالت۔ اس کے یار دوستوں کے چال چلن۔ گھر کی اندرونی زندگی اور تمام دوسرے امور کی جہاں سے اس قسم کی خرابی کا اندیشہ ہو سکتا ہے پوری پوری نگرانی کریں ✣

بچوں کے اردگرد کی فضا پاکیزہ اور دلچسپ ہونی چاہئے۔ ان کے خیالات دل پسند اور فاضل تعلیم یافتہ باتوں کی جانب منعطف کئے جائیں۔ ان کے دلوں کو ایسی تمام باتوں کا خیال کرنے سے باز رکھا جائے۔ جو جنسی تمیز یا ظاہب زن وشو کے ساتھ تعلق رکھتی ہوں۔ بچوں کو اچھی طرح سے سمجھا دیا جائے کہ پاکبازی اور عصمت کی حدود کو توڑنا اپنے آپ کو سخت خطروں میں ڈالنے کے مترادف ہے ✣

خاتمۂ سخن پر میں چند الفاظ کام اور آرام کے باہمی تعلق کی نسبت بھی کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آرام ان قوتوں کو جو کام کرتے کرتے مضمحل ہو جائیں۔ از سر نو پیدا کرنے یا انہیں تازگی دینے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کو تعطل یا فرصت یا بیکاری کے ساتھ خلط ملط کرنا غلطی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ بعض کام کرنے والوں کو معلوم ہی نہیں کہ فرصت کسے کہتے ہیں۔ ان کے مزاج ایسے ہوتے ہیں۔ کہ جب ایک ہی کام کرتے کرتے اُکتا جائیں۔ تو اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ جاتے ہیں۔ اور انہیں یہ تبدیلی ہی آرام پہنچا دیتی ہے۔ اکثر لوگ جو آج اپنی زندگی امن چین سے گذار رہے ہیں۔ اکثر حصول معاش کی خاطر جو کام روزمرہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دماغی اور جسمانی نظریح پر بھی قوت اور وقت صرف کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو صحت و تندرستی کو نقصان پہنچنا لازمی ہوگا۔ صرف شدہ قوت کو دوبارہ حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ نیند ہے۔ وہ تھکاوٹوں کو دور کرنے والی۔ گلفتوں کو بھلا دینے والی نیند۔ تھکے ماندوں کو تازہ دم کرنے والی شیریں عمل اور قدرت کا عطیہ جس کے دوران میں تمام رگ اور پٹھے ڈھیلے ہو جاتے ہیں جسم کو تقویت خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ اور دماغی عمل معرض التوا میں پڑ جاتا ہے ✣

دنیا کی مختار اور سربرآوردہ شخصیتوں کے سوانح حیات کا مطالعہ کریں۔ تو ہمیں یہ ذکر کبھی ملیگا۔ کہ ان کی تفریح کا ذریعہ کیا ہوتا تھا۔ بعض کے متعلق تو لکھا ہے۔ کہ ان کے لئے تفریح کا ذریعہ محض نیند تھی جس سے اصلی اور حقیقی تازگی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ عموماً دیر ہی ہوتے ہیں۔ جو ہر وقت کام میں مصروف رہتے ہوں۔ اور اسی میں ان کو راحت نصیب ہوتی ہے۔ تاہم کسی پہلو سے دیکھا جائے۔ کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے لئے آرام ضروری ہے۔ بغیر تندرستی کا برقرار رہنا بیماری سے بچے رہنا محال ہے جسم انسانی کے اندر کام اور تفریح کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ جب انسان محو آرام ہوتا ہے۔ تو اس دوران میں خارج شدہ قوت۔ ضائع شدہ طاقت دوبارہ عود کر آتی ہے ✣

لیکن ہم فرصت یا تعطل کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ایک شخص جو مستعدی اور تندہی سے مصروف کار رہتے کا عادی ہے۔ اگر کبھی بیکار رہے۔ تو تنگ آجاتا ہے۔ اور یہ بیکاری اس کے بدن کو تھکاوٹ ہے۔ ریل گاڑی میں طویل سفر کرتے ہوئے آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ وقت کس مشکل سے گذرتا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں۔ کہ بیکاری سے نہ صرف دل تنگ ہوتا ہے۔ بلکہ طبیعت شرارت اور بدی کی جانب مائل ہوتی ہے۔ پس اس آزمائش سے بچنے اور صحت و تندرستی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ قوت کے لئے کوئی صحیح مصرف یا مخرج ہو۔ تفریحی مشاغل ایسے ہونے چاہئیں۔ کہ ان میں قوت صرف ہو۔ اور انسان کو خوشی اور مسرت حاصل ہو۔ اگر یہ نہ ہوگا۔ تو ایسے مشاغل سے تکان پیدا ہوگی۔ اور اصلی غرض پوری نہ ہوگی آج کل کوشش کی جا رہی ہے کہ کارخانوں اور دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں کے اوقات کار کم کر دیئے جائیں لیکن گریہ کوششیں کامیاب ہوگئیں۔ تو اس کے ساتھ ہی ضروری ہوگا کہ جو اندوختہ فرصت ان کو دیا جائے۔ اس کو صحیح طور پر صرف کرنے کا بھی کوئی انتظام کر دیا جائے۔ ورنہ جسمانی اور دماغی انحطاط کا لاحق ہونا لازمی ہوگا۔ بکثرت مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کہ وہ لوگ جو نہایت مصروف اور چاق و چوبند زندگی گذارتے ہیں۔ جب اپنے کام کو ترک کرتے ہیں۔ تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھر ہو جاتے ہیں۔ اکثر جلدی انتقال کر جاتے ہیں۔ کام کو خیرباد کہنا اکثر لوگوں کے لئے دنیا کو خیرباد کہنے کے مترادف ہوتا ہے

(ترجمہ)

ریاض بی اے



خواجہ سرا

قہقہہ

قہقہہ ایسے مسائل پیش کرتا ہے جن سے اکثر فلاسفہ دست و گریبان رہتے ہیں۔ مگر کامیابی معلوم۔ بلکہ وہ مضحکہ خیز اشیا کے نہایت ہی مہمل نظریات وضع کرتے ہیں۔ انسان ہی ایک ہنسنے والا جانور ہے۔ اور اگر قہقہہ کو بجا طور پر ایک جبلی ردعمل کہا جائے تو نوع انسانی ہی اس جبلت سے مختص ہوگی۔

تقریباً وہ تمام مصنفین جنہوں نے قہقہہ سے بحث کی ہے اُسے ایک مظہر مسرت قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کے اکثر نظریات کی کوشش ذرائع مسرت کی توجیہ ہے۔ جن کے متعلق یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہی قہقہہ کی وجہ ہیں۔ مثلاً تھامس ہابس۔ فوقیت غیر مترقبہ کی حیثیت کو بھی ایک ذریعہ فرض کرتا ہے۔ جس کا تجربہ تمام انسانوں کو اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ دوسرے افراد کو ذلیل ہوتا دیکھتے ہیں۔ بعض اور لوگوں نے بھی اس غلط طریقہ کو اختیار کر لیا ہے۔ لیکن یہ غلطی فوراً واضح ہو جاتی ہے۔ اگر ہم اپنے آپ سے یہ معمولی سوال کریں کہ آیا ہم اُن چیزوں سے خوش بھی ہوتے ہیں جن پر ہمیں ہنسی آتی ہے؟ اور کیا مضحکہ خیز اور مہمل چیزیں دراصل خوشگوار بھی ہوتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں ہوتیں۔ محرکات قہقہہ کا بذاتہ خوشگوار ہونا تو کجا بعض اس کے برعکس بھی ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم اُن پر نہ ہنسیں تو اُلٹی ہمیں کو تکلیف ہو۔

ہربرٹ اسپنسر فاضل عصبی توانائی کے اخراج کو قہقہہ کہتا ہے۔ جس میں تھوڑی سی صداقت ضرور ہے۔ مگر یہ بھی کوئی معقول نظریہ نہیں۔ قہقہہ میں نہایت ہی نازک۔ ملتف اور متطابق نظام حرکات شامل ہے جو نظام عصبی کی تہہ میں پایا جاتا ہے۔ بغیر سیکھے ہوئے ہم سب ایک ہی طرح ہنستے ہیں۔ اور نوع میں ایسا نظام صرف اس وقت ظاہر ہو سکتا ہے جبکہ اس کی کوئی غایت ہو اور کوئی حیاتیاتی فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ عصبی توانائی کا اخراج کی میکانیات میں سے کسی ایک کی تحریک ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ جیسے کہ ہم بچوں کی ان بے چین حرکات میں دیکھتے ہیں۔ جو چاروں طرف سے پکڑ لیا جاتا ہے۔ لہٰذا فطرت کو اس غرض کی تکمیل کیلئے مخصوص اور اعلیٰ ملتف میکانیت کی تعمیر اور ودیعت کی ضرورت نہ تھی۔

پروفیسر برگسان نے جو نظریہ پیش کیا ہے۔ وہی موخر ترین قابل ذکر نظریہ ہے۔ جو ہمیں صرف یہ بتلاتا ہے کہ قہقہہ اجتماعی قوانین کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لئے کہ ہم فطرتاً اُن چیزوں پر ہنستے ہیں جو کردار میں کرخت۔ بھدی اور میکانکی ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظریہ صحیح ہے اور نظریہ مسرت سے جامع۔ لیکن بحیثیت نظریۂ قہقہہ جزئی اور غیر معقول بھی ہے۔ ہمیں بمشکل اس کا یقین ہو سکتا ہے کہ فطرت نے ابتداءً اس ملتف و متطابق ردعمل کو اجتماعی اغراض کے لئے پیدا کیا تھا۔ حقیقی نظریہ کا کام تو یہ ہے۔ کہ وہ مندرجہ ذیل اساسی سوالات کا جواب دے۔ قہقہہ سے کون سی حیاتیاتی غرض پوری ہوتی ہے؟ کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ اور اس کی ثباتی (SARVIVAL) قیمت کیا ہے؟

واقعہ یہی ہے کہ اگر ہم یہ سوال کریں کہ قہقہہ ہمارے کس کام آتا ہے۔ اس کے نتائج اور معلولات کیا ہیں۔ تو ہمیں ایک صحیح نظریہ کا مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو بیحد عام ہے کہ جب ہماری طبیعت پست ہو تو ہم ایسے حالات اشخاص اور ایسی چیزوں کی تلاش کرتے ہیں جو ہمیں ہنسائیں۔ جس سے کم از کم تھوڑی دیر کے لئے ہمارے غمناک اور تاریک خیالات کی آمد رک جاتی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ کیونکر۔ لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اب مفید اثر کیسے پیدا ہوا؟ دو طرح ——— ایک تو خالص عضویاتی اور دوسرا زیادہ تر نفسیاتی ہوتا ہے۔ تنفس اور دوران خون میں ہیجان پیدا ہونا خون کے دباؤ میں زیادتی ہونا۔ اور خون کا سر اور دماغ میں زیادہ مقدار میں جانا عضویاتی اثر ہے۔ جس کا پتہ جی کھول کر ہنسنے والے کے سرخ چہرہ سے ملتا ہے۔ نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ خیالات کا ہر سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ذہنی اور جسمانی جبری اعمال بھی رک جاتے ہیں۔ یہاں اسپنسر کے نظریہ کا جزو اور اُلٹا اطلاق ہوا۔ قہقہہ کے عصبی راستے توانائی کو دیگر راستوں سے کھینچ کر جمع کر لیتے ہیں۔ لیکن اُن کا کام یہ نہیں۔ کہ توانائی کو میکانکی جان کر ضائع کر دیں۔ بلکہ اُس کے اخراج کو روک دیں۔ قہقہہ تمام عمر دوسرے سے ایسی دست کشی کا نام ہے۔ جس کے میکانکی اثرات توانائی کو فوراً بازگشت کرتے ہیں۔ جو ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم کاروبار زندگی میں گذشتہ تکالیف کو فراموش کر کے چستی اور بیباکی سے منہمک ہو جائیں۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ ہم ایسے

حالات اور چیزوں کی تلاش کیوں کرتے ہیں۔ جو ہماری ہنسی کا باعث ہوں۔ ہم مضحکہ خیز مُہمل اور لایعنی اشیاء کے متلاشی اس لئے نہیں رہتے۔ کہ وہ بذاتہ خوشگوار ہوتی ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ ہمیں ہنساتی ہیں۔ علاوہ ازیں قہقہہ ہمارے لئے مفید بھی ہے جس سے ہم میں مسرت اور خوشی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ہماری پستی دور ہو جاتی ہے۔ اور نچلہ درجہ کے خیالات غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ شخص جو پوری طرح خوش ہو قہقہہ نہیں لگاتا اس لئے کہ اس کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ گو وہ مسکراتا ضرور ہے۔ تقریباً تمام مصنفین بلاچون و چرا یہ مان لیتے ہیں کہ تبسم قہقہہ سے مشابہ یا ایک ابتدائی یا جزئی قہقہہ ہے۔ جو غلط ہے۔ تبسم اس طمانیت کا ایک فطری مظہر ہے جو کسی کوشش میں کامیابی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ فتحمند کامیابی کی خوشی میں مسکراتا ہے لیکن قہقہہ نہیں لگاتا۔ ماں اپنے صحت مند بچہ کو دیکھ کر تبسم ریز ہوتی ہے۔ جب ہم کسی ایسے زور کو پا لیتے ہیں۔ جس کی ہمیں تلاش تھی تو کسی ایسے مسئلہ کو حل کر لیتے ہیں جس میں ہم اُلجھے ہوئے تھے۔ یا کسی ایسے تکمیل شدہ کام پر غور کرتے ہیں (گو آئندہ کامیابی کے خیال ہی سے کیوں نہ ہو) جس میں ہم منہمک تھے۔ تو ہم بھی مسکراتے ہیں۔ قہقہہ اور تبسم کا اہم اور انتہائی فرق قابل غور ہے ——— تبسم خوشنما ہوتا ہے اور قہقہہ بدنما۔ قہقہہ ہمیشہ تبسم میں کیوں جذب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو بیشک ان کی غلط مشابہت پر مبنی ہے۔ جس کا جواب یہ ہے۔ کہ قہقہہ بشرطیکہ آزادی سے لگایا جائے۔ کامیاب افعال کی طرح اطمینان بخش ہوتا ہے۔ جس کا اظہار تبسم میں ہوتا ہے۔ اور ایسا تبسم طمانیت ہی کا تبسم ہوتا ہے۔ جس کی وجہ قہقہہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ عمل اُسی وقت ہوگا۔ جبکہ تبسم کمزور قہقہہ میں جذب ہو جائے۔ یہ قہقہہ بدنما نہیں بلکہ خوشنما ہوگا۔

مضحکہ خیز } اگر قہقہہ سے ایسے فائدہ بخش نتائج مترتب ہوتے ہوں تو مضحکہ خیز کی کیا تعریف ہوگی؟ اس واقعہ سے قطع نظر کہ ان کا خیال ہماری ہنسی کا باعث ہوتا ہے۔ مضحکہ خیز حالات اور اشیاء میں شے مشترک کیا ہے؟ یہ تو غیر ممکن ہے کہ وہ بذاتہ خوشگوار ہیں۔ مضحکہ خیز مثالوں پر غور کیجئے وہ شخص جو خود اپنی ٹوپی پر بیٹھ گیا ہو۔ یا اُس کی ٹوپی ہوا سے اُڑ رہی ہو اور وہ اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ جو کر جو بڑے دھماکے سے گرے اور برتنوں کے ڈھیر کو پاش پاش کر دے۔ یا اپنے ساتھی کو خواہ مخواہ بُری طرح مارنا شروع کر دے۔ یہ مضحکہ کی بنیادی مثالیں ہیں۔ ایسی مثالیں جن میں لوگ اپنی ذاتی نالائقی کی وجہ سے ناکام رہتے ہیں کہ ناقص ہیں۔ مثلاً وہ کھلاڑی جو باوجود گھانس کو ہٹانے کے اپنی گیند بدقت دو گز آگے بڑھا سکتا ہے۔ یا وہ شخص جو بجائے اس کے کہ پانی کی نالی کو صاف کرے خود اُس میں گر پڑتا ہے۔ مضحکہ خیز کی بہتر مثالیں ان لوگوں سے ملتی ہیں جو خود بیوقوف بنتے ہیں۔ جس کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ کہ ان میں زیرکی اور اجتماعی چستی نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ شخص جو ہکلاتا ہو یا وہ جو بغیر یہ معلوم کئے کہ لوگ اس کی شیخی اور جھوٹ کو سمجھتے ہیں بکنا شروع کر دیتا ہو۔ مضحکہ خیز اشیاء کی دوسری بُری جماعت میں لباس۔ تخاطب۔ تکلم۔ رفتار اور کھانے کے بدنما اور نیم بربری طریقے شامل ہیں۔ ہم اُن تمام چیزوں پر ہنستے ہیں اور ہمارا قہقہہ جیسا کہ برگسان کہتا ہے۔ قوانین اجتماعیہ کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ مگر کیا یہ ہمیشہ بیوقوفوں کی تنبیہ کے لئے ہنستے ہیں؟ ایسی صورتوں میں اسٹیج کے مسخرے سے متعلق کیا کہا جائیگا؟ کیا ہم اس کی بھی تنبیہ کرنا چاہتے ہیں؟ اور کیا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں۔ کہ فطرت نے ہمیں یہ عجیب و بدنما ردعمل اس غرض کے لئے عطا کیا ہے؟ کیا ہم ان مضحکہ خیز چیزوں سے خوش ہوتے ہیں؟ کیا بیوقوفی۔ بھدا پن اور نالائقی خوشگوار ہیں؟ یقیناً نہیں! ہا بس یہ کہیگا کہ وہ ثانیاً خوشگوار ہیں۔ اس لئے کہ اُن سے ہمیں اپنی فوقیت کا علم ہوتا ہے۔ یہ توجیہ فی الحقیقت نہایت ہی پیچیدہ ہے۔ کیا ہم کبھی چالاک مسخرے کی ستائش کرنے پر مجبور نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی عجیب و غریب حرکات سے ہمیں ہنساتے ہنساتے بدحواس کر دیتا ہے۔ اگر ہم مضحکہ خیز حالات یا افعال کا ذرا غور سے مطالعہ کریں۔ تو یہ معلوم ہو جائیگا کہ در اصل مضحکہ خیز شے شخصی۔ انسانی یا تقریباً انسانی ہوتی ہے۔ اشیا کی بدوضع ترتیب بھی مضحکہ خیز ہو سکتی ہے۔ لیکن صرف اسیقدر کہ اُس سے مرتب کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات جانوروں کا کردار بھی مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ مثلاً جب کتا بچوں یا اور کتوں سے وحشیانہ طریقہ سے کھیلتا ہے لیکن اس حد تک کہ ہمیں اُن سے ہمدردی ہو اور ہم اُن کے اچانک بچاؤ اُن کی غشی۔ ناکامی۔ لوٹ پوٹ۔ تعجب اور مایوسی کو پسند کرتے ہوں۔ جس طرح کہ ہم بچوں کے کھیل کود کو پسند کرتے ہیں۔

لہٰذا مضحکہ خیز شے کی دو خصوصیات ہوئیں۔ اوّل تو یہ کہ وہ کسی نہ کسی غلط تطبیق یا عدم تناسب پر مشمول ہوتی ہے۔ جس پر اگر ہم بغیر ہنسے ہوئے غور کریں تو یقیناً ہمیں ناگوار گذریگی۔ (بعض معذور لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ہنسی نہیں آتی) جیسا کہ فطرت میں تناسب و توافق کی یہ کمی ناگوار

ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ مضحکہ خیز حالات یا افعال اگر ہمیں خود برداشت کرنے پڑیں۔ باہم سے ظاہر ہوں۔ تو خفیف سے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس شخص کے لئے بھی تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں جو ان میں سے گذرتا ہے صرف سخرے ستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ جو اپنی ہنسانے کی کوشش میں کامیابی سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر ہم میں قہقہہ لگانے کی صلاحیت نہیں تو ابتدائی میلان ہمدردی کی موجودگی میں افعال کی اس بے ترتیبی پر غور کرنے کے بعد ہمیں کچھ نہ کچھ تکلیف تذبذب یاس ——— غرض وہ دکھ اور مایوسی جو افعال کی ناکامی سے وابستہ ہے برداشت کرنی چاہئے یعنی ایک ایسا شخص جس کی صحت معمولی ہو اور جو معمولی اجتماعی زندگی بسر کرتا ہو۔ اکثر ہمدردی کی تکلیف اور پستی میں مبتلا ہو جائیگا۔ کیونکہ اس کے گرد کے لوگوں کی ہر چھوٹی سی تکلیف یاس اور ناکامی میں اس کو بحیثیت ایک ہمدرد کے شریک ہونا پڑیگا۔

قہقہہ کے فوائد: قہقہہ ہمیں ان تمام ہمدردی کی تکالیف سے نجات دلاتا ہے جس سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ذہنی اعمال کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تکلیف دہ خیالات رُک جاتے ہیں۔ اور پست اثرات کے دفعیہ کے لئے ایک تریاق ہیجان عضویاتی کی صورت میں حاصل ہوتا ہے جو خون کے وزن کو زیادہ اور دَورانِ خون میں تیزی پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا ہی قہقہہ کا حیاتیاتی وظیفہ ہوا۔ جو فطرت کے نازک اور عمدہ تطابقات میں سے ہے۔ اجتماعی زندگی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ انسان میں ابتدائی میلانات ہمدردی نہایت ہی مضبوط اور متطابق ہوتے۔ کیونکہ بغیر اس کے باہمی مفاہمت اور زندگی کی اہم مشکلات میں استمداد نہیں ہو سکتی۔

فطرت نے انسان میں نازک جوابی میلانات ہمدردی ودیعت کر کے اُسے اپنے ہم جنسوں کی ہزاروں مصائب کا شریک بنا دیا۔ اور وہ بھی ایسی معمولی کہ جن کے لئے کوئی مدد تک نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک معمہ ہے کہ آیا انسان کو اس قدر کم ہمدرد بنایا جائے۔ کہ وہ بااثر اجتماعی زندگی بسر نہ کر سکے؟ یا اس میں موثر ہمدردی ودیعت کر کے ہمیشہ کی نئی تکالیف ہمدردی میں مبتلا کر دیا جائے؟ جن کی اگر روک تھام نہ ہو تو اس کی قوت کو سخت صدمہ پہنچے۔ حتیٰ کہ نوع تباہ ہو جائے۔ چنانچہ فطرت اس مسئلہ سے دوچار ہوئی تھی اور قہقہہ کی ایجاد سے اُسے حل کر گئی۔ اس نے انسان میں اپنے ہم جنسوں پر ہنسنے کا میلان پیدا کیا ہے۔ جو دیکھنے والے کے لئے بھی مفید ہے اور وہ تمام چیزیں جو قطع نظر قہقہہ کے ناگوار تھیں۔ فائدہ بخش قہقہہ کی محرک بن گئیں۔

گو فلاسفہ قہقہہ کا راز معلوم کرنے سے قاصر رہے۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کئی شعرا کو اس کا الہام ہوا ہے۔ لارڈ بائرن کا قول ہے "اور اگر میں کسی فانی چیز پر ہنسوں تو گویا میں نہیں رونگا"۔ شنشے کہتا ہے "شاید میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ صرف انسان ہی کیوں ہنستا ہے؟ وہ اس قدر مصائب جھیلتا ہے کہ اُسے قہقہہ ایجاد کرنا پڑا۔ سب سے زیادہ رنجیدہ اور غمزدہ وہی جانور ہے جو سب سے زیادہ خوش بھی ہو۔ جو معقول ہے"۔ قہقہہ کا صحیح نظریہ ایک جملہ میں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

"قہقہہ ہمدردی کی زحمت کا تریاق ہے۔ نظریہ۔ لینگ جیمس اگر کہیں صحیح ہے تو یہاں بھی صحیح ہوگا۔ ہمیں ہنسنے سے اگر خوشی ہوتی ہے تو اس لئے کہ ہم ہنستے ہیں"۔

محمد عبدالغفور متعلم بی اے کلیہ جامعہ عثمانیہ

حافظ نذیر احمد اور اُن کا ایک نسائی کردار

(از مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

(۱)

حافظ نذیر احمد کی قابلیت ہر چیز سے زیادہ فسانہ نگاری کے لئے موزوں تھی۔ اُنہوں نے ادب کے دیگر شعبوں پر بھی قلم اُٹھایا۔ اور اپنی حد تک ناکام بھی نہیں رہے۔ لیکن اُردو ادبیات میں افسانہ نگاری کی وجہ ہی سے وہ زندۂ جاوید بن گئے ہیں۔ اور اُن کی دیگر تصنیفات ان ہی وجہ سے زندہ ہیں۔ حافظ صاحب نے انگریزی ناولوں کے ترجمے کئے۔ لیکن اُن کی کوششیں افسانہ نگاری میں شاندار اضافہ ہیں۔ اُردو افسانہ نگاروں کے وہ پیش رو اور بانی ہیں۔ اس میدان کے وہ شہسوار ہیں۔ اور خود اپنے قبیلے یعنی اُردو معاشرتی افسانوں کے وہ موجد ہیں۔

یہاں ہم حافظ نذیر احمد کو دوسری زبانوں کے باکمال قصہ نگاروں کے پہلو بہ پہلو رکھ کر نہیں جانچ رہے ہیں۔ بلکہ اس وقت ہماری نظر صرف اُردو افسانوی ادب پر ہے۔

سرسیّد کی زبردست شخصیت نے جو اصلاحی کاموں کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اس کے منظر ادب کے مختلف شعبوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نظم اور سوانح نگاری میں حالی۔ تاریخ اور تاریخ ادب میں شبلی۔ مذہبی اور معاشرتی مقالہ نگاری میں مہدی علی خاں۔ لسانیات میں آزاد۔ اسی مختلف النوع طبیعت رکھنے والی ہستی کے مساعی جمیلہ کی یادگاریں ہیں۔ جب کبھی اردو زبان اور ادب میں دور ترقی کے آغاز کا پتہ لگانا ہو۔ تو ہماری نظریں سرسیّد کی مختلف النوع کوششوں سے آگے نہیں جاسکتیں۔ لیکن ہر فنی سیّد کی تمام کوششوں کی محرک کیا شے تھی؟ اس کے کئی جواب ہوسکتے ہیں۔ لیکن ہماری نظر میں صحیح جواب یہ ہے۔ کہ یہ قوت محرکہ قوم کے معاشرتی کردار کے اصلاح کا خیال تھا اور اسی قوت محرکہ کا سب سے زیادہ وسیع موثر اور ہر دلعزیز مظہر حافظ نذیر احمد کی افسانہ نگاری ہے۔

حافظ نذیر احمد کے افسانوں کی اسپرٹ سے کماحقہ واقف ہونے کے لئے اس امر کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ کہ وہ مردوں سے زیادہ عورتوں بلکہ نوعمر لڑکیوں کی اصلاح کو مفید تصور کرتے تھے۔ اس کی کئی فلسفیانہ وجوہ ہیں۔ سب سے اہم وجہ تو یہ ہے۔ کہ "ماں کی گود بچے کا سب سے پہلا مکتب ہوتا ہے" اور بلاخوف تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس مکتب کے نقوش تا قرحیات انسانی کے مدھم بن جاتے ہیں۔ دوسرے ان کا یہ عقیدہ تھا کہ قوم کا معاشرتی کردار عورتوں ہی کی اصلاح سے درست ہوسکتا ہے۔ اور عورتیں بہ نسبت مردوں کے جلد راہ راست پر آجاتی ہیں۔ نعیمہ اور کلیم ("توبۃ النصوح") کی زندگیاں اس امر کی جلی ثبوت ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ حافظ صاحب کے معاصرین کی توجہ زیادہ تر بلکہ تمام تر مردوں کی حالت کی درستی میں صرف ہو رہی تھیں۔ خود سرسیّد کے اصلاحی نظام میں یہ چیز قبل از وقت سمجھ کر داخل نہیں کی گئی تھی۔ اسی لئے اس کی سخت ضرورت تھی کہ کوئی قدم عورتوں کی اصلاح کے لئے بھی بڑھتا۔ سرسیّد اور اُن کے معاونین کے اس چھوٹے ہوئے پیغام کو صنف لطیف تک پہنچانے کی ذمہ داری حافظ نذیر احمد نے قبول کی۔ اور اس کی اشاعت کا جو ذریعہ اُنہوں نے اختیار کیا۔ کیا اس سے بہتر بھی کوئی اور ذریعہ ممکن تھا؟

(۲)

غرض یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حافظ نذیر احمد کے قصوں کی مخاطب صنف لطیف خصوصاً نوعمر لڑکیاں ہیں۔ "مراۃ العروس" "رویائے صادقہ" "ایامیٰ" "توبۃ النصوح" اور "محصنات" وغیرہ سے اس حقیقت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ "مراۃ العروس" اور "توبۃ النصوح" میں اس مقصد کو ہم زیادہ واضح دیکھتے ہیں۔ یہاں ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم "مراۃ العروس" کو "توبۃ النصوح" پر مرتبۃً یا اس کے برعکس ثابت کریں۔ ہم فن افسانہ نگاری کے اعتبار سے "توبۃ النصوح" کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ مخلوط پلاٹ۔ سادہ پلاٹ سے زیادہ فنی معلوم ہوتا ہے۔

"توبۃ النصوح" کا پلاٹ مخلوط اور منظم ہے۔ اس کے اہم کردار ظاہر میں تو نصوح اور فہمیدہ معلوم ہوتے ہیں لیکن اصول کردار نگاری کی رو سے ان کی اہمیت صرف معاون اشخاص قصہ کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نصوح مرکزی شخصی قصہ ہے۔ اور اس کی ہستی قصے کے ہر دور دراز حصوں میں رشتے کی

طرح دوڑ کر ان کی شیرازہ بندی کر رہی ہے۔ لیکن اس کا ذاتی کردار کچھ نہیں۔ اور یہی حال فہمیدہ کا بھی ہے۔ علیم سلیم اور حمیدہ میں سے پہلے دو تو قطعی ساقط الاعضا ہیں۔ حمیدہ کا کردار، کمسن لڑکیوں کے کردار کی نمائندگی بوجوہ احسن کرتا ہے لیکن مصنفہ نے بعض جگہ اس کی عمر اور اس کے کردار میں کماحقہٗ مطابقت قائم نہیں رکھی۔ یہ کردار نگاری کا عیب ہے، باقی دو اشخاص قصہ یعنی کلیم اور نجمہ کے کردار اہم ہیں۔ ان کے کردار کی تصویریں پیش کرتے وقت نذیر احمد کا قلم لفظاً وہی طاقت کے ماتحت کام کر رہا تھا +

(۳)

کردار نگاری میں حافظ نذیر احمد کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ اردو افسانہ نگاروں میں سے کوئی بھی ان کے عمیق مشاہدہ۔ فطرت انسانی کے وسیع مطالعے اور دقیق نباہات تک نہیں پہنچ سکا۔ حافظ نذیر احمد کے قصوں کا سب سے زیادہ اہم عنصر ان کی کردار نگاری ہے +

کردار خواہ کسی نوعیت کا ہو۔ جب تک اس میں "انسانی دلچسپی" موجود نہ ہو۔ وہ ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کر سکتا۔ رومانس اور حقائق نفس الامری پر مبنی ناولوں میں بھی ایک فارق خصوصیت ہے۔ جو دلچسپی ہم "داستان امیر حمزہ" کے کسی کردار۔ مثلاً خود امیر حمزہ کے مصائب میں مبتلا ہو جانے یا کسی لڑائی سے کامیاب واپس آنے میں لیتے ہیں۔ وہ اسی نوعیت کی نہیں ہوتی جو کلیم کے مبتلائے آفات ہونے یا نصوح کے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے وقت محسوس ہوتی ہے۔ انسانی دلچسپی کے یہ معنے ہیں۔ کہ جب تک ہم اشخاص قصہ کے ساتھ رہیں۔ ان سے متعلق ہر واقعہ میں اسی طرح دلچسپی لیں جس طرح اپنے ایک ہم جنس زندہ آدمی کے افعال میں لیتے ہیں" کردار نگار کا ایک دوسرا مستم بالشان فرض یہ ہے۔ کہ وہ ادبی کردار کو اپنی مجانفسی سے ایسی روح پھونک دے کہ اس کی تحریری تصویریں پلاٹ کی سرزمین اور ناول کی فضا میں متحرک نظر آئیں + اشخاص قصہ کو زندہ کس طرح بنایا جا سکتا ہے؟ اس کا قطعی جواب نہایت دشوار ہے۔ لیکن ہم کہہ سکتے علم آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کہ کونسا شخصی قصہ زندہ اور کون مردہ ہے +

"توبۃ النصوح" کے دو اشخاص قصہ مثلاً فہمیدہ اور نجمہ کو لے کر دونوں کا مقابلہ کیجئے۔ قصے کے ختم ہوتے ہی فہمیدہ کا کردار نظر اور دل دونوں سے دور ہو جائیگا۔ لیکن نجمہ کے اثرات دیرپا ہونگے۔ اس کے واقعات میں ہم اپنے آپ کو بھلا محو پاتے ہیں۔ کہ ایک ذرا غور کرنے پر ہنسی آئیگی کہ افسانے کو کیوں حقیقت سمجھا! افسانہ گوئی کا فن ہی "ابلہ فریبی ہے"+

حافظ نذیر احمد کے بعض اچھے کرداروں کی انفرادی خصوصیات ان کو اردو افسانوں کے دوسرے کرداروں میں نمایاں اور ایک افسانے کے اشخاص قصہ کو دوسرے افسانے کے اشخاص قصہ سے ممتاز بنا دیتی ہیں + یہ بات یاد رہے۔ کہ افسانوی ادب میں وہی شخصی قصہ کچھ اہمیت اور نمایاں حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔ جس کو ہم اس کے حاشی ہزاروں کرداروں میں بھی اچھی طرح پہچان لیں حقیقی افسانوں میں ایسا شخصی قصہ "کردار" ہی نہیں کہلا سکتا۔ جس کے اوصاف میں دنیا سے ممیز کوئی خصوصیت موجود نہ ہو + یہ انفرادیت بعض وقت تو شخصی قصہ کے کسی خاص وصف سے پیدا ہو جاتی ہے جیسے فطرت یا ظاہر دار بیگ کے کردار ہیں۔ لیکن عموماً ماحول اور واقعات جو ایک شخصی قصہ کو پیدا کرتے ہیں۔ ان کی اجتماعی بدرت اشخاص قصہ میں انفرادیت پیدا کر دیتی ہے + اس کی ایک مثال نجمہ ہی کا کردار ہے + اس میں کوئی غیر معمولی وصف یا خصوصیت موجود نہیں۔ لیکن واقعات جو اس کا ماحول اور خود اس کا کردار بناتے ہیں۔ وہ بحیثیت مجموعی اسی سے مخصوص ہیں۔ اور یہی اس میں انفرادیت پیدا کر رہے ہیں +

(۴)

ہر قصے میں اشخاص قصہ کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے کہ ہم انکو بآسانی گروہ اور جماعتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں + ان جماعتوں کو جدا کرنے والی شے انکے درمیانی اختلافات اور وہ مقطع نظر ہوتے ہیں۔ جن تک پہنچنے کے لئے ہر ایک جماعت کوشش کرتی رہتی ہے + ایک ہی قصے میں کئی مخالف قوتوں کا جمع ہو جانا کچھ تعجب کی بات نہیں "امراؤ جان ادا" کا پلاٹ مختلف چھوٹی چھوٹی مخالفتوں سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن ہر مفرد قصے میں پلاٹ پیدا کرنے کے لئے کم سے کم دو ایک دوسرے کی مخالف جماعتوں کا موجود ہونا ضروری ہے "توبۃ النصوح" کا پلاٹ صرف دو فریق کی آپس کی کش مکش سے پیدا کردہ ہے۔ ایک جماعت نصوح اور اس کے ہم خیالوں کی ہے۔ اور دوسری مخالف قوت کلیم اور نجمہ پر مشتمل ہے لیکن یہ دونوں بھی اپنا اپنا انفرادی راستہ اختیار کرتے ہیں +

اس وقت تک ہم حافظ نذیر احمد کے تخلیقی نسائی کردار نجمہ کے ماحول کو بخوبی سمجھ چکے ہیں۔ نجمہ کے کردار میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ جن کی ایک ادبی کردار سے توقع کی جا سکتی ہے + اس کا دکھڑا ہم اسی احساس بھرے دل کے ساتھ سنتے ہیں۔ جیسے کسی واقعی انسان کی زبان سے ہم اس کی بپتا سن رہے

ہیں۔ کہیں وہ ہمارے دل کو ٹھیس لگاتی ہے۔ کہیں کسی واقعہ سے ہمارے لبوں پر تبسم کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ کبھی ہم اس کو ملامت کرتے ہیں۔ اور کسی وقت اس سے ہمدردی۔ اس کی شخصیت نہ صرف "توبۃ النصوح" کے تمام اشخاص قصہ بلکہ تمام اُردو افسانوی کرداروں سے جداگانہ ہے۔ اس کے واقعات ہمارے دلوں پر ایسے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ جو کسی مماثل حالت کے مشاہدہ پر تازہ نظر آنے لگتے ہیں۔ یہی اس کردار کی زندگی ہے +

(۵)

"نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی تھی۔ پانچ مہینے کا پھلونٹی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی۔ نانی کی چہیتی۔ ماں کی لاڈلی۔ مزاج کچھ تو قدرتی تیز ماں کے لاڈ پیار سے وہی کہاوت ہے "کریلا اور نیم چڑھا" اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا۔ گھونگھٹ کے ساتھ منہ کھلا۔ اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہو گیا۔ اب چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر "رسّی جلی پر بل نہ گیا" باوجودیکہ اُجڑی ہوئی میکہ میں پڑی تھی۔ مزاج میں وہی طنطنہ تھا۔ کنوارپنے میں سو گز کی زبان تھی۔ کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا۔ سو بیاہے سے اُن کو بھی دھتکار بتائی۔ بیٹا جنے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی۔ مردوں تک کا لحاظ اُٹھا دیا۔ . . . . . ." (صفحہ ۷۔ نولکشور اڈیشن)

یہ طویل تعارف خود مصنف کے رشحات قلم سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فنی ناولوں میں اشخاص قصہ کے متعلق اس قسم کی تشریحات عموماً بے ضرورت سمجھی جا رہی ہیں۔ لیکن یہاں مصنف کا منشا شاید نعیمہ کی کرداری خصوصیات پر زور دیتا تھا۔ جس کردار کا تعارف مصنف ان پُر زور الفاظ کے ساتھ کرائے یقیناً وہ واقعات بیان ہونے سے پہلے ہی قاری کے دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اس بیان سے ہم کو نعیمہ کے کردار کی ایک مرکزی خصوصیت یہ دستیاب ہو جاتی ہے۔ کہ وہ ایک مرفع الحال گھرانے کی لڑکی فطرتاً تیز مزاج۔ اور ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ یہی نعیمہ کا اصل کردار ہے۔ جو اس کو ہر حالت کے اندر ایک نئے رنگ میں جلوہ گر کرتا ہے۔ کہیں وہ بدزبان ہے۔ کہیں بے ادب کہیں بے دین۔ ضدی اور پرخاش جو ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عقلمند بھی ہے +

نعیمہ کے کردار کے ذریعہ حافظ نذیر احمد نے اس فطرت اور اسی ماحول میں پلی ہوئی لڑکیوں کے عادات و خصائل کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ کردار میں کسی ممتاز وصف کا پیدا کر دینا تو آسان کام ہے۔ لیکن حافظ نذیر احمد کا کمال اس میں ہے کہ اُنہوں نے اوّل سے آخر تک اسی وصف کے مطابق کردار پیدا کیا ہے۔ اس کمال کو کردار کا تسلسل یا استقلال بھی کہتے ہیں۔ اسکا فقدان کردار کو ایک کٹ پتلی بنا کر پایہ اہمیت سے گرا دیتا ہے۔ حافظ صاحب نے نعیمہ کے کردار میں حیرت انگیز استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ ہر ایسے موقع پر جہاں قاری یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اُس کے کردار میں تذبذب پیدا ہوا چاہتا ہے۔ مصنف ایسی عمدگی کے ساتھ اس کو آگے بڑھاتا ہے۔ کہ پڑھنے والا تعجب میں رہ جاتا ہے۔ چنانچہ جس وقت نعیمہ کے دو ہتڑ سے حمیدہ اوندھے منہ گر کر ناک پھوڑ لیتی ہے۔ فہمیدہ نہایت ناخوشی کا اظہار کرتی ہے۔ کہ "کیسے دنیا میں لہو سفید ہو گئے ہیں"۔ نعیمہ اس کو یوں پلٹاتی ہے کہ "اگر سفید نہ ہو گئے ہوتے تو کیا بھانجے کو یوں روتا چھوڑ دیتی"[1]۔ ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔ ماں نعیمہ کو نماز اور خدا کے ادب کی تلقین کرتی ہے۔ بیٹی جواب دیتی ہے "ہم بھی تمہاری عمر کو پہنچینگے تو بہتیرا خدا کا ادب کرینگے"۔ فہمیدہ کہتی ہے "خیر سے آپ کو غیب دانی میں بھی دخل ہے۔ بارے میری عمر تک پہنچنے کا یقین ہے؟" نعیمہ:۔ "اب تم میرے مرنے کی فال نکالو"۔ ماں:۔ "نہ کوئی کسی کے فال سے مرتا اور نہ کوئی کسی کے فال سے جیتا۔ جس کی جتنی خدا نے لکھ دی"۔ نعیمہ:۔ "ورنہ تم مجھے کاہیکو جینے دیتیں"+

حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر حافظ نذیر احمد نے ایک ہندوستانی عورت کی لڑائی کی حالت میں ایسا نفیس کردار پیش کیا ہے کہ اُردو افسانوں میں اسکی مثال ملنی محال ہے۔ یہی وہ مہتم بالشان موقع ہے۔ جو ایک ہندی عورت کی اس فطرت کی توضیح کرتا ہے کہ وہ کس طرح ایک معمولی بات سے اپنے مقصد کے موافق بات پیدا کر لیتی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک ہندوستانی عورت کی غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہ اسی اختراعی کاوش سے دنیا کے اہم امور میں بھی حصہ لیتی +

(۶)

نذیر احمد نے نعیمہ کے بھیس میں ایک ضدی عورت کا کردار بھی خوب نمایاں کیا ہے۔ ایک ضدی عورت کا پورا خاکہ تیار ہونے کے لئے چند خاص امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسی عورت میں قوت برداشت اور استقلال کا ہونا لازمی امر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنی ہاڑ پر قائم نہیں رہ سکتی۔ ماں سے لڑ کر نعیمہ نے اپنا بُرا حال کیا۔ اور بغیر کھائے پیئے منہ لپیٹے

[1] "توبۃ النصوح" صفحہ ۷۱۔ نولکشور اڈیشن ۱۹۱۲ء +

پڑ رہی صبح سے شام تک منہ میں ایک دانہ تک بھی نہیں گیا۔ مگر واہ ری ہمت کہ وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آئی۔ شاید یہیں سے "تریا ہٹ" کا اصول اخذ کیا گیا ہے۔ کسی غیر مستقل مزاج والی عورت سے نعیمہ کی سی استقامت کا ظاہر ہونا ناممکن تھا۔ گو بعض وقت انسان غصہ کی حالت میں چند خیالات قائم کر لیتا ہے۔ لیکن کیا ہر شخص ان پر قایم بھی رہ سکتا ہے؟ تمام گھر کے چھوٹے بڑے منا منا کر عاجز آ گئے۔ آخر کار صالحہ بلوائی گئی۔ مصنف نے اس واقعہ میں ایک خاص اہمیت پوشیدہ رکھی ہے۔ نعیمہ نے گھر والوں کے سامنے ماں کے ہاتھ سے طمانچے کھانے تھے۔ اسی لئے وہ گھر والوں سے شرمندہ اور ناراض تھی۔ انسان کی بعینہ یہی فطرت ہے۔ گو وہ اس کی کوئی وجہ نہیں بتلا سکتا۔ کہ سوائے راست مخالفت کرنے والے کے دوسرے دیکھنے والوں سے کیوں رنجیدہ ہے؟ بہرحال صالحہ باہر والی تھی۔ اور اس نے اس کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ کہ ماں اور بیٹی کی لڑائی سے وہ اپنے آپ کو لاعلم ظاہر کرے۔ اس کے باوجود نعیمہ کی ضد کے سامنے صالحہ کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ آخر کار اس کو خالہ کے گھر بھجوانا پڑا۔

مستقل مزاجی کے ساتھ قوت برداشت بھی ہوگی۔ اور جب تک یہ نہ ہو مستقل مزاجی اپنا اثر نہیں دکھا سکتی۔ مستقل مزاجی کے معنے یہی ہیں۔ کہ کسی امر پر اڑے رہنے سے جسقدر بھی مصیبتیں نازل ہوں۔ اُن کو صبر کے ساتھ اٹھایا جائے۔ کیا ذیل کا منظر دیکھنے کے بعد اس امر میں ہم کو کچھ شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ کہ نعیمہ کی قوت برداشت عام سطح سے بالا تھی؟

"طمانچے کا لگنا تھا کہ نعیمہ نے ایک آفت توڑ ماری۔ سب سے پہلے تو اُس نے دے دھواں دھوں، دے دھواں دھوں اپنے بے زبان معصوم بچے کو پیٹ ڈالا (خیال رہے کہ بچہ پانچ مہینے کا ہے) اگر لوگ اس کی گود سے بچے کو چھین نہ لیں۔ تو وہ لڑکے کا خون ہی کر چکی تھی۔ اس کے بعد تو اُس نے عجیب عجیب فیل مچائے۔ گھنٹوں تک تو چٹخیاں کھایا کی۔ کپڑوں کا ایک تار باقی نہ رکھا۔ نہیں معلوم اس کا سر تھا یا لوہے کا گولہ تھا۔ کہ ہزاروں تو دو ہتڑیں اس پر پڑیں۔ آدھے زیادہ بال کھسوٹ ڈالے۔ سینکڑوں ٹکریں دیواروں میں ماریں۔ حیرت ہے کہ وہ سر بچا تو کیونکر بچا!"

(۷)

اگر ایک بگڑے ہوئے خاندان کی بدمزاج لڑکی کے اپنے چاہنے والے بزرگوں کے ساتھ لڑنے کا بہترین سماں دیکھنا ہو تو اردو زبان میں "توبۃ النصوح" کے سوا اور کہیں دستیاب نہ ہوگا۔ نعیمہ اور حمیدہ کی جھوڑ میں حافظ نذیر احمد نے انسانی طبائع کے اختلافات۔ فطرت شناسی۔ عمیق مشاہدہ اور معمولی اور پیش پا افتادہ واقعات کے مطالعہ کا اسقدر کافی ثبوت دیا ہے۔ کہ شاید اس سے بہتر سماں کبھی کھینچا ہی نہ جا سکے لڑائی کے شروع سے آخر تک مصنف نے ایک لفظ بلکہ ایک اشارہ تک بھی ایسا نہیں داخل کیا ہے جو زائد کہا جا سکے۔

حمیدہ کی ناک سے خون کی تُلی جاری ہے۔ ماں گھبرا کر پوچھتی ہے:۔

ماں:۔ "ابھی تو میں تم کو نماز پڑھتی چھوڑ گئی تھی۔ اتنی ہی دیر میں یہ ہوا تو کیا ہوا۔ دیکھوں کہیں نکسیر تو نہیں پھوٹی؟"

حمیدہ بیچاری نے ابھی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ نعیمہ خود بول اُٹھی:۔

"اے بی! ہوا کیا۔ ذرا کی ذرا لڑکے کو دیکر میں منہ دھونے چلی گئی۔ اس نکمی سے اتنا نہ ہو سکا کہ لڑکے کو لئے رہے۔ آخر میں کہیں کنوئیں میں گرنے تو نہیں چلی گئی تھی۔ لڑکے کو بلکتا ہوا لٹا نیت باندھ نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ میں جو آئی تو ذرا ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ کہ آپ دھڑام سے گر پڑی۔ کہیں تخت کی کیل لگ گئی ہوگی"۔ اپنے جرم کو کتنا ہلکا کر کے دکھایا ہے۔

ماں:۔ "اچھا تم نے ہولے سے ہاتھ رکھا تھا۔ کہ نگوڑی لڑکی کے فصد کے برابر خون نکلا۔ کیسے دنیا میں لہو سفید ہو گئے ہیں"۔

نعیمہ:۔ "لہو سفید نہ ہو گئے ہوتے تو کیا یوں بھانجے کو روتا ہوا چھوڑ دیتی"؟

ماں:۔ "لیکن اُس نے بے سبب نہیں چھوڑا تھا۔ اُس کی نماز چلی جا رہی تھی"۔

نعیمہ:۔ "بلا سے۔ صدقہ سے نماز کو جانے دیا ہوتا۔ نماز پیاری تھی یا بھانجا"؟

ماں:۔ "لڑکی خدا کے غضب سے ڈر۔ کیا کفر بک رہی ہے؟ اس حالت کو تو پہنچ چکی۔ اور پھر بھی درست نہ ہوئی"۔

نعیمہ:۔ "خدا نہ کرے۔ میری کونسی حالت تم نے بُری دیکھی"؟

ماں:۔ "اس سے بدتر حالت اور کیا ہوگی؟ تین برس بیاہ کو ہوئے اور ڈھنگ سے ایک دن اپنے گھر میں رہنا نصیب نہ ہوا"۔

نعیمہ:۔ "وہ جنم جلا گھر ہی ایسا دیکھ کر دیا ہو تو کوئی کیا کرے"؟

ماں:۔ "میں تیری ایسی ہی دشمن تھی....."

نعیمہ:۔ "کیا جانیں؟ ہم کو تو آنکھ میچ کر کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ سو پڑے ڈبکیاں کھا رہے ہیں"۔

ماں:۔ "خیر بیٹی! اللہ رکھے تمہارے آگے بھی اولاد ہے۔ تم سمجھ بوجھ کر اُن کی شادی بیاہ کرنا"۔

(ذرا اس جواب کو ملاحظہ فرمائیے "شکوہ کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں؟")

نعیمہ "کریں ہی گے۔ نہ کرینگے تو کیا تمہارے بھروسے بیٹھے رہینگے"۔

ماں "میں کیا کہتی ہوں کہ میرے بھروسے بیٹھی رہنا۔ بڑا بھروسہ خدا کا"۔

بعض وقت مخالفت صرف مخالفت کی خاطر ہوتی ہے۔ نعیمہ جواب دیتی ہے "کیسا خدا؟ بھروسا اپنے دم قدم کا"۔

ماں۔ یہ دوسری دفعہ ہے کہ خدا کی شان میں بے ادبی کر چکی ہے۔ اب کے تو نے اس کی بات منہ سے نکالی۔ اور بے تامل تڑ سے طمانچہ تیرے منہ پر کھینچ مارونگی"۔

نعیمہ "سچ کہنا! بڑی بیچاری مارنے والیں! مارو اپنی چہیتی کو۔ مارو اپنی لاڈو کو"۔ ..... (صفحہ ۷۲ و ۷۳)

باقی حصہ طوالت کے خوف سے ہم نظر انداز کر رہے ہیں۔ طبیعت تو چاہتی تھی کہ ہر لفظ کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک [illegible] کردار نگار کا ایک حصی قصہ اپنے کردار کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے۔

(۸)

یوں تو نصوح کا گھر کا گھر مذہب سے بیگانہ تھا لیکن نعیمہ اور کلیم کی بے [illegible] نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ فہمیدہ نے حمیدہ کو تو فوراً راہ راست پر لگا دیا۔ سلیم اور علیم کی حالت ابھی نازک کونپلوں کی سی تھی جس طرف جھکاؤ جھک گئے۔ نعیمہ اور کلیم کی عمر نسبتاً زیادہ بے دینی کی حالت میں بسر ہوئی تھی۔

اس لئے وہ اس قسم کی زندگی سے مانوس ہو چکے تھے نصوح کے مذہب اور مذہبی باتوں کی طرف مائل ہونے کو وہ ایک جدت یا دیوانگی اور جنون سمجھ رہے تھے یہ سب صرف اس لئے تھا کہ وہ گھر کے بڑے بیٹا بیٹی تھے۔ اور اپنے آپ کو عام سطح سے بلند تصور کرتے۔ دوسرے ان کے اس انکار کی تہہ میں ان کا وضعداری کا خام خیال تھا جو ان کو گھر کے کم عمر بچوں کے سامنے اپنی پچھلی محبوب حالت کے بدلنے سے روک رہا تھا۔ یہ ایسا احساس تھا جو ان کو دھوکا دے رہا تھا کہ وہ نہ صرف ان معاملات میں خود مختار ہیں۔ بلکہ ماں باپ کی سرحد حکومت سے باہر بھی اور درحقیقت یہی حالت مصنف کے ماحول کی تھی۔

نصوح اور فہمیدہ نے اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ نعیمہ کے مستقل ارادوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر شکست ہوتا نظر آ رہا تھا۔ کہ صالحہ کا قدم ایک غیبی فرشتہ کی طرح بڑھتا ہے۔ اور وہی نعیمہ کی کشتی کو بے دینی کے سمندر کے تھپیڑوں سے بچا کر ساحل مراد تک پہنچا دیتی ہے۔ صالحہ درحقیقت "محصنات" کے شخصی قصہ عارف کا انسانی مظہر ہے۔ جو کام عارف نے مبتلا کیلئے کیا تھا۔ وہی کام صالحہ نعیمہ کے لئے کرتی ہے۔ حافظ نذیر احمد نے صالحہ کو نعیمہ کا مصلح بنا کر ہم کو فطرت انسانی کا یہ راز بتایا ہے کہ وعظ اور نصیحت جس قدر بے تکلفانہ اور غیر امری طریقہ سے کئے جائیں۔ اسیقدر زیادہ موثر ہوگی۔ اور اس پیشہ کے موزوں سب سے زیادہ دوست احباب ہیں نہ کہ پیشہ ور واعظ و ناصح۔

محمد عبدالقادر سروری

وہ نغمہ جس نے تاج محل کے حسن۔ اورنگ زیب کی عدالت۔ جہانگیری مصوری اور عرفی و نظیری کی شاعری سے ترکیب پائی تھی۔ دلی کے جوانوں میں محض ایک گونج ہو کر رہ گیا تھا۔ اور لکھنؤ والوں نے اس گراموفون کو ریکارڈوں میں قید کر لیا۔ لکھنؤ کی معاشرت محض ایک نقل تھی اور نقل بھی دھندلے نقوش کی۔ لوگ زندگی کی نقل اتارتے تھے اور شاعر شاعری کی نقل اتارنے لگے۔

[illegible]



خوش آمدید

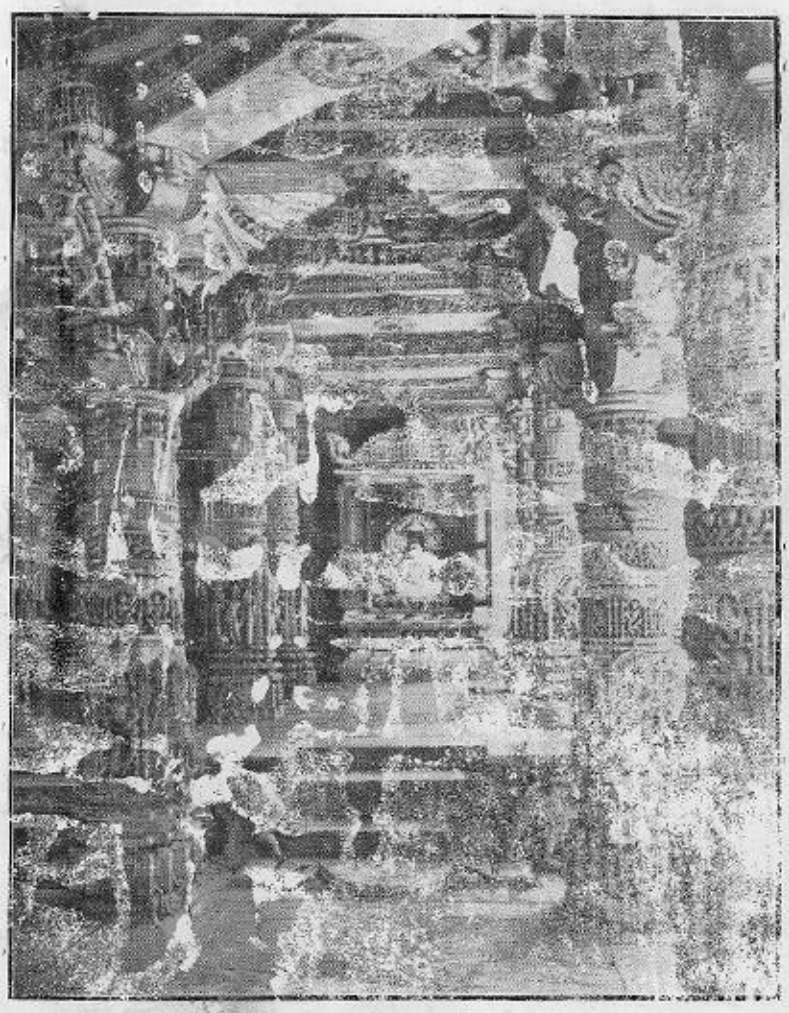

جیلی مندر

بابائے شاعری

فغانی شیرازی

(از جناب پروفیسر محمد علم الدین صاحب سالک بی اے)

یہ یگانۂ فن جس کی ترنم ریزیوں سے فارسی غزل ترقی کے ساتویں آسمان پر پہنچی۔ دارالعلم شیراز میں پیدا ہوا تھا۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ایسی وحید العصر ہستی کے حالات لکھنے میں ہمارے مورخین اور تذکرہ نگاروں نے نہایت بے اعتنائی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنا فرض صرف یہی سمجھ رکھا ہے کہ بابا نے مغفور کے متعلق چند چست فقرے یا کچھ متفی عبارت لکھ دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج اس یکتائے روزگار کی زندگی کے حالات ورطۂ گمنامی میں پڑے پڑے۔ ان رنگین نگار تذکرہ نویسوں کی بدولت تاریکی کا رونا رو رہے ہیں +

فغانی کا باپ شیراز میں جراح تھا۔ اسی پیشہ کی مناسبت سے فغانی نے پہلے پہل اپنا تخلص سکاکی رکھا۔ ابتدائی تعلیم کیونکر حاصل کی اور شاعری میں کس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا؟ اس کے متعلق ہمارے تمام تذکرے خاموش ہیں لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ فغانی نہایت ذہین اور طبّاع تھا +

جب فغانی نے ہوش سنبھالا۔ تو ملک یوسف حسین میرزا کے شعراء کا رنگ غالب تھا۔ اکثر شعراء انہیں کے حلقہ میں غزل کہا کرتے تھے۔ فغانی نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور غزل گوئی میں ایک نیا انداز قائم کر کے اپنا تخلص سکاکی سے فغانی بدل لیا۔ فخر سخن کہتا ہے کہ اس زمانہ میں سات فغانی تھے۔ لیکن فغانی شیرازی ان میں ممتاز تھا۔

گویند[1] دراں وقت ہفت نفر فغانی بر
سر عرصہ بودند و ایں دعوے را زیبا ممتاز بود"

فغانی کی طبیعت نہایت آزاد تھی۔ اس لئے تھوڑا ہی عرصہ بعد اس نے اپنے [illegible] کر ہرات کا رخ کیا۔ ہرات اس زمانہ میں سلطان

[1] [illegible]

حسین میرزا کا دار السلطنت تھا۔ اور اس کی شاہانہ فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں سے شاعری اور علم و فضل کا مرکز بنا ہوا تھا۔ فغانی جب [illegible] لے کر دربار میں پہنچا۔ تو چونکہ اس کا رنگ سب سے الگ تھا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ برخلاف اس کے انہوں نے اس کا تمسخر اڑانا شروع کیا اور اس کے کلام کو اسقدر مہمل اور لغو تصور کیا کہ جب کوئی مسخ شعر پڑھا جاتا تو کہتے کہ

"ایں[2] فغانیہ است"

فخر المتاخرین مولانا جامی اس زمانہ میں [illegible] بابائے مغفور ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ لیکن قدر دانی کا روادار نہ دیکھ کر [illegible] پوری سنجیدگی۔ فغانی کا دل اس ناقدری سے ٹوٹ تو گیا ہوگا۔ مگر ہمت نے پھر دھاس بندھائی اور وہ تبریز کے ارادے سے چل نکلا۔ تبریز اس زمانہ میں سلطان یعقوب المتوفی ۸۹۶ھ کے زیر نگیں تھا۔ اس نے بابائے مبرور کی بہت قدر کی۔ چنانچہ مذکور ہے کہ سلطان یعقوب شاہ نے اسے اپنے ندمائے خاص میں داخل کر کے [illegible] کے بلند القاب سے سرفراز کیا

[2] عرفات وحدی ۔
[3] ریاض الشعراء و [illegible]
مجالس المؤمنین قاضی نور اللہ شوستری صفحہ [illegible]
یدبیضاء غلام علی آزاد بلگرامی [illegible]
ہفت اقلیم امین احمد رازی [illegible]
عرفات وحدی (")
تحفۂ سامی بمصنفہ سام میرزا (")
مراۃ الخیال شیر خان لودھی صفحہ [illegible]
فہرست کتب آصفیہ مرتبہ مسٹر رائو بریٹ لائبریرین مولانا ٹونک جلد دوم ۔
فہرست کتب خانہ اودھ مولفہ اسپرنگر ۔ فہرست کتب بانکی پور [illegible]

جب تک سلطان مذکور زندہ رہا۔ بابائے غفائی نے کسی اور درگاہ کا رُخ نہیں کیا۔ سلطان مذکور کی وفات کے بعد وہ ہیرات میں آکر مقیم ہوا۔ وہاں کے حاکم نے اُس کا روزینہ ایک من (سیر) شراب اور ایک من (سیر) گوشت مقرر کر دیا۔ چنانچہ سام میرزا لکھتا ہے کہ

"بعد از وفات پادشاہ مذکور در شہر ہیرات ساکن شدہ۔ حاکم آں دیار ہر روز یک من شراب۔ یک من گوشت جہت او مقرر کردہ بود۔ کہ بادمی دادند"

بابائے مغفور نہایت لاابالی مزاج اور پکے رند تھے۔ شراب کثرت سے پیتے تھے۔ اکثر عمر مے خانوں ہی میں گذری ہے۔ تحفۂ سامی میں مذکور ہے کہ

"بسیار حریص شراب و بدمست بودہ۔ دوام اوقات در میخانہا بسر می برد۔ ۔ ۔

"عجب تر آنکہ تا حال ہموطنان ایں علم بر سر مزارش مجمع شدہ معلومات خود بر یک دیگر عرضہ می دارند و ممکن نیست کہ دراں شہر ایں مجلس در جائے دیگر منعقد شود۔ الخ ایں اثر خالی از غرابتے نیست"۔

اور سچ ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فغانی کی مشہور یادگار ایک دیوان ہے۔ مولانا شبلی مرحوم لکھتے ہیں کہ یہ دیوان ایک ہنگامہ میں ضائع ہو گیا تھا۔ اس پر فغانی نے اپنے بھائی کو خط لکھا کہ جہاں جہاں سے اس کا کلام دستیاب ہو سکے فراہم کیا جائے چنانچہ جگہ جگہ سے تلاش کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا گیا۔ اور یہی آج دنیا میں موجود ہے ؎

دیوان فغانی کے خطی نسخے یورپ کی بہت سی مشہور و معروف لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ برٹش میوزیم میں اس کے دو نہایت عجیب نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ بیٹر و گریڈ کے کتب خانے میں۔ ایک میونخ اور ایک لیڈن میں بھی ہے۔ اور ہندوستان میں تو اس کے عام نسخے دستیاب ہو جاتے ہیں ؎

یہ دیوان قصائد (جو عام طور پر امام موسیٰ رضا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہیں) غزلیات۔ رباعیات۔ مفردات اور مقطعات پر مشتمل ہے ؎

تمام ارباب ذوق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فغانی ایک نئی طرز کا بانی اور فن سخن کا مجتہد ہے۔ چنانچہ والہ داغستانی لکھتا ہے کہ:۔

"بابائے مغفور مجتہد فن تازہ ایست کہ پیش ازو بے احدے بہ آں روش شعر نگفتہ و پایۂ سخنوری را بجائے رسانیدہ کہ عنقائے اندیشہ ہیرامون او نمی تواند پرید۔ اکثر اساتذان زماں مولانا وحشی بزدی مولانا فقیری نیشاپوری و مولانا نعیمی اصفہانی و خواجہ حسین ثنائی و مولانا عرفی شیرازی و حکیم شفائی اصفہانی و حکیم مسیحا رکنا کے کاشی و مولانا محتشم و غیرہم متتبع و مقلد شاگرد خوشہ چین خرمن طرز و روش او بودند" (ریاض الشعراء)

قاضی نور اللہ شوستری اس کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"دیوان غزل او دامنہ عمل خسرو دہلوی را سیاہ ساختہ"۔

(مجالس المومنین ص۵۳۹)

ڈاکٹر اسپرنگر اسے بہترین غزل گو قرار دیتا ہوا "حافظ کوچک" کے نام سے یاد کرتا ہے ؎

نشتر سخن کا فاضل مصنف کہتا ہے کہ "خواجہ حافظ اور سعدی کے بعد وہ ایک نئی طرز کا موجد ہے۔ اور اکثر فصحائے اکابر نے اسکا تتبع کیا ہے"۔

ہفت اقلیم میں مذکور ہے کہ:۔

"پادشاہ ملک سخن رانی و سلطان شہرستان نکتہ دانی بود۔ چہ آں مایہ ذوق و خوبی شوق و شوخی کہ در شہر است در دیوان ہیچ یک سالکان مسالک سخندانی نیست و در فنون اشعار خصوص غزل و مرثیہ اش بیرون از حد کمال است و کمال پاشنی نکیس افزوں از وہم و خیال"۔ (ہفت اقلیم ورق ۱۶۵ ب)

فغانی کی شاعری کا خاص امتیاز طرز ادا اور اسلوب بیان کی جدت ہے یعنی جو بات وہ کہنی چاہتا ہے۔ اسے ہیچ دلکش کہتا ہے۔ اور اس پیچیدگی کی وجہ سے وہ ایک وسیع مضمون کو جو کئی شعروں میں بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک شعر میں ادا کرتا ہے۔ بسا اوقات یہ پیچیدگی کسی دور از کار تشبیہ مبالغہ یا استعارہ (جس سے عوام الناس کے کان نا آشنا ہوتے ہیں) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

اے کہ میگونی چرا جانے بجامے می دہی
ایں سخن با ساقیٔ ما گو کہ ارزاں کردہ است

اس شعر میں طرز ادا کی جدت خاص طور پر قابل داد ہے۔ معترض کا اعتراض ہے کہ شراب ایسی کونسی چیز ہے جس کے عوض میں جان تک دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ لیکن فغانی نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے کہ تم شراب پر جان کیوں دیتے ہو۔ شرابی شراب کی لذت اندوزی پر اتنا فریفتہ اور گرویدہ ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ تم شراب اتنی ارزاں کیوں خریدتے ہو۔ اس کی قیمت تو جان سے بڑھ کر کوئی چیز ہونی چاہئے۔ جس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ میں کیا کروں۔ یہ سوال تو نہیں ساقی سے کرنا چاہئے جس نے اس کی قیمت اتنی گھٹا رکھی ہے

اے کہ بخجو سر نہی پیش صراحی ہوشیار
کیں بت چینی فراواں خانہ ویراں کردہ است

فغانی کا یہ شعر جو اس کے ذاتی تجربات کا نتیجہ ہے اپنے اندر ایک دنیائے اثر چھپائے بیٹھا ہے۔ اور پیرس کے ہزارہا بلکھوں سے زیادہ فصیح ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے اور اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں کہتا ہے کہ اے وہ شخص جو بخجو ہو کر اپنے آپ کو صراحی کے پاؤں پر گرا رہا ہے۔ ہوشیار ہو اور سمجھ کہ

اس چینی کے کھلونے نے گھروں کے گھر ویران اور تباہ کر دیئے ہیں۔ "بت چینی" کی بندش نے شعر کی خوبی میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

فغانی نے اکثر مضامین کی بنیاد صنعت ایہام پر رکھی ہے۔ مگر اس کے باوجود استعارات کی نزاکت۔ اور تشبیہات کی جدت بھی ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر اس کے خیالات نہایت نازک اور پُر تکلف ہیں۔ اس نے شاعری کا حلقہ وسیع کرنے کے لئے الفاظ کی نئی نئی تراشیں پیدا کی ہیں۔ گو یہ خوبیاں عرفی اور نظیری میں نہایت کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر ان سب کا ابتدا کنندہ فغانی ہی ہے۔ ہم ذیل میں اس کے اشعار کا انتخاب قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتے ہیں:۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

بدگفتن من شد ہنر حاسد منکر — صد شکر کہ عیبم ہنر بے ہنراں است

خراب آں کمر نازکم کہ چوں مہ نو — بہ شیوہ ہائے بلند از میان زیں پیداست

ساقی مدام بادہ باندازہ می دہد — ایں بیخودی گناہ دل زود مست ما

آں کہ ایں نامہ سربستہ نخست است نخست — گرہے سخت بسر رشتۂ مضموں زدہ است

مشکل حکایت است کہ ہر ذرہ عین اوست — اما نمی تواں کہ اشارت بدو کنند

مسیحا یار و خضرش ہمرکاب و ہمعناں یوسف — فغانی شہسوار من بدیں اعجاز می آید

تا می تواں شکست دل دوستاں مخواہ — کیں خانہ را بہ کعبہ مقابل نہادہ اند

اسی مضمون کو کسی اور شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

دل بدست آر کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہ خلیل آذر است — دل گذرگاہ جلیل اکبر است

یک چراغے است دریں زاویہ از پرتو آں — ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

عرفی نے یہی مضمون اپنے خاص انداز میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چراست — از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

بہ بستر افتم و مردن کنم بہانۂ خویش — بدیں بہانہ مگر آورم بخانۂ خویش

بہ روز حشر فغانی ز باز پرس مترس — کہ بے کسی و غریبی ترا کہ می پرسد

تا کے کسے ہزار لب خشک خو کند — خضر رہے کجاست کہ مے در سبو کند
بے نیت درست نمازش درست نیست — منکر اگر ز چشمۂ کوثر وضو کند
منعم بصد امید فشاند درخت گل — غافل کہ فرصتش نگذارد کہ بو کند
آلودہ شراب فغانی بخاک رفت — آہ از ملائکش کفن تازہ بو کند

ہزاراں چارہ ضایع گشت و یک دردم نشد ساکن
کنوں درد دگر از پہلوئے ہر چارۂ دارم

چو شبنم صبحدم گریاں بگلگشت چمن رفتم — نہادم روئے بر روئے گل و از خویشتن رفتم
تو اے گل بعد ازیں با ہر کہ میخواہد دلت بنشیں — کہ من چوں لالہ با داغ جفایت زیں چمن رفتم
دلے می باید و صبرے کہ آید تاب دیدارش — فغانی گر دلے داری تو باش اینجا کہ من رفتم

آخر میں ہم فغانی کی چند غزلیں پیشکش ارباب ذوق کرتے ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کا کلام کسقدر ہمرنگ۔ یکساں اور ہموار ہے ؎

اے سرنامہ نام تو عقل گرہ کشائے را — ذکر تو مطلع غزل عشق سخن سرائے را
آئینہ دار یافتہ یک نظر از جمال تو — دل کہ فروغ می دہد جام جہاں نمائے را
تیغ زبان عارفاں نکتہ گرفتہ و ہم چناں — عشق تو جلوہ می دہد خنجر سر زدائے را
نسخۂ سحر سامری کاغذ توتیا شود — گر بکرشمہ سر دہی نرگس سرمہ سائے را
غایت دستگیریست اینکہ چو طائر حرم — بر سر کعبہ رہ دہی رند برہنہ پائے را
من ز کجا و حالت صوت و سماع صوفیاں — گوش نہادہ ام ہمیں زمزمۂ درائے را
کیست فغانی حزیں مست سیاہ نامۂ
تا بزبان عارفاں وصف کند خدائے را

ولہٗ ایضاً

ساقیا بیدار گرداں چشم خواب آلودہ را — بادہ نوش و نقل کن دلہائے خوں آلودہ را

الا از حد می برد مستی و گل تر دامنی — خیزد در جام شراب انداز مشک سوده را
گر گناہے نیست در مستی ثوابے نیز نیست — اجر چندانے نباشد کار نافرسوده را
آنچه در کنج دو عالم نیست در میخانه هست — تا بخواری ننگری این کهگل فرسوده را
اے صبا مگذر بخاک شور بختان فراق — این نمک بر دل میفشان مردم آسوده را

نامهٔ درد فغانی قابل تحریر نیست
بهر این بیت العمل ضایع مکن آن دوده را

ولہ ایضاً

بسوئے من نظر لطف نیست ماه مرا — هنوز آن غرور است کج کلاه مرا
هزار پارهٔ الماس از دلم سر زد — اثر هنوز نه پیدست برق آه مرا
سحر که از جگر خسته خواست طوفانے — که راه خانه غلط گشت خضر راه مرا
که بر فشانده قبا بر من جراحت ناک — که کرد نافهٔ چین ریخت تکیه گاه مرا
لب تو نام من از لوح زندگانی برد — بهر بهانه قلم زد خط گناه مرا
فرشته وار ز پیش جنازه ام بگذر — بآب خضر بشو نامهٔ سیاه مرا

ولہ ایضاً

نه هوائے باغ سازد نه کنار کشت ما را — تو بهر کجا که باشی بود آن بهشت ما را
نه نهد رو بکویت چه کنم چرا نسوزم — بتو گل زنند بر سر نزنند خشت ما را
چو تو کافرے ندیده بفراق رفت عمرے — که نبود هیچ در دل هوس کنشت ما را
بگل فسردهٔ ما نرسید ابر رحمت — چه امید خیر باشد ز چنین سرشت ما را
همه وقت بود ما را دل پاک و جان آگه — غم عاشقی در آمد که بخود نشست ما را

تو بدی مبر فغانی بکسے گمان تهمت
که گواه حال خود شد حرکات شست ما را

ولہ ایضاً

دل از نظارهٔ آن گلعذار گلشنست امشب
چراغ از روغن بادام چشم روشنست امشب
سپندم خوشهٔ پروین و شمع مهر همزانو
مه نو پاسبان و زهره ام چوبک زنست امشب
دو عالم هست لیکن زهرهٔ بوس و کنارم نیست
گلم در خوابگاه و خار در پیرامنست امشب
گذشت از کاوکاو غمزه سیل خونم از دیده
بچشم آن که مژگان بود گویا سوزنست امشب
گل افشانی چشمم بین که باز از گریهٔ شادی
برم از ارغوان و لاله خرمن خرمنست امشب
دل صد پاره ام کز برق دیدارست در آتش
نه مشت پارهٔ الماس کوه آهنست امشب
چنان مغرور حسن یوسف خوشم که از مستی
اگرچه سوزن عیسیست خار دامنست امشب
سپند آتش خویشم مبادا بنگرد چشمے
ز بخت نیم بیدار آنچه در دست منست امشب
فغانی قصه دیگر ساز تا روشن نگردانے
که با دیوانه مهتابی مقیم گلخنست امشب

ولہ ایضاً

بادهٔ صافم خلاص از آب حیوان کرده است
فتوائے پیر مغان کار من آسان کرده است
بارها دل باز می آرم ز دام مے فروش
تا نگه کردم که خود را چه پشیمان کرده است
اینکه می گوئی چرا جانے بجامے می دهی
این سخن با ساقی من گو که ارزان کرده است
چون بیک ساغر فشاند آتش دل اے کلیم
بے سرانجامے که در خمخانه طوفان کرده است
اے که بیخود سر نهی پیش صراحی هوشیار
کین بت چینی فراوان خانه ویران کرده است
قائلم بر وعدهٔ فردا که در تعبیر آن
هست تاثیرے که کافر را مسلمان کرده است
مستی و عشق فغانی همچو بوئے مشک و مے
نیست پنهان شمهٔ هر چند پنهان کرده است

(جملہ حقوق محفوظ)

(مرسلہ محمد عبداللہ قریشی)

دسمبر ۱۹۲۸ء

پیامِ محبت

میں جب اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو جو دل سوز واقعہ میرے دماغ میں ہمیشہ جاگزین نظر آتا ہے۔ وہ رقیہ کی موت کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو کئی برس گزر گئے لیکن اُس کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ وہ تمام مصائب جو انسان کو زندگی میں داخل ہونے پر قدم قدم پر درپیش آتے ہیں وہ تمام تفکرات جن سے نوعمری معمور پڑی ہے۔ اُس یاد کو اب تک بھلا نہ سکے۔ اب جبکہ میری آزادی و بے فکری کا ایک حد تک خاتمہ ہو گیا۔ اب بھی میں گھنٹوں رقیہ کی موت پر اور موت سے پہلے اُس کے پیام پر سوچا کرتا ہوں +

اس واقعہ کے بعد سے میری روح کی لامحدود طیران رُک گئی قلب کی ترقی کا دور ختم ہو گیا۔ اور دماغی ترقی کا زمانہ آ گیا۔ وہ شاعری جو میری روح کا جزو لاینفک بن گئی تھی۔ اب ختم ہو گئی۔ تخیل کی پرواز بند ہو گئی +

رقیہ کی موت سے میں نے کیا سیکھا۔ آہ۔ اس کا صرف ایک جواب ہے۔ "احساس حیات" وہ آگ جو میرے اندر فطرت نے دبا رکھی تھی اُس سے شعلے اُٹھنے لگے۔ محبت کا وہ دریا جو خاموشی سے زیر زمین بہہ رہا تھا۔ اب اُس میں جوش آ گیا۔ اُبل پڑا۔ اُس میں طوفان آ گیا۔ لہریں اُٹھنے لگیں۔ میرا تخیل جو اب تک دماغ کے قید خانہ میں جکڑا ہوا تھا۔ اب لامحدود فضا میں پرواز کرنے لگا۔ شاعری کی دیویاں آئیں اور میرے سر پر تاج شاعری رکھ گئیں۔ یہ سب کیوں۔ اس لئے کہ میں نے وہ احساس محسوس کیا جو اپنی زندگی میں ہر انسان موت کی طرح محسوس کرتا ہے +

محبت کرنا!

کتنا پیارا لفظ ہے اور کتنا خوفناک!

محبت کرنا۔ آہ۔ پیارے کبھی تم نے بھی محبت کی ہے؟ اگر نہیں کی تو اب کر تو۔ مجھے یاد ہے۔ میری وہ خواہش دلی مجھے یاد ہے "محبت کرنا کسے کہتے ہیں؟" میں نے کتنی بار اپنے دل سے پوچھا تھا۔ کتنی مرتبہ میں نے محبت کی دیوی کی ملاقات سے مایوس ہو کر محبت کو مہمل قرار دے دیا۔ میرے دل میں تاریکی تھی لیکن جب یکایک محبت کا آفتاب طلوع ہوا۔ اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ جب اُس نے رفتہ رفتہ میرے دل کو منور کر دیا۔ یکایک میری آنکھ کھلی۔ میرا احساس خوابیدہ جاگ اُٹھا۔ اور تب؟ تب کچھ نہ پوچھو۔ ہر جگہ نور ہی نور تھا۔ ہر طرف زندگی ہی زندگی تھی۔ پیارے اگر تم نے محبت نہیں کی تو اب کر لو!

کسی نے پوچھا مجھ سے "کبھی تم نے محبت کی ہے؟" تو میں مسکرا دیتا تھا۔ میں مذاق کر کے کہتا تھا "آپ سکھلائیے تو سیکھوں" تب میری روح سو رہی تھی۔ میرا دل سو رہا تھا۔ میری فطرت، خود میری فطرت سو رہی تھی۔ اب جب میں بیدار ہوں تو محبت کے نام سے تڑپ اُٹھتا ہوں۔ کانپ اُٹھتا ہوں۔ یہ غفلت۔ یہ فراموشی۔ میری رقیہ نے مجھ سے کتنا صحیح کہا "پیارے سمجھو۔ اگر تم نے محبت نہیں کی ہے تو اب کر لو" +

وہ ایک فقرہ میرے دل کے لئے کلید طلسم تھا جس سے قلب کا دروازہ کھل گیا۔ مجھے وہ وقت یاد ہے۔ رقیہ سامنے کھڑی تھی۔ شب کے دس گیارہ بجے تھے۔ اگست کا مہینہ تھا۔ نہایت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور ہم باغچہ میں درختوں کے ایک ہجوم کے نیچے کھڑے تھے۔ آسمان تیرہ و تار ہو رہا تھا۔ چند ستارے تھے۔ سو ان کی روشنی بھی پتوں سے چھن چھن کر بہت ہی ہلکی ہو کر کے زمین پر گرتی تھی۔ ہم تاریکی کے سبب ایک دوسرے کا چہرہ نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ہمارے دل دھڑک دھڑک کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے +

شروع شروع میں تو مجھے اس کا خیال تک نہ تھا۔ وہ تو جیسے بجلی چمکتی ہے۔ ویسے ہی اُس اندھیری رات میں ایک محبت کی بجلی چمکی تھی۔ میں رقیہ کے ہاں ایک مہینہ سے اُس کے اور اُس کے بھائی اپنے عزیز ہم کلاس کی شادی میں شرکت کے لئے آیا ہوا تھا۔ میرے عزیز دوست زاہد میں اور مجھ میں خلوص کام کر رہا تھا۔ اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے بلا تکلف مجھے گھر میں آنے جانے کی اجازت دے رکھی تھی +

جب میں اپنے کمرۂ مطالعہ میں (جو میرے عزیز دوست زاہد نے بے حد نوازش کے ساتھ مجھے عنایت کیا تھا) بیٹھا ہوا پڑھتا ہوتا تو رقیہ حد درجہ معصومیت کے ساتھ میرے پیچھے کرسی کے سہارے کھڑی ہو جاتی۔ یا کرسی کے ہاتھوں

پر بیٹھ جاتی اور پوچھتی "بھائی جان کیا پڑھ رہے ہو؟"

ایک روز میں رباعیات عمر خیام کا انگریزی ترجمہ جو تصویروں سے مزین تھا دیکھ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کتاب میرے ہاتھ سے چھین لی اور تصویریں دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "رقیہ تم بہت شریر ہوتی جاتی ہو" وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ کہنے لگی "بھائی جان، تم خفا ہو گئے؟" میرا غصہ (اگر درحقیقت مجھے غصہ آیا بھی تھا) شرمندگی میں بدل گیا۔ میں نے کہا "رقیہ بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں یہ رباعیات سمجھاؤں۔ جن سے بہتر نظمیں کسی انسان نے نہیں لکھیں" کہنے لگی "بخشئے۔ آپ پھر خفا ہو جائیں گے۔ مجھے اس تصویر کے معنی بتائیے" "یہ ایک گلاب کا پھول ہے جو تمہاری ہی طرح مسرخ ہے اور تمہاری ہی طرح خوبصورت جو ہنس ہنس کے کہہ رہا ہے کہ میں اتنا خوبصورت ہوں۔ لیکن ذرا مجھے توڑ لو اور توڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دو۔ کتنی آسانی سے میرا حسن فنا ہو جاتا ہے" وہ سوچ میں پڑ گئی +

کہنے لگی "اگر مجھے بھی کوئی اس پھول کی طرح توڑ لے اور توڑ کر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دے!" کتنا گہرا خیال تھا۔ وہ بالکل پھول تھی۔ نہ صرف رنگ میں۔ نہ صرف حسن میں۔ بلکہ احساس میں بھی۔ پھر اس کے بعد میں نے اسے کبھی ہنستے ہوئے نہ دیکھا۔ وہ بڑی دیر تک ایک آرام کرسی پر پڑی سوچتی رہی۔ اور آخر افسردگی کے عالم میں اٹھ کر چلی گئی۔ میں اس تمام دوران میں اس کے چہرہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمکتی ہوئی معصوم پتلیاں حرکت کر رہی تھیں جیسے رحم کی طالبگار تھیں۔ میں اس سے مرعوب ہو رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ اور آخر کار وہ چلی گئی۔ غرق فکر میں بھی کچھ کم سوچ میں نہ تھا +

جب میں اس سے درختوں کے ہجوم کے نیچے ملا ہوں۔ اس وقت میں اپنی شب کی چہل قدمی میں مصروف تھا۔ دوسرے روز رقیہ کی شادی ہونے والی تھی۔ آج اس کے بھائی کی شادی ہو گئی تھی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر سیر میں مصروف تھا کہ رقیہ کے پاؤں کی آہٹ پا کر چونک پڑا۔ وہ چپکے چپکے کہنے لگی "میں نے معلوم کر لیا ہے کہ میں آپ سے محبت کر سکتی ہوں" میں متحیر ہو گیا کہ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ ایک خوبصورت مالدار تعلیم یافتہ آدمی کے ساتھ۔ اور وہ مجھ سے کہہ رہی تھی "میں نے معلوم کر لیا ہے۔ میری محبت آپ کے ساتھ ناجائز نہیں ہے۔ میں نے خالہ جان سے پوچھا "خالہ، بھائی جان کے ساتھ شادی ہو سکتی ہے یا نہیں؟" انہوں نے کہا "توبہ کرو، کیا کہتی ہو" میں فکر میں پڑ گئی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ آپ میرے حقیقی بھائی نہیں۔ میری آپ کے ساتھ شادی ہو سکتی ہے۔ میں نے اتنا تو خالہ جان سے بھی کہہ دیا۔ وہ بیچاری ڈر گئیں کہ میں حواس میں نہیں ہوں۔ وہ مجھے تنہا ایسی ایسی باتیں کہنے کے لئے چھوڑ کر بھاگ گئیں"+

اب اس کی آنکھیں سے آنسو گرنے لگے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے بہت سے دل ہلا دینے والے مناظر دیکھے اور سنے ہیں۔ لیکن جس وقت بے کسی اور بے بسی کا مرقع بنی ہوئی آنسوؤں کے قطرے برسا رہی تھی۔ تو میرا دل ہل گیا۔ وہ کہنے لگی۔ (اور اس میں کتنی قوت آ گئی تھی) "ہاں میں جانتی ہوں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ میری کل ہونے والی شادی کا خیال کر رہے ہیں۔ میں نے کبھی ہونے والے شوہر سے محبت نہیں کی۔ میں انہیں نہیں جانتی۔ میں آپ کے ساتھ محبت کرتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ رہ سکتی ہوں اور بس کسی اور شخص کے لئے میرے دل میں ذرہ بھر گنجائش نہیں" میں نے ملامت کی۔ کہا "رقیہ، ایسی باتیں مت کہو۔ کل تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ اپنے آئندہ شوہر کے ساتھ وفا کا خیال کرو۔ میرا خیال دل سے نکال دو" وہ رو پڑی۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "پیارے کبھی تم نے بھی محبت کی ہے۔ اگر نہیں کی تو اب کرو" وہ اپنی نسوانیت کے باوجود میری مردانیت پر غالب آ گئی۔ میں مسحور ہو گیا۔ اخلاق و مذہب بیکار ہو گئے+

یکایک ماہتاب بڑی تیزی سے نکل آیا۔ ساری فضا منور ہو گئی۔ عالم پر ایک ملکوتیت ایک الوہیت طاری ہو گئی۔ آہ محبت، محبت، تو دلوں کو ہی نہیں۔ ساری کائنات کو منور کرنے کی طاقت رکھتی ہے +

بڑی دیر تک جیسے سکت نہ رہی۔ ہم کھڑے رہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ میں نے رومال نکالا۔ اس کے رخسار پونچھے۔ اور نرمی سے اس کا سر اپنے سینہ پر لیکر چند شفقت بھرے اور حوصلہ افزا الفاظ کہے۔ وہ منہ ہی منہ میں کہنے لگی "۔۔۔۔۔ میں مر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں میں مر رہی ہوں۔ میں یہ بوجھ نہیں برداشت کر سکتی جو کل میرے سر پر لادا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ میں مر رہی ہوں" اب میں ٹوٹ گیا میری روح شکست ہو گئی۔ میں نے آنسوؤں کو پی کر کہا "رقیہ ایسی باتیں مت کرو۔ ہماری محبت پاک ہے۔ اور خدا پاکوں کا نگہبان ہے" اس نے روک دیا اس کی آواز میں ایک قوت تھی۔ جو سب پر غالب تھی جس کو میں رد کرنے کے

ناقابل تھا۔ اُس نے کہا مت کوشش کرو۔ میرے پاس خدا کی طلبی ہے۔ نکاح ایک آسمانی رشتہ ہے۔ جب مجھے خبر ہی نہیں کہ آسمانی رشتہ کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اب میں مرجاؤں گی۔" اتنا کہہ کے وہ چلی گئی +

چلی گئی اور مرگئی۔ صبح کو سب اُٹھے تو ہونے والی دُلہن کے کمرے میں گئے۔ تو وہ سرد ہوچکی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ اطمینان سے بغیر کسی کرب و تکلیف کے مری تھی۔ محبت کی رفاقت میں سب مصائب نے ایذا دہی چھوڑ دی۔ اور اُس نے سکون و اطمینان سے اپنی روح محبت کے سپرد کی تھی

وہ مجھے بیدار کرکے چلی گئی۔ میری روح کو جگا کے چلی گئی۔ اب میرے سامنے کیا ہے۔ محبت کے آفتاب کی کڑی دھوپ ہے۔ جس کو برداشت کرنے کی مجھ میں قوت نہیں۔ لیکن اتنا میں محسوس کرتا ہوں کہ اب تک میری زندگی خوابیدہ تھی۔ اب بیدار ہوگئی۔ اب تک میری زندگی نامکمل تھی۔ اب تک اُس میں محبت کے ہیجانات کی آمیزش نہ ہوئی تھی۔ اب ہوگئی۔ میری فطرت میں محبت کا جوہر ڈال دیا گیا +

محبت کرنا! کتنا پیارا لفظ ہے اور کتنا خوفناک +
پیارے کبھی تم نے بھی محبت کی ہے۔ اگر نہیں کی تو اب کرلو!!

احسن الظفر۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

والکینو

کوہ آتش فشاں کی شرر افشانی خالق مطلق کی بے مثل قدرت کو کچھ عجیب ہی عظمت و شان سے ظاہر کرتی ہے۔ انگریزی زبان میں کوہ آتش فشاں کو والکینو VALCAND کہتے ہیں۔ اولاً یہ لفظ کوہ اٹنا ETNA اور جزائر لیپاری LEPARI کے لئے استعمال ہوا تھا +

جس طرح اکثر مقامات پر ہندو لوہار اور برہمنی وغیرہ پیشہ ور ایک دیوتا بس کرما کو مانتے ہیں۔ اسیطرح انجیل کی کتاب آفرینش کے باب چہارم کی بائیسویں سطر میں بس کرما جیسے ایک شخص کا ذکر ہے۔ جو لوہے اور پیتل کے کاریگروں کا اُستاد تھا۔ اُسکو ٹیوبل کین TAB ALCAIN کہتے تھے۔ تو ماجس کی نقل زناب باری کے پہچاننے سے عاری تھی۔ جب اُنہوں نے کوہ آتش فشاں کو دیکھا تو اُس معلم کاریگران کو اُس کارخانہ کا سبب قرار دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معلم کاریگران ضروری آلات آسمان کے باشندوں کے لئے تیار کر رہا ہے۔ شعلہ دھواں۔ خاکستر سب اُسی کی کرشمہ سازی ہے۔ اس وجہ سے اُنہوں نے ٹیوبل کین سے ملتا جلتا بولکینو BALCANO نام رکھا۔ اور یہی لفظ زبانوں پر کثرت سے آتے آتے والکینو ہوگیا۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ٹیوبل کین کی اولاد جو اُس کارخانہ میں کام کرتے تھے کشیدہ قامت تھی۔ جس طرح سندباد جہازی کے سفرنامہ میں ایک مردم خوار حبشی کی ایک آنکھ پیشانی پر بتائی گئی تھی۔ ویسی ایک آنکھ اُس معلم کی اولاد کی پیشانی پر بیان کی جاتی تھی۔ اٹلی کے مشہور شاعر ورجل VIRGIL نے اپنی نظم (ANCID) اینڈ میں اس کا ذکر نہایت پُرشوکت الفاظ میں کیا ہے۔ بعد میں ڈرائیڈن DRYDEN) ایک انگریزی شاعر نے بھی اس نظم کا ترجمہ نہایت پُرزور اور جوشیلے الفاظ میں کرکے خوب ہی داد سخن دی ہے۔ اگر خیال میں کوہ آتش فشاں کی تصویر کھینچی جائے۔ تو یہی کہا جائیگا کہ دھوئیں کے دَل بادل اور شعلہ کی وسیع چادریں نکل رہی ہیں +

بشیر حسین خاں



تائیس

رومان از اناطول فرانس

اوپیرا از موسیو گیلے

مترجمہ

حضرت پطرس ایم اے



صحرا کا منظر



بازار کا منظر

تائیس

(حضرت پطرس کے قلم سے)

باب اوّل

پہلا منظر

[صحرائے تھیبس۔ دریائے نیل کے کنارے سبزہ سمیت راہبوں کی جھونپڑیاں +
ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا +
بارہ راہب ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہیں۔ ان کے بیچ میں بوڑھا پالیمون اس غریبانہ طعام کی صدارت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ جو میز پر چُنا ہے +
ایک جگہ خالی ہے جہاں اتانیل کو بیٹھنا تھا]

ایک راہب - یہ روٹی رکھی ہے +

دوسرا - اور یہ نمک ہے +

تیسرا - اور یہ پودینہ ہے +

چوتھا - اور یہ شہد ہے +

پانچواں - اور یہ پانی ہے +

پالیمون - (کھڑا ہو کر بڑے جوش کے ساتھ) آسمان سے ہر صبح شبنم کی طرح میرے بابرکت پر نزول ہوتا ہے۔ آؤ اس خداوند کی ستائش کریں جو ہمیں نعمتیں بخشتا ہے۔ آؤ اس کے حضور میں دعا مانگیں۔ کہ وہ ہمیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھے +

راہب (بہت نرم آواز سے) اے خدا جہنم کے شیاطین ہمارے رستے سے دور ہو جائیں +

[راہب چپ چاپ کھانا کھاتے ہیں]

ایک راہب (مہر سکوت توڑ کر) اے خداوند۔ ہمارے بھائی اتانیل پر اپنا روئے قوت پھیلا شفا رکھ!

بہت سے راہب - (افسوسناک لہجے میں) اتانیل!

چند اور راہب - (اسی لہجے میں) کتنا عرصہ گذر چکا اور وہ ابھی واپس نہیں لوٹا!

دوسرے راہب - مگر وہ کب واپس آئیگا؟

پالیمون - (جیسے کسی راز کو چھپا رہا ہو) اس کی واپسی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں نے کل رات اُسے خواب میں دیکھا۔ اُس کے قدم تیز تیز اُٹھ رہے تھے۔ اور وہ ہماری طرف آ رہا تھا +

راہب - (خوش کے ساتھ) اتانیل خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔
(فکر سے کہجے میں) وہ خواب میں جلوہ نما ہوتا ہے +
[اتانیل داخل ہوتا ہے۔ اور بہت آہستہ آہستہ قریب آتا ہے۔
جیسے غم اور دکھ سے چور چور ہے]

راہب - (ادب کے ساتھ) وہ آ گیا! وہ آ گیا!

اتانیل (درمیان میں کھڑا ہو کر بمقوم آواز میں) تم پر سلام ہو!

پالیمون اور راہب - بھائی تم پر سلام ہو! (سب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں) تم بہت ماندہ ہو۔ تمہارا چہرہ غبار آلود ہے۔ آرام کرو۔ اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ کچھ کھا لو۔ کچھ پی لو۔

[اتانیل غمزدہ انداز میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور آہستہ سے کھانے کو اپنے سامنے سے ہٹا دیتا ہے]

اتانیل - نہیں میرا دل ناکامی سے لبریز ہے۔ میں الم زدہ اور دل شکستہ ہوں۔ تمام شہر معصیت کے چنگل میں ہے۔ ایک عورت تمام بنی حیاء کاری اور ریا موزی کا جال پھیلا رکھا ہے۔ اور اُس کے ہاتھ سے جہنم نئی نوع انسان پر حکومت کر رہا ہے +

راہب - (معصومیت اور سادگی کے انداز میں) یہ تائیس کون ہے؟

۱؎ تائیس میں اس کیریکٹر کا نام فیتوس ہے۔ ویبر انس نے فیتوس کے نام کو بدل کر اپنے ناول کا نام رکھا ہے۔

اتانئیل۔ (تھوڑی دیر کے لئے جیسے خواب سے بیدار ہوتا ہے اور پھر وہ سب جانتا ہے) معبد و نیس کی ایک آبرو باختہ بجارن! (عجز کے لہجے میں اور نرم آواز سے جیسے کسی گئے گزرے زمانے کے واقعات دہرا رہا ہو) افسوس اُس وقت جب میں کم عمر تھا۔ اس سے بیشتر کہ میری روح پر رحمتِ خداوندی کا نزول ہوا۔ میں اسے جانتا تھا اگھڑاہٹ کے عالم میں) ایک دن..... اور میں اعتراف کرتا ہوں۔ اور نادم ہوں..... میں اُس کے لعنتی دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ لیکن خدا نے مجھے اس فحبہ سے بچا لیا۔ اور صحرا میں مجھے اطمینانِ قلب عطا فرمایا۔ جہاں میں نے اس گناہ سے کنارہ کشی اختیار کی۔ جو شاید مجھ سے سرزد ہو جاتا۔ آہ میری روح میں ایک تلاطم ہے۔ تانیس کی حیا سوزی اور تباہکاری سے میرا دل خون ہے۔ تمنا ہے کہ میں اس عورت کی روح کو خدا کے نام پر منفتوح کروں +

پالیموں۔ (نرمی کے ساتھ دانشمندانہ انداز میں)۔ میرے بیٹے۔ ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار ہو عقلِ ابدی نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے ——— رات ہو رہی ہے۔ آؤ دعا مانگیں اور سو جائیں +

(راہب پُراسرار ہیبت اور تقدس کے انداز میں دست بستہ سر جھکائے ہوئے ایک ایک کر کے دعا مانگتے ہوئے اپنی اپنی چھونپڑیوں کو چلے جاتے ہیں)

پالیموں۔ اے خدا جہنم کے سیاہ شیاطین ہمارے رستے سے دور ہٹ جائیں اے خدا ہمارے رزق اور پانی کو برکت دے! اے خدا ہمارے باغیچوں کے پھلوں پر اپنی رحمت نازل کر! ہمیں دو نیند نصیب کر جسے بدخوابی برہم نہ کرے۔ اور وہ آرام عطا فرما جس میں کوئی کھٹکا نہ ہو!

(اندھیری رات میں سکون اور خاموشی کے ایک لمحے کے بعد تاریکی کے درمیان ایک روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے روشنی کی اس دھند میں سکندریہ کے تھیٹر کا اندرونی حصہ دکھائی دیتا ہے۔ نیچوں پر ہزارہا لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے ایک سٹیج ہے۔ جس پر تانیس نیم برہنہ لیکن نقاب پوش افروڈائٹی کے عشقیہ جذبات کو حرکاتِ رقص سے ادا کر رہی ہے۔ تماشائی بلند آہنگی کے ساتھ داد دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تمام آوازیں یوں سنائی دیتی ہیں۔ جیسے بہت دور سے آ رہی ہوں۔ تانیس کا نام اس ہجوم میں ہر شخص کی زبان پر ہے لیکن کانوں تک بہت مدھم ہو کر پہنچتا ہے۔ شور، ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے اور تانیس کی حرکات اور بھی پُرمعنی ہوتی جاتی ہیں۔ پھر یہ تمام منظر فتہ فتہ غائب ہو جاتا ہے +

——— دن بھی آتا ہے +)

اتانئیل۔ (آہستہ آہستہ خواب سے بیدار ہو کر یک لخت اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی آواز غصے اور رنج سے بھری ہے) شرم! شرم! قہر! ابدی تاریکی! خداوند میری مدد کر! (سجدے میں گر جاتا ہے) اے خداوند اے خدائے ذوالجلال جس نے ہماری روح اور ہمارے دل میں رحم ڈالا۔ تعریف تجھی کو ہے! میں اس خواب کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ میں ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤنگا (جوش سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) میں اس عورت کو گناہ سے نجات دلواؤنگا۔ میں اسے نفس کے بندھنوں سے آزاد کراؤنگا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان کے ماتم زدہ فرشتے اس کی طرف جھک رہے ہیں اے خدا کیا وہ تیرے ہی مبارک دھن کا ایک سانس نہیں؟ اس کا گناہ جسقدر تاریک ہو۔ اُتنا ہی رحم کا سزاوار ہے۔ لیکن میں اسے بچاؤنگا۔ اسے میرے حوالے کر دے۔ اور اے خداوند پھر میں اسے تیری نذر کر دونگا۔ تاکہ اسے حیاتِ ابدی نصیب ہو۔ (راہبوں کو بُلاتا ہے جو اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں) اے بھائیو! سب کے سب اُٹھ کھڑے ہو۔ آؤ مجھے غیب کی طرف سے اشارہ ہوا ہے۔ مجھے پھر اس ملعون شہر کی طرف لوٹنا ہے۔ خدا نہ کرے۔ کہ تانیس گناہ کے سمندر میں اُتر بھی ڈوب جائے۔ خدا نے مجھے منتخب کیا ہے۔ کہ میں تانیس کو اُس کے پاس واپس لے آؤں +

(اتانئیل پالیموں کے سامنے سر جھکاتا ہے)

پالیموں۔ (نہایت پُرسکون لہجے میں نرمی کے ساتھ ملامت کرتے ہوئے) میرے بیٹے! ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ عقلِ ابدی نے ہمیں یہی سبق سکھایا ہے +

(راہب اتانئیل کے ساتھ ساتھ سڑک تک جاتے ہیں۔ اور پھر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اتانئیل کی دعاؤں کو دُہراتے ہیں جس کی آواز صحرائے خیبس کی تنہائیوں میں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے)

اتانئیل کی آواز (دور سے) نور اور رحمت کی مقدس رُوح۔ میرے دل کو تقویت دے!

راہب - اس کے دل کو تقویت دے!

اتانیئل کی آواز - (بہت دور سے) اور مجھے معلم الملکوت کی سی طاقت دے - تاکہ میں بدی کی چالوں کا مقابلہ کروں!

راہب - اور اسے معلم الملکوت کی سی طاقت دے - تاکہ وہ بدی کی چالوں کا مقابلہ کرے!

[مکمل خاموشی - پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے]

باب اوّل

دوسرا منظر

[سکندریہ -
نسیس کے گھر کے باہر کا چبوترہ - اس پاس بڑے بڑے سایہ دار درخت ہیں +

چبوترہ پر سے شہر اور سمندر کا منظر دکھائی دے رہا ہے - دائیں طرف بھاری بھاری پردے لٹک رہے ہیں - ان کے پیچھے ایک عالی شان ایوان ہے - جو ضیافت کے لئے آراستہ ہے +

اتانیئل آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے اور پیچھے کو گھم جاتا ہے +

ایک غلام اسے دیکھ کر آگے کھڑا ہوتا ہے - اور اسکی طرف بڑھتا ہے]

غلام - اے فقیر یہاں سے دور ہو جا - اور کہیں اور جا کر بھیک مانگ - میرا آقا تم جیسے کتوں کو پاس نہیں آنے دیتا +

اتانیئل - (نرمی کے ساتھ) میرے بیٹے - اگر تیری نافرمانی کا موجب نہ ہو تو میرا کہا مان - میں تیرے آقا کا دوست ہوں - اور اس سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں +

غلام - بھاگ یہاں سے دور ہو جا + (اتانیئل پر اپنا عصا اٹھاتا ہے)

اتانیئل - (نرم لہجے میں مگر رعب کیساتھ) مجھے مارنا مت مارو - لیکن اپنے آقا کو میرے آنے کی اطلاع کر دو - جاؤ!

[اتانیئل کی پُر وقار نگاہ کی تاب نہ لا کر غلام پیچھے ہٹ جاتا ہے - جھک کر سلام کرتا ہے - اور پھر گھر میں غائب ہو جاتا ہے]

[اتانیئل تنہائی میں تھوڑی دیر کے لئے چبوترے پر سے سامنے پھیلے ہوئے منظر کو غور سے دیکھتا رہتا ہے]

اتانیئل - بدکار شہر! ——— خدا کی پناہ! - سکندریہ! جہاں میں گناہ میں پیدا ہوا - وہ رنگیلی فضا جہاں میں نے عشرت کی بے پناہ خوشبو میں سانس لیا ہوس انگیز سمندر جہاں میں نے زرّیں جسم بحری نازنیں کا ترنم سنا - ہاں یہی میرے نفلی نفس کا گہوارہ تھا - سکندریہ! میرا گہوارہ! میرا وطن! سکندریہ - میں نے تیرے عشق سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے - مجھے تیرے زر و دولت سے - تیرے علم و فن سے - تیرے حسن سے نفرت ہے! میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں! ——— اور تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں - تجھے میں اس عبادت گاہ کی طرح ملعون سمجھتا ہوں - جہاں ناپاک ارواح نے اپنا بسیرا کیا ہو - آسمانی ہوا کے جھونکو - جنّت کے فرشتو - آؤ - اور اپنے پروں کی جنبش سے اس زہر آلود فضا کو جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئی معطر بنا دو +

[آوازیں اور قہقہے سنائی دیتے ہیں - تھوڑی دیر بعد نسیس کروتیل اور مرتال دو حسین لونڈیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے داخل ہوتا ہے
اتانیئل کو دیکھ کر رُک جاتا ہے - اور لونڈیوں کو چھوڑ کر اپنے دونو بازو پھیلائے تپاک کے ساتھ اتانیئل کی طرف بڑھتا ہے]

نسیس - (گرمجوشی کے ساتھ) اتانیئل تم ہو؟ - میرے مکتب کے رفیق میرے دوست - میرے بھائی - ہاں میں تمہیں پہچانتا ہوں - گو تمہاری صورت اب انسانوں کی نسبت حیوانوں سے زیادہ مشابہ ہے - آؤ - آؤ - مجھ سے بغلگیر ہو جاؤ - تم صحرا کو خیرباد کہہ آئے ہو؟ تم پھر ہم میں شامل ہونے آرہے ہو؟

اتانیئل - نسیس تم اس رقاصہ نائیس کو جانتے ہو؟

نسیس - (ہنسکر) یقیناً میں اسے جانتا ہوں صرف جانتا ہی نہیں بلکہ وہ میری ہے - صرف ایک اوڑدن کے لئے - میں نے اپنے تاکستان اس کی خاطر بیچ ڈالے - اپنے تاکستان اور اپنی زمینیں اور اپنی چکیاں - اور اس کی خاطر میں نے قصیدوں کے تین دیوان مرتب کئے - لیکن یہ سب کچھ بے سود تھا - اس کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے میری انتہائی کوشش بھی لاحاصل ہیں - اس کا عشق خواب کی مانند نازک اور جلد غائب ہو جانے والا ہے - اتانیئل تم کو اس سے کیا کام ہے؟

اتانیئل - میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں +

نسیس - (کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے) میرے سادہ لوح دوست - وہ دنیس کی

پجارن ہے۔ وینس کے قہر کو مت جگاؤ +

اتانیئل - میں اس کے قدم خدا کے رستے پر ڈالنے آیا ہوں۔ جانسیس۔ میں تانیس کو اس ناپاک محبت سے چھڑا کر لے جاؤنگا میں ایسے یسوع مسیح کی دلہن بناؤں گا۔ اور وہ اپنی زندگی راہب خانے میں بسر کریگی تانیس آج میرے ساتھ جائے گی +

نسیس - (اتانیئل کے کان میں۔ ہنسکر) وینس کے قہر کو مت جگاؤ۔ وہ انتقام لیگی +

اتانیئل - خدا میرا نگہبان ہوگا۔ (ایک لمحے کے بعد) اس عورت سے میں کہاں مل سکتا ہوں؟

نسیس - یہیں پر۔ آج وہ میرے دسترخوان کی زینت ہوگی۔ آج آخری دفعہ۔ وہ اس نشاط پرست محفل کی رونق ہوگی۔ آج رات وہ تھیٹر میں رقص کر رہی ہے۔ اور وہاں سے سیدھی یہاں آئیگی +

اتانیئل - اے دوست مجھے ایشیائی لباس پہننے کو دو۔ تاکہ میں اس ضیافت کے شایاں نظر آؤں +

نسیس - اے نازنینو۔ کروبیل اور مرتال۔ جلدی کرو اور اتانیئل کو لباس پہنادو +

[نسیس اور اتانیئل رفیقانہ گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مرتال تالی بجاتی ہے۔ ایک خدمتگار حاضر ہوتا ہے۔ اور مرتال کا حکم پاکر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد غلام ایک صندوق اٹھائے داخل ہوتے ہیں جس میں سے کروبیل اور مرتال اتانیئل کے لئے سنگھار کا سامان نکالتی ہیں۔ ایک چمکدار نقرئی آئینہ اتانیئل کو دکھاتی ہیں۔ اور نسیس دیتی ہیں۔ اتانیئل اسی طرح بیٹھا نسیس سے باتیں کرتا رہتا ہے لونڈیاں اس کے بالوں کو خوشبودار تیل لگاتی ہیں۔ اور اس کے سر اور ڈاڑھی کو کنگھی کرتی ہیں نسیس مسکرا مسکرا کر اتانیئل کو دیکھتا رہتا ہے]

نسیس - اب میں ایک بار پھر تمہیں ویسا ہی آراستہ دیکھونگا۔ جیسے کبھی پہلے دیکھا کرتا تھا +

اتانیئل - ہاں میں جہنم کا مقابلہ کرنے کے لئے جہنم ہی کے ہتھیاروں سے سجونگا +

نسیس - مغرور فلسفی! انسان کا دل کمزور ہے +

اتانیئل - جب خداوند میرا رہبر ہے۔ تو میں غرور سے خوف نہیں کھاتا +

کروبیل - (مرتال سے) جوان ہے!

مرتال - (کروبیل سے) خوبصورت ہے!

کروبیل - اس کی داڑھی کے بال اُلجھے ہوئے ہیں +

مرتال - اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے +

کروبیل - اس کے سر کے گرد یہ پٹی بہت بھلی معلوم ہوتی ہے +

مرتال - یہ انگشتری پہن لو +

کروبیل - اپنے بازو آگے کو پھیلا دو +

مرتال - اور اپنی انگلیاں +

مرتال اور کروبیل - جوان ہے اور خوبصورت ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں آگ بھری ہے +

مرتال - (سنگھار کو جاری رکھتے ہوئے) اب لباس پہن لو +

کروبیل - (خوشامد سے) یہ سیاہ پشم کا کرتہ اُتار ڈالو +

اتانیئل - (ان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے) ہٹ جاؤ۔ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا!

[کروبیل اور مرتال پہلے تو اتانیئل کے درشت انکار سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اُس کے قریب آتی ہیں]

کروبیل اور مرتال - (سیاہ پشم کے کرتے پر لباس فاخرہ پہنا کر) یہ لو اپنے زہد و تقوے کو اس نرم و نفیس ملبوس سے ڈھانپ لو +

نسیس - (اتانیئل سے) ان کی ہنسی مذاق سے رنجیدہ نہ ہو۔ اور ان کے سامنے اپنی نظروں کو نیچا نہ کرو۔ بلکہ آنکھیں اُٹھا کر ان کے حسن کی داد دو +

اتانیئل - (اپنے آپ سے) اے نور کی رُوح۔ آ۔ اور میرے دل کو اس جنگ کے لئے مضبوط بنا دے۔ جو مجھے بدی کی قوتوں سے لڑنا ہے +

کروبیل اور مرتال - اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے۔ اگر فنی ہے دیکھ پائے تو اس خشک زاہد کے سینے میں پھر انسانوں کا سا دل دھڑکنے لگ جائے +

مرتال - (اتانیئل سے) آؤ ہم تمہیں کشش زریں پہنا دیں +

کروبیل (اتانیئل سے) آؤ ہم تمہارے رخساروں پر عطر چھڑک دیں +

کروبیل اور مرتال - (ایک دوسرے سے) اس کا حسن کسی نوجوان دیوتا کا سا ہے +

[بہت دور سے تحسین کے نعروں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ نسیس

چبوترے پر جا کر شہر کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر واپس آ کر مسکراتا ہوا
(اتانیل سے مخاطب ہوتا ہے)

نسیں - اپنے آپ کو سنبھال لو۔ غنیم بڑھا چلا آ رہا ہے +

(قاصوں اور ایکڑوں کے گروہ جن کے ساتھ نسیس کے فلسفی دوست بھی شامل ہیں۔ تمائیس کے آگے آگے چبوترے پر داخل ہوتے ہیں)

ایکڑ اور فلسفی - (تمائیس کے گرد جمع ہو کر اور اُس کے سامنے جھک کر) تمائیس! خواہر کرشمہ ساز! سکندریہ کا پھول! تمائیس! محبوب ترین دولت! تمائیس! تمائیس! تمائیس!

(نسیس اپنے مہمانوں سے مراسم ملاقات ادا کرنے کے بعد ایوانِ ضیافت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غلام پردے اُٹھا دیتے ہیں)

نسیس - تمائیس! پیاری تمائیس! ہرا دورے! ارستو بولے! کیلی کریٹی! ڈوریان! - میرے مہمانو! میرے دوستو! مقدس دیوتاؤں کے ساتھ رہیں!

(سب ایوان میں داخل ہوتے ہیں۔ تمائیس بھی اُن مہمانوں کے پیچھے پیچھے ایوان میں داخل ہونے کو ہے۔ لیکن نسیس اُسے ٹھہرا لیتا ہے اور اس کے پاس ہی ایک نشست پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کھڑی ہنستی ہے۔ ہونٹوں پر ایک طنز آمیز تبسم ہے۔ نسیس اُس کو محبت بھری حسرت آلود نگاہوں سے دیکھتا ہے)

تمائیس - ہاں یہ تمائیس ہے۔ وہ نازک صنم جو آج آخری مرتبہ تیرے پھولوں سے آراستہ دسترخوان کی زینت بننے کو آئی ہے۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائیگا +

نسیں ہم نے سات دن تک ایک دوسرے سے عشق کیا۔ اکٹھے سات دن تک بیوفائی نہ کرنا بہت بڑی وفا ہے۔ میں شکوہ نہیں کرتا۔ اور اب تم میرے بازوؤں کو خالی چھوڑ کر بالکل آزاد ہو جاؤ گی +

تمائیس - نسیس آج کی رات خوش ہو لو۔ مسرت کے لمحوں کو نشاط کی دولت بکھیر نے دو۔ اور اس آخری رات سے بجز ایک مختصر ہنگامہ عشرت اور خود فراموشی کے اور کچھ نہ لانگو۔ کل صرف میرا نام باقی رہ جائیگا +

(کئی فلسفی جن میں اتانیل بھی شامل ہے مباحث علمی میں مشغول ایوان کی طرف سے داخل ہوتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ چبوترے تک پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ اتانیل باقی لوگوں سے علیحدہ ہو کر بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے۔ اور تمائیس کو غصے کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے)

تمائیس - (نسیس سے) یہ اجنبی کون ہے جو مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ میں نے اسے کبھی ضیافت میں نہیں دیکھا۔ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کون ہے؟

نسیں - (جیسے نہایت معمولی سی بات ہو) ایک سیدھا سادا فلسفی بھرا کا رہنے والا راہب! (طنز کے ساتھ) تم سے ملنے آیا ہے۔ خبردار ہو جاؤ +

تمائیس - ساتھ کیا لایا ہے؟ عشق؟

نسیس - کوئی انسانی کمزوری اس کے دل کو نہیں ہلا سکتی۔ وہ تمہیں اپنے مقدس عقیدے پر لانا چاہتا ہے +

تمائیس - اس کا عقیدہ کیا ہے؟

اتانیل - (آگے بڑھ کر) اپنے جسم سے نفرت۔ دکھ اور رنج سے محبت کرو۔ نفس کو کچل ڈالو اور گناہوں کی تلافی کرو +

تمائیس - (تھوڑی دیر تک اُس کو چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے) جاؤ۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں صرف عشق پر ایمان لائی ہوں۔ اور کوئی اور طاقت مجھ پر قابو نہیں پا سکتی +

اتانیل - (غصے کی حالت میں اس کے کلام کو سنتا رہا ہے۔ اور آگے بڑھ کر درشتی کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے) گمراہ مت بنو!

(ان الفاظ کو سنکر فلسفی اپنی باتیں چھوڑ کر تمائیس کے قریب آتے ہیں۔ خادم سب مہمانوں کو اس واقعے کی اطلاع پہنچا دیتے ہیں۔ مہمان ایوانِ ضیافت سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ استعجاب اور حیرت کے عالم میں تمائیس اور نسیس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں)

تمائیس - (اتانیل سے ایسے لہجے میں جس میں طنز اور خوشامد دونوں کی آمیزش ہے) - تم کس لئے اسقدر غصے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں میں جو روشنی چمک رہی ہے۔ اسے کیوں مچھلا رہے ہو؟ ــــ وہ کونسی منحوس حالت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے؟ ــــ انسان عشق کیلئے بنا ہے۔ اور تم دھوکا کھا رہے رہو ــــ انسان علم و فن کے لئے بنا ہے تمہاری آنکھیں کیوں اندھی ہو رہی ہیں! ــــ تمہارے ہونٹ زندگی کی شراب سے نا آشنا ہیں ــــ تم عشق کی پختہ کاری کو نہیں جانتے ــــ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ اور پھولوں کا تاج پہن لو ــــ عشق کے سوا باقی سب جھوٹ ہے ــــ اپنے بازو عشق کے آگے پھیلا دو +

اتانیئل۔ (بہت جوش کے ساتھ) کبھی نہیں! میں تمہاری بے حقیقت عشرت کاریوں سے نفرت کرتا ہوں ـــــ کبھی نہیں! میں اب ہونٹوں پر خاموشی کی مُہر لگا لونگا۔ لیکن اے سیہ کار عورت۔ میں تیرے محل میں اگر تجھے نجات دلواؤنگا ـــــ اور تجھ پر فتح پاکر جہنم پر فتح پاؤنگا +

تائیس نسیس اور باقی لوگ۔ پھولوں کا تاج پہن لو ـــــ عشق کے سوا باقی سب جھوٹ ہے ـــــ اپنے بازو عشق کے آگے پھیلا دو +

اتانیئل۔ (پیچھے کو ہٹ جاتا ہے۔ اور رخصت ہوتے ہوئے رعب و وقار سے مخاطب ہوتا ہے) میں تیرے محل میں اگر تجھے نجات دلواؤنگا +

نسیس اور باقی لوگ۔ (اتانیئل کو غصہ دلاکر) ونس سے سرکشی کرنے والے ہمت ہو۔ تو آجانا +

تائیس۔ (افروڈائٹی کے عشقیہ جذبات کو حرکات رقص سے ادا کرنے کے لئے اپنا آپ سنبھالتے ہوئے۔ اور اتانیئل کو غصہ دلاکر) ونس سے سرکشی کرنے والے۔ ہمت ہو تو آجانا +

[غلام تائیس کا لباس اُتارنا شروع کرتے ہیں۔ اتانیئل انتہائی نفرت اور غصے سے پیچ و تاب کھاکر وہاں سے بھاگ جاتا ہے]

باب دوم

پہلا منظر

[تائیس کا محل +

سورج کی روشنی حوض اور تالاب کے اُس پار سے ایوان تک پہنچ رہی ہے۔ اس لئے قوس قزح کے الوان مختلفہ سے رنگین ہے۔ اور آنکھوں کو تسکین بخشتی ہے!

سامنے ونس کا بت استادہ ہے۔ اور اس کے پایے کے بالمقابل ایک اونچے مجمر میں سے خوشبو دار دھواں اُٹھ رہا ہے۔ فرش بیش بہا قالین اور ان پر کامدار گدیلے اور صحرائے لیبا کے شیروں کی کھالیں بچھی ہیں۔ جابجا پھولدانوں میں موسم بہار کے پھول سجے ہیں +

تائیس متبنیوں اور خاصہ (لڑکیوں کو ساتھ لئے داخل ہوتی ہے +

تھوڑی دیر بعد ان سب کو ایک اشارے سے چلے جانیکا حکم ہوتا ہے +

تائیس (تنہا۔ مایوسی اور رنج کے لہجے میں) آہ۔ تھکن اور اُداسی سے میری زندگی بھاری ہو رہی ہے ـــــ مرد سب کے سب بے پرواہ اور ہوس کار ہیں۔ عورتیں حاسد اور بدخواہ ہیں ـــــ اور زندگی کی گھڑیاں بوجھل ہو رہی ہیں ـــــ میرے دل میں ہُوکیں اُٹھتی ہیں ـــــ مجھے آرام کہاں نصیب ہوگا اور مسرت کہاں حاصل ہوگی؟ ـــــ (سوچ میں ڈوبی ہوئی آئینہ اُٹھا لیتی ہے) اے میرے وفا کار آئینے۔ مجھے ڈھارس دے ـــــ مجھ سے کہہ کہ میں اب بھی حسین ہوں۔ مجھ سے کہہ کہ میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب کے سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہوں گے۔ اور میرے بالوں کی سنہری چمک کبھی مدھم نہ ہوگی ـــــ مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں۔ اور میرا حسن لازوال ہے ـــــ (سنبھل کر اور غور سے کان لگاکر سُنتی ہے۔ گویا کسی غیر معلوم مقام سے کوئی آواز کچھ کہہ رہی ہے) آہ۔ اے بیرحم آواز خاموش ہو جا۔ وہ آواز جو مجھ سے کہہ رہی ہے "تائیس تمہارا حسن ڈھل جائیگا" ـــــ تو پھر ایک دن ایسا بھی آئیگا جب تائیس تائیس نہ رہیگی نہیں! نہیں! مجھے یقین نہیں آتا ـــــ اور اگر کوئی مخفی ترکیب۔ کوئی سحر کا فن ایسا نہیں جو حسن کو برقرار رکھ سکے۔ تو اے ونس تو ہی مجھے اسکے ابدی ہونے کا یقین دلا (ونس کے بُت سے مخاطب ہوکر زیر لب دعا مانگتے ہوئے) ونس! ـــــ جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور پھر بھی موجود ہے۔ ونس مجھے جواب دے۔ مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے۔ میرے گلاب کے سے ہونٹ کبھی خشک نہ ہونگے اور میرے بالوں کی سنہری چمک کبھی مدھم نہ ہوگی ـــــ مجھ سے کہہ کہ میں حسین ہوں اور میرا حسن لازوال ہے۔ ہمیشہ کے لئے! ہمیشہ کے لئے ـــــ!

[اس کی نظر اتانیئل پر پڑتی ہے۔ جو چُپ چاپ اندر آکر دہلیز کے پاس ٹھہر گیا ہے]

تائیس۔ (اخلاق کے ساتھ) اجنبی تم اپنے کہنے کے مطابق آہی گئے +

اتانیئل۔ (زیر لب دعا مانگتے ہوئے) اے خداوند۔ اس عورت کا درخشاں چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ اس کی دلاویزی کا جادو میرے استقلال کے سامنے بیکار رہ جائے +

تائیس۔ (مسکراکر) کہو کیا کہنا ہے؟

اتانیئل۔ لوگ کہتے ہیں تم بے مثال ہو۔ اس لئے میں تم سے ملنے کا آرزومند تھا۔ اور اب جبکہ میں نے تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تم پر قابو پانا میرے لئے کس قدر فخر کا باعث ہوگا +

تائیس - (مسکرا کر) تمہارا عجز بلند مرتبہ ہے۔ تمہارا غرور اُس سے بھی زیادہ سرکش ہے۔ خود سر اجنبی ہشیار رہو کہیں مجھ سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ +

اتانئیل - (جذبے کے ساتھ) تائیس میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور اس کا اعتراف کرنے کے لئے بیقرار ہو رہا ہوں لیکن ویسی محبت نہیں جیسی تم سمجھتی ہو۔ میں مقدس روح کے نام پر۔ حق اور راستی کے نام پر تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہیں جس عیش کا وعدہ دلاتا ہوں۔ وہ تمہاری پھولوں سے آراستہ عشرت کاریوں۔ اور ایک مختصر شب وصال کے خواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو رحمت میں آج تمہارے پاس لے کر آیا ہوں اس کا کوئی انجام نہیں +

تائیس - (طنز آمیز لہجے میں) اچھا۔ تو مجھے اس عجیب و غریب محبت کے کرشمے دکھاؤ۔ سچا عشق تو صرف بوسوں کی زبان سے بولتا ہے +

اتانئیل - تائیس۔ میری ہنسی مت اُڑاؤ۔ جو عشق میں تمہیں سکھانے آیا ہوں اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں +

تائیس - (بے پروائی سے) دوست۔ تم بہت دیر میں آئے۔ میں ہر لذت سے واقف ہوں +

اتانئیل - جس عشق سے تم واقف ہو۔ وہ شرم اور حیا سوزی سے ہمکنار ہے جو میں تمہیں سکھانے آیا ہوں صرف وہی ایک عشق بلند پایہ ہے +

تائیس - احمق ہو کہ جس کے ہاں مہمان ہو۔ اُس کی توہین کرتے ہو +

اتانئیل - توہین!۔۔۔ میں تو صرف تمہیں راہ حق پر لانا چاہتا ہوں۔ (اس کا جوش بڑھتا جاتا ہے) آہ کون ہے جو میرے الفاظ کو شعلوں کی طرح بھڑکا دے۔ تاکہ میرے ایک سانس سے اے رقاصہ تیرا دل موم کی طرح پگھل جائے۔ کون ہے جو تجھے میرے حوالے کر دے۔ کون ہے جو میری گفتار میں سمندر کا سا طوفان پیدا کر دے۔ کہ اس کی چڑھتی ہوئی لہریں تیری روح کو حیات ابدی کے لئے پاکیزہ بنا دیں +

تائیس - (کچھ بیقراری ہو کر اتانئیل کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے) حیات ابدی کے لئے!

اتانئیل - ہاں حیات ابدی کے لئے!

تائیس - (اپنے دل سے فیصلہ کر چکی ہے لیکن ابھی اظہار میں تامل باقی ہے) مجھے سب حال بتاؤ۔ اس پُر اسرار عشق کا حال۔ میں سب کچھ مانوں گی۔ میں سُن رہی ہوں +

[تائیس ایک سونے کے چمچے سے خوشبودار مصالحہ آگ میں ڈالتی ہے]

اتانئیل - (گھبرا کر۔ اپنے آپ سے) خوف کے طوفان میرے خیالات کو برہم کر رہے ہیں۔ اے خداوند اس عورت کا درخشندہ چہرہ میری آنکھوں کو خیرہ نہ کرے +

[دھوئیں کا بادل تائیس اور وینس کے بت دونو کے اردگرد چھا جاتا ہے۔ اتانئیل تائیس پر نظریں جمائے رہتا ہے۔ اور تائیس مسکراتی ہوئی پُر اسرار الفاظ دُہراتی ہے]

تائیس - اے وینس! جو آنکھوں سے اوجھل ہے اور پھر بھی موجود ہے!

اتانئیل - اے خداوند! اس کی دلاویزی کا جادو میرے استقلال کے سامنے بیکار رہ جائے +

تائیس - اے وینس! اپنی بلندی سے نیچے اُتر آ اور حکومت کر!۔ وینس جو آسمان کی درخشانی اور برف کی سفیدی ہے!۔ وینس جو درخشندگی ہے راحت ہے اور شیرینی ہے!

اتانئیل - (اپنے دل کو کڑا کر کے اپنا لباس فاخرہ جو سیاہ پشم کے کُرتے کے اوپر پہنے ہوئے ہے پھاڑ کر اُتار ڈالتا ہے) میں اینتونوئے کا راہب اتانئیل ہوں!۔ میں مقدس صحرا سے آیا ہوں اور میں نفس امارہ پر لعنت بھیجتا ہوں اور میں اس موت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ جس کے پنجے میں تو گرفتار ہے! اور اے عورت میں تیرے سامنے اس طرح کھڑا ہوں۔ گویا کسی قبر کے سامنے کھڑا ہوں۔ اور تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ کہ تائیس! خدا کے حکم سے زندہ ہو جا!

[تائیس کا رنگ خوف کے مارے فق ہے۔ وہ ہاتھ جوڑے روتی اور سسکیاں بھرتی ہوئی اتانئیل کے قدموں میں گر پڑتی ہے]

تائیس - مجھے سزا مت دو۔ کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ صحرا کے مقدس لوگ ان ہستیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ جو عشرت کا کھلونا بن جاتی ہیں۔ لیکن مجھ سے نفرت مت کرو۔ مجھے نہ تقدیر پر نہ فطرت پر اختیار تھا۔ اور میرا کیا قصور کہ میں حسین ہوں۔ مجھے جان سے مت مارو۔ آہ میں موت سے خوف کھاتی ہوں +

اتانئیل - (جوش کے ساتھ) نہیں۔ تم ابد تک زندہ رہو گی۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یسوع مسیح کی محبوبہ اور دُلہن بنی رہو گی۔ وہ یسوع مسیح جس کی تم دشمن تھیں +

تائیس - (جوشِ مسرت کے ساتھ) میری رُوح مسرت اور تازگی سے بھر رہی ہے میں تھرتھرا رہی ہوں لیکن مسحور ہوں۔ یہ مجھ پر کیا جادو کر رہا ہے +

[نسیس کی آواز دُور سے سنائی دیتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ قریب تر ہو جاتی ہے]

نسیس کی آواز - اے تائیس! نازک اندام حسینہ۔ میں آخری مرتبہ تیرے پھول سے ہونٹوں کا عشق تجھ سے طلب کرتا ہوں +

تائیس - (اس آواز کو نفرت سے سنتی ہے) آہ نسیس! (گھبراہٹ کے عالم میں اپنے آپ سے) میری روح اب میرے بس میں نہیں۔ مجھ سے محبت کرو! (یکایک نفرت کے ساتھ) اس نے کبھی کسی کو نہیں چاہا! اسے صرف عشق سے عشق ہے!

اتانیئل - تم اس کی آواز سُن رہی ہو؟

تائیس - (اتانیئل سے) ہاں جاؤ۔ اس سے کہہ دو۔ کہ مجھے سب مال دار لوگوں سے۔ سب خوش باش لوگوں سے نفرت ہے۔ اسے کہہ دو کہ مجھے بھول جائے۔ سمجھ گئے؟ اس سے کہہ دو کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں +

اتانیئل - (تحکم کے لہجے میں) تمہاری دہلیز پر طلوع آفتاب تک میں تمہارا انتظار کرونگا +

تائیس - (سرکشی کی آخری کوشش کرتے ہوئے) نہیں میں رقاصہ تائیس ہوں اور رقاصہ تائیس ہی رہونگی مجھے کسی چیز پر یقین نہیں اور مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں — نہ اُس کی نہ تمہاری نہ تمہارے خدا کی!

[دیوانہ وار ہنستی ہے۔ اور پھر سسکیاں بھرنے لگتی ہے۔ اور گدیلوں پر منہ کے بل گر کر رونے لگتی ہے۔ اتانیئل تقدیس اور اعتماد کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اور پھر رخصت ہو جاتا ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔ موسیقی اگلے سین کے آغاز تک جاری رہتی ہے]

باب دوم

دوسرا منظر

[صبح کاذب —

تائیس کے محل کے سامنے کا چوک —

محل کی ڈیوڑھی کے پاس ایروس کا ایک چھوٹا سا بت استادہ ہے اور اس کے سامنے ایک چراغ روشن ہے۔ ابھی چاند کی روشنی پھیکی نہیں پڑی +

ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کے سامنے اتانیئل فرش کے پتھروں پر سر رکھے سو رہا ہے +

دُور دائیں طرف کو ایک مکان ہے۔ جس میں نسیس اور اُسکے ہمراہی جمع ہیں۔ مکان کی کھڑکیوں میں سے روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ اور محفلِ نشاط کی موسیقی مدھم سی سنائی دے رہی ہے +

تھوڑی دیر کے بعد تائیس کے محل کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور تائیس باہر آتی ہے۔ چراغ کو سر سے اوپر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اُترتی ہے۔ جب اس کی نظر اتانیئل پر پڑتی ہے۔ تو چراغ کو اپنی جگہ پر رکھ کر وہ پھر اتانیئل کی طرف واپس آتی ہے]

تائیس - (اتانیئل کی طرف جھک کر۔ نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) اے مقدس باپ۔ میں نے خدا کا پیغام تیری زبان سے سُنا۔ میں حاضر ہوں +

اتانیئل - (اُٹھ کر۔ نرم لہجے میں اور ادب کے ساتھ) تائیس۔ خدا تمہاری راہ تک رہا تھا +

تائیس - (اور بھی نرم لہجے میں اور عجز کے ساتھ) تمہارے الفاظ میرے دُکھے ہوئے دل کا مرہم تھے۔ میں دعا مانگتی رہی ہوں۔ میں آنسو بہاتی رہی ہوں۔ میری روح کے اندر نور کے چشمے اُبل رہے ہیں — میں نے ہوس اور نفسانیت کی بے مائگی کو دیکھ لیا ہے۔ تم نے آنے کا حکم دیا تھا۔ میں آگئی ہوں +

اتانیئل - اے میری بہن! ہمت کر کہ مسرت کی فجر ہو رہی ہے +

تائیس - (عجز کے ساتھ) مجھے کیا حکم ہے؟

اتانیئل - یہاں سے قریب مغرب کی طرف ایک راہب خانہ ہے۔ جہاں برگزیدہ عورتیں فرشتوں کی مانند وصال دائمی میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ مفلس ہیں تاکہ یسوع مسیح اُن سے محبت کرے۔ حیادار ہیں تاکہ یسوع مسیح اُن کی طرف نظر اُٹھائے۔ باعصمت ہیں تاکہ وہ انہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤنگا۔ اور تجھے مادرِ مقدس البین کے حوالے کر دونگا +

تائیس - البین۔ دودمانِ سیزر کی دُختر!

اتانئیل - (سادگی سے) اور یسوع کی پاکیزہ ترین لونڈی! - (پُراسرار لہجے میں) وہاں میں تمہیں ایک تنگ کوٹھڑی میں بند کر دونگا - اور پھر ایک دن یسوع مسیح آکر تمہیں نجات دلائیگا - (اس کا جوش بڑھ رہا ہے) مجھ پر یقین رکھو اور خوف مت کھاؤ - وہ خود آئیگا - اور تمہاری رُوح کی گہرائیاں تھرتھرا اُٹھینگی - جب وہ اپنی نور کی اُنگلیوں سے تمہارے آنسو پونچھنے کے لئے تمہاری آنکھوں کو چھوئیگا +

تائیس - (مسرت سے) آہ مقدس باپ مجھے البین کے گھر لے چل +

اتانئیل - ہاں - مگر پہلے ان سب چیزوں کو فنا کر دو - جو ناپاک تائیس کی ملکیت تھیں - اپنے محل کو - اپنی زر و دولت کو - اس مال و منال کو جو تمہاری سیہ کاری کا شاہد ہے - سب کو پھونک دو - سب کو فنا کر دو +

تائیس - (مقابلے کی تاب نہ لاکر) مقدس باپ ایسا ہی ہوگا - (گھر کی طرف جاتی ہے لیکن مسکراتی ہوئی ایروس کے بُت کے سامنے ٹھہر جاتی ہے) میں اپنے ساتھ اپنی گذشتہ زندگی کی کوئی یادگار نہیں لے جانا چاہتی بجز اس کے (بُت کو اُٹھا لیتی ہے - اور اتانئیل کے پاس جاکر اُسے دکھاتی ہے) بجز اس ہاتھی دانت کے بُت کے - جو قدیم زمانے کی ہنرمندی اور دستکاری کی تخلیق ہے - یہ ایروس کا بُت - ایروس جو عشق کا دیوتا ہے - (نرم لہجے میں اور پاکیزہ گفتاری سے) اے مقدس باپ ہم اس پر بے رحمی کیسے کر سکتے ہیں؟ عشق ایک نادر دولت ہے - میری تر دامنی عشق نہیں عشق کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے - آہ مجھے اس بات کا افسوس نہیں - کہ میں نے عشق کو اپنا آقا تسلیم کیا - بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ میں نے اس کے احکام کو غلط سمجھا - عشق کا حکم ہے - کہ "جو مرد میرا نام لئے بغیر اپنی آغوش پھیلائے - اُس کی آغوش سے کنارہ کرو" اس قانون کی وجہ سے اس کا احترام واجب ہے - اسے لے کر کسی راہب خانے میں رکھ دینا - کہ جن کی نظر اس پر پڑے - وہ پھر خدا کی طرف رجوع کریں - کیوں کہ عشق ہی نردبانِ حقیقت ہے - (ایک لمحے کے بعد) جب نسیس مجھے چاہتا تھا - تو اس نے مجھے یہ بُت تحفے کے طور پر دیا تھا +

اتانئیل - (غصے سے بیتاب ہوکر) نسیس! آہ ان مردود ہاتھوں پر لعنت ہو! - جن سے یہ تحفہ تجھے ملا - اس کا نشان بھی باقی مت رہنے دو - (بُت کو چھین کر زور سے فرش پر پھینک دیتا ہے - جس سے وہ چور چور ہو جاتا ہے اتانئیل اس کے ٹکڑوں کو ٹھوکروں سے بکھیر دیتا ہے) اور اپنا سب کچھ شعلوں کے سپرد کر دو یا کسی گہری غار میں دھکیل دو + تائیس! اپنی گذشتہ زندگی کو پھر خاک میں ملا دو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی یادوں سے محو کر دو +

تائیس - (سر جھکائے کانپ رہی ہے) سب کچھ خاک میں مل جائیگا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محو ہو جائیگا - آؤ ——

اتانئیل - چلو +

[اتانئیل اور تائیس کے چلے جانے کے بعد نسیس اور سین ۲ کے تمام اشخاص داخل ہوتے ہیں - شور مچاتے ہوئے اور ہنستے کھیلتے آگے بڑھتے ہیں نسیس سب سے پیش پیش سرخوشی کے عالم میں ذرا لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے]

نسیس اور اُسکے ہمراہی - دوستو میرے ساتھ ساتھ رہو - ابھی صبح نہیں ہوئی - قسمت نے تائیس کی قیمت سے تیس گنی مسرت میرے دامن میں بھر دی ہے - اس لئے ایک بار نہیں سو بار خوشی مناؤ +

مشرق کی رقاصہ لڑکیوں کو بلاؤ - رقاصہ لڑکیوں کو اور سپیروں کو اور مسخروں کو - اور رقص کا ہنگامہ صبح تک نہ تھمنے دو +

میخانوں کے دروازے کھٹکھٹاؤ - مشعلیں روشن کر دو - سورج کو شرما دو - برف میں لگی ہوئی شراب لنڈھا دو - نرم نرم قالین یہیں پر بچھا دو - اور کروبیل اور مرتال تم بھی - میری آغوش میں آجاؤ +

زندگی کے سوا باقی سب جھوٹ ہے - دیوانگی کے سوا باقی سب حماقت ہے +

[نسیس کے ہمراہی بڑی مستعدی کے ساتھ اس کے احکام بجا لاتے ہیں - وہ خود عیش پرست انداز میں گدیلوں پر گر پڑتا ہے - اس کے اردگرد کروبیل - مرتال - بہت سی لونڈیاں اور رقاصہ لڑکیاں جمع ہو جاتی ہیں]

[ہنگامۂ رقص]

[کئی قسم کے رقص ہو چکنے کے بعد "ساحرہ" داخل ہوتی ہے]

نسیس - آہ وہ حسینۂ بے مثال آگئی —— کروبیل اپنا رباب اُٹھا لو مرتال اپنی سارنگی سنبھال لو - اور دونو مل کر حُسن کا گیت گاؤ +

[کروبیل اور مرتال دونو ساز بجاتی ہیں اور گاتی ہیں "ساحرہ"

دسمبر ۱۹۲۸ء

ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ اپنے جسم کو لچکاتی ہوئی رقص کرتی ہے۔ اور نرم آواز میں کروبیل اور مرتال کیساتھ گانا گاتی ہے]

کروبیل اور مرتال

(۱) وہ حسینہ آگئی جس کا حسن ملکۂ صبا سے بھی زیادہ دلآویز ہے۔ جو آئینوں پر رقص کرتی تھی!

(۲) اور اس کے نقاب کے اندر سے اُس کی سریلی آواز آگ کے تیروں کی طرح نکل رہی ہے!

(۳) اس کا رنگ کہربا کی مانند ہلکا سنہری ہے۔ اس کے ہونٹ لہو کی مانند سرخ ہیں۔ اس کی آنکھیں رات کی مانند کالی ہیں!

(۴) اس کی حرکات سرکنڈے کی جنبش کی مانند نازک اور کسی پرند کی پرواز کی مانند لطیف ہیں!

(۵) اس کی نظر تنگ دام میں کئی دل گرفتار ہیں۔ اس کی نگاہیں بے پناہ ہیں!

(۶) وہ دل چھین لیتی ہے۔ اور وصل کی لذت لٹاتی ہے۔ اس کے سفاک حسن کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا!

(۷) وہ سنگدل صنم کی مانند ہے۔ جسے علم نہیں۔ کہ وہ جب چاہے تباہ کرسکتی ہے!

[رقص کچھ دیر جاری رہ کر ختم ہو جاتا ہے]

[عین اس وقت اتانیئل ایک روشن مشعل ہاتھ میں اُٹھائے جلدی جلدی محل سے باہر نکلتا ہے]

نسیس۔ (طنزآمیز لہجے میں) ارے یہ تو وہ ہے! یہ تو اتانیئل ہے!

ہمراہی۔ اتانیئل۔ دانشمندوں کے دانشمند۔ تم پر سلام ہو! تمائیس نے تمہاری عقل کو اندھا کر دیا؟ (ہنسکر) وہ دیکھو وہ دیکھو۔ اس راہب کے درخشاں چہرے کی طرف دیکھو!

اتانیئل۔ (مشعل کو زمین پر پھینک دیتا ہے جس سے وہ بجھ جاتی ہے) اپنی زبان روک لو! — تمائیس خداوند کی دلہن ہے۔ اب وہ تم لوگوں کی ملکیت نہیں رہی! ناپاک تمائیس ہمیشہ کے لئے مر چکی۔ اور اب ایک دوسری تمائیس — وہ دیکھو آرہی ہے!

[تمائیس داخل ہوتی ہے]

اس کے بال گھلے ہیں۔ اور اس نے موٹا اونی لباس پہن رکھا ہے

لونڈیاں حسرت زدہ اس کے پیچھے پیچھے آرہی ہیں۔ اور بار بار مُڑکر محل کی طرف دیکھتی ہیں

محل سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں آگ کے شعلے نکلنے لگیں گے۔ اور آگ سین کے اختتام تک بڑھتی جائیگی

شور وغوغا اور قہقہوں کی آواز سن کر آہستہ آہستہ چوک میں ہجوم جمع ہونا شروع ہو گیا ہے]

اتانیئل۔ (تمائیس سے) مقدس بہن۔ آؤ۔ اس شہر سے ہمیشہ کے لئے بھاگ جائیں

لوگوں کا ایک گروہ۔ (حائل ہوکر) نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں کبھی نہیں

ہجوم اور نسیس کے ہمراہی۔ (حائل ہوکر) کیا یہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟ یہ کیا کہہ رہا ہے؟

تمائیس۔ ہاں یہ سچ کہتا ہے

نسیس۔ تمائیس تم ہم سے چلی جاؤگی! کیا یہ ممکن ہے؟ (تمائیس کو بازو سے پکڑ لیتا ہے)

اتانیئل۔ (تمائیس کو چھڑا کر) ناپاک شخص! ہاتھ لگایا تو جان سے مار دیا جائیگا۔ اس کا جسم مقدس ہے! یہ خدا کی ملکیت ہے! (تمائیس کو اپنے ساتھ زبردستی لے کر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے)۔ آگے سے ہٹ جاؤ!

ہجوم۔ (برافروختہ ہوکر) نہیں نہیں۔ یہ شخص کیا چاہتا ہے؟ یہ صحرا کو واپس کیوں نہیں چلا جاتا؟

ایک گروہ۔ (اتانیئل کو دھمکا کر) بن مانس۔ یہاں سے دُور ہو جاؤ

ہجوم۔ یہ تمائیس کو ہم سے لے جائیگا؟ اچھا؟ ہم زندہ کیسے رہیں گے! میرے لمبوسات! میرے ہار! میرے گھوڑے! میرے جواہرات! ہمیں ان کی قیمت کون ادا کریگا؟ کیا کوئی قانون ہماری مدد نہیں کریگا؟ یہ تمائیس کو ہم سے چھین رہا ہے!

خوفزدہ عورتیں۔ (جلتے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کرکے) شعلے! آگ محل جل رہا ہے!

ہجوم۔ (شور مچاتے ہوئے) تمائیس نہیں رہیگی۔ اس شخص کو جان سے مار دو! اسے کسی گڑھے میں دھکیل دو! اسے پھانسی پر لٹکا دو! اسے جیلوں کے آگے ڈال دو!

ہجوم میں سے ایک شخص۔ (ایک پتھر اُٹھا کر اتانیئل کے مارتا ہے جس

سے اُس کا چہرہ زخمی ہو جاتا ہے) مردود۔ یہ لے!

اتانیئل اور تائیس۔ (ایک دوسرے کے بالکل پاس کھڑے بغیر کسی خوف و اضطراب کے ہجوم کو دیکھ رہے ہیں۔ شعلے بلند تر ہوتے جاتے ہیں) آہ۔ اگر موت کی گھڑی سر پر آگئی ہے تو آؤ جان خدا کے سپرد کر دیں۔ اور اپنے خون کی قیمت سے ایک لمحے کے اندر ابدی مسرت خرید لیں +

ہجوم۔ (برافروختہ ہو کر) اسے جان سے مار ڈالو!

نسیس۔ (ہجوم کے رستے میں حائل ہو کر) تمہیں دیوتاؤں کا واسطہ ہے ٹھہر جاؤ۔ لو اس سے اپنے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ (تھیلی میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ اور اشرفیوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ہجوم کے سامنے بکھیر دیتا ہے)

ہجوم۔ (ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اشرفیاں اُٹھانے لگ جاتے ہیں) اشرفیاں! سونا!

نسیس۔ (اتانیئل اور تائیس سے) جاؤ! خدا حافظ۔ تائیس تم مجھے بھلا دو گی لیکن اس سے کیا حاصل؟ تمہاری یاد سے میری روح ہمیشہ خوشبو میں بسی رہیگی!

[نسیس اور بھی سونا بکھیرتا ہے۔ ہجوم پھر شور مچاتا ہے۔ اتانیئل اور تائیس بھاگ جاتے ہیں۔ محل جل رہا ہے]

باب سویم

پہلا منظر

[خیابان ——

کھجور کے درختوں کے سایے میں ایک کنواں۔ دور درختوں میں راہگیروں کے آرام کے لئے ایک جھونپڑی ہے۔ اس سے بھی پرے ریگستان کے کنارے البین کا سفید گھر دھوپ میں چمک رہا ہے +

سورج بہت بلند ہے۔ کھجور کے درختوں کے نیچے بہت سی عورتیں چپ چاپ کوئیں تک جاتی ہیں۔ اور پھر اوپر آکر واپس چلی جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اتانیئل اور تائیس داخل ہوتے ہیں۔ تائیس تکان کے مارے کھڑی بھی مشکل سے ہو سکتی ہے]

تائیس۔ میں گرمی کی شدت سے نڈھال ہو رہی ہوں۔ آہ میں سختیوں سے مری جاتی ہوں۔ ذرا دم لینے کو ٹھہر جائیں +

اتانیئل۔ نہیں۔ آگے بڑھی چلو! اپنے جسم کو کچل ڈالو۔ اپنے نفس کو ذلیل و خوار کرو!

تائیس۔ (عجز کے ساتھ) مقدس باپ۔ تم سچ کہتے ہو۔ میں اپنا دکھ شفیع خداوندی کی نذر کرتی ہوں +

اتانیئل۔ صرف توبہ ہی سے گناہ دُھلتے ہیں اور روح پاکیزہ ہوتی ہے۔ بڑھی چلو! یہ دلفریب جسم جسے تو نے کافروں۔ مشرکوں۔ (جوش سے) نسیس کے حوالے کیا تھا۔ آہ۔ یہ پھر بھی خدا کا بخشا ہوا جسم ہے۔ خدا نے اسے اپنے مقدس نام کی عبادت گاہ بنایا تھا۔ اور اب کہ تمہیں حقیقت کی ایک جھلک دکھائی دے گئی ہے۔ جب کبھی تمہارا ہونٹ سے ہونٹ یا ہاتھ سے ہاتھ ملیگا۔ تمہارا دل نفرت اور گھن سے بھر جائیگا +

تائیس۔ مقدس باپ۔ تم سچ کہتے ہو!

اتانیئل۔ آگے بڑھو! گناہوں کا کفارہ ادا کرو +

تائیس۔ (خوفزدہ) کیا ہم ابھی خانۂ خدا سے دور ہیں؟

اتانیئل۔ (درشتی سے) یہ پوچھنا بے سود ہے۔ آگے بڑھو +

تائیس۔ (لڑکھڑاتی ہوئی) میں نہیں چل سکتی! —— محترم باپ۔ مجھے معافی دو +

[غش کھا کر گرنے کو ہے۔ کہ اتانیئل اُسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیتا ہوں۔ اور سایے میں بٹھا دیتا ہے۔ کچھ دیر چپ چاپ اس کو دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت اس کے چہرے سے رحم ٹپکنے لگتا ہے]

اتانیئل۔ آہ تمہارے سفید سفید تلووں سے خون کے قطرے نکل رہے ہیں۔ میرا دل ترس کھا رہا ہے۔ بدنصیب عورت۔ سیاہ بخت دختر۔ اے مقدس تائیس۔ اے میری بہن۔ میں نے اس آزمائش کو حد سے زیادہ سخت بنا دیا۔ مجھے معاف کر دو۔ (سربسجود ہو کر روتا ہے اور احترام کے جذبات کے ساتھ تائیس کے خون آلود پاؤں چومتا ہے) مقدس تائیس! محترم تائیس +

تائیس۔ (دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہے) تمہارے الفاظ میں صبح کی سی تازگی ہے۔ چلو اب آگے چلیں +

اتانئیل - (نرمی کے ساتھ روکر) ابھی نہیں - تازہ پانی اور پھلوں سے تمہارے جسم میں کچھ طاقت آجائیگی - تم یہیں ٹھہرو - میں اس مسافر خانے کے پاس کنوئیں تک جاکر پانی لے آؤں - وہ پرے جو سفید جھونپڑیاں دکھائی دیتی ہیں - وہ البین کا راہب خانہ ہے - منزل قریب ہے ہمت نہ ہارو اور خدا سے دعا مانگو +

[آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے - درختوں کے پاس جھونپڑی کے اندر داخل ہوتا ہے - وہاں سے ٹوکری میں کچھ پھل لیکر باہر آتا ہے اور پھر لکڑی کا ایک پیالہ لئے کنوئیں کی طرف جاتا ہے]

تائیس - (تنہا) اے خدا کے پنجا سہر - جس کی سختی بھی نیکی ہے تجھ پر خدا کی رحمت ہو - کہ تو نے آسمان کے دروازے مجھ پر کھول دیئے میرے جسم سے خون بہہ رہا ہے - اور میری روح مسرت سے بھر رہی ہے - ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے میرے تپے ہوئے ماتھے کو ٹھنڈک پہنچا رہے ہیں - تمہارا شیریں اور رقت افزا تصور چشمے کے پانی سے بھی تازہ اور شہد سے بھی میٹھا ہے - میری روح علائق سفلی سے آزاد ہو کر ایک لامتناہی فضا میں پرواز کر رہی ہے - محترم باپ تم پر خدا کی رحمت ہو +

[اتانئیل پانی اور پھل لئے واپس آتا ہے]

اتانئیل - اپنے ہاتھ دھو لو - اپنے ہونٹ تر کر لو - یہ پھل کھا لو - اور اس تپش کو ٹھنڈا کر لو - جس سے تمہاری آنکھیں چمک رہی ہیں + تمہاری زندگی اب میری بے بہا دولت ہے - یہ میری ہے - خدا نے اسے میرے سپرد کیا ہے +

[تائیس کے ہاتھوں پر پانی ڈالتا ہے - اور اپنے ہاتھوں سے اسے پانی پلاتا ہے - تائیس خود پی کر مسکراتی ہوئی پیالہ اس کی طرف بڑھاتی ہے]

تائیس - اب تم پیو +

اتانئیل - نہیں - تمہیں تازہ دم دیکھ کر میری پیاس بجھ گئی - تمہارے دکھ کو دور کرنا ہی میری سب سے بڑی خوشی ہے - تائیس ! اے جان کی راحت !

تائیس - اے نیکی کے فرشتے !

[اسے پھل کھانے کو دیتا ہے اور خود پھر کنوئیں سے پانی بھر لاتا ہے - اس کے بعد کمل خاموشی چھا جاتی ہے +

دور سے حمد کے گیتوں کی آواز مدھم سی سنائی دیتی ہے - اور آہستہ آہستہ بلند تر ہوتی جاتی ہے - اور البین اور راہب لڑکیوں کا گروہ داخل ہوتا ہے]

آوازیں - (دور سے) اے باپ جو آسمان پر حکومت کر رہا ہے .... ہمیں آج کے دن رزق عطا کر !

تائیس - کون آرہا ہے ؟

اتانئیل - محترم البین اور اس کی بہنیں راہب خانے کی کالی روٹی لا رہی ہیں - وہ ہماری طرف آرہی ہیں - اور خدا کی حمد گا رہی ہیں +

آوازیں - (بہت ہی قریب) خداوند - ہمیں آزمائش میں نہ ڈال - اور ہمیں بدی سے بچائے رکھ !

[البین اور دوسری عورتیں داخل ہوتی ہیں]

اتانئیل - آمین !

[اتانئیل کو دیکھ کر البین اور دیگر راہب عورتیں ٹھہر جاتی ہیں - اور بہت ادب اور احترام کے انداز میں کھڑی ہو جاتی ہیں - تائیس بھی اٹھ کر اتانئیل کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے]

اتانئیل - (البین سے) محترم البین ! تم پر خدا کی برکت نازل ہو - میں تمہارے آسمانی چھتے میں ایک ایسی شہد کی مکھی لایا ہوں - جسے میں نے فضل خداوندی کی مدد سے ایک بے برگ و گل رستے پر بھٹکتا پایا - میں نے اس کمزور و نحیف جان کو اپنے ہاتھ میں لے لیا - اپنے سانس سے اس میں جان ڈالی - اور اب میں اسے خدا کی نذر کرنے کے لئے تمہارے سپرد کرتا ہوں +

البین - میری بیٹی میرے قریب آؤ +

[تائیس کو مادرانہ شفقت کے ساتھ گلے سے لگا لیتی ہے]

اتانئیل - میں اس سے آگے نہ جاؤنگا - میرا فرض پورا ہو چکا - پیاری تائیس خدا حافظ ! اب تم تنگ کوٹھڑی میں تنہا زندگی بسر کرو - اپنے گناہوں سے توبہ کرو - اور ہر وقت میرے لئے دعا مانگتی رہو +

تائیس - (اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر) میں تمہارے دستگیر ہاتھوں کو بوسہ دیتی ہوں - تم نے مجھے خدا کے دروازے تک پہنچایا - تم سے جدا ہوتے ہوئے مجھے دکھ ہوتا ہے +

اتانئیل - رقت انگیز الفاظ! قابلِ پرستش آنسو! - وہ عاصی خوش قسمت ہے جسے عشقِ ابدی نے اپنا بنا لیا ہو۔ (جوش کے ساتھ) اس کا چہرہ کس قدر دلفریب ہے۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کا نور چمک رہا ہے +

تائیس - خدا حافظ محترم باپ خدا حافظ! ..... ہمیشہ کے لئے!

اتانئیل - (جیسے اس پر بجلی گری ہو) ہمیشہ کے لئے؟

تائیس - دوبارہ ملاقات آسمان پر ہوگی +

البین اور راہب عورتیں - آمین!

[عورتیں تائیس کو ساتھ لے کر رخصت ہو جاتی ہیں۔ اتانئیل ان کو اس طرح دیکھتا ہے۔ جیسے خواب کے عالم میں ہو]

اتانئیل - (تنہا) اس کے قدم آہستہ اُٹھ رہے ہیں۔ درخت اپنی شاخیں جھکا دیتے ہیں۔ گویا اس کے ماتھے کو خنکی پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور کئی دن اور پھر کئی سال گزر جائینگے اور مجھے اس کا چہرہ کبھی نظر نہ آئیگا۔ (پہلے تو آہستہ آہستہ پھر دردناک چیخ مار کے) کبھی نظر نہ آئیگا! کبھی نظر نہ آئیگا!

[عصا کا سہارا لئے مبہوت کھڑا اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ پردہ گرتا ہے]

باب سویم

دوسرا منظر

[صحرائے تھیبس -

دریائے نیل کے کنارے سینوبیٹ راہبوں کی جھونپڑیاں - مغرب کی طرف آسمان کا رنگ سُرخ ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ آندھی آنیوالی ہے +

راہب ابھی اپنا شام کا کھانا کھا چکے ہیں۔ اور آسمان کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں!

دور باد سموم چلنے لگتی ہے +

صحرا کی گہرائیوں میں سے گیدڑوں کی آوازیں اور شیروں کی دہاڑ سنائی دیتی ہے]

راہب - آسمان تاریک ہو رہا ہے۔ جاندار اور بے جان اشیاء پر بیہوشی سی طاری ہو رہی ہے۔ دور سے گیدڑوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہوائیں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ قہر کے دروازے کھول دینگی +

پالیموں - اپنی اپنی جھونپڑیوں کو واپس چلے جاؤ۔ اور اپنا غلہ اور پھل سنبھال لو۔ ورنہ آندھی ان کو صحرا میں دور دور تک بکھیر دیگی۔ (راہب اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں) +

ایک راہب - (چلتے ہوئے) اتانئیل! ... کیا کسی نے اُس کو دیکھا ہے؟

پالیموں - اُسے واپس لوٹے بیس دن ہو چکے ہیں۔ لیکن اے بھائیو جس دن سے وہ واپس آیا ہے۔ نہ اُس نے کچھ کھایا نہ پیا ہے! اُسے جہنم پر جو فتح نصیب ہوئی ہے۔ اس نے اس کے جسم و روح کو چور چور کر دیا ہے +

[اتانئیل جھونپڑی سے باہر نکلتا ہے۔ جسم خمیدہ ہے۔ چہرہ تنا ہوا ہے نظریں مبہوت ہیں]

راہب - (ادب کے ساتھ) وہ آگیا!

[اتانئیل اُن کے بیچ میں سے اُن کو دیکھے بغیر گزر جاتا ہے]

چند راہب - اُس کا دھیان کہیں اور لگا ہے ---

چند اور راہب - وہ خدا میں محو ہے!

راہب - (چلتے ہوئے) اس کی خاموشی کا احترام کرو۔ اور اسے مت چھیڑو +

اتانئیل - (پالیموں سے عاجزی کے ساتھ) محترم باپ مجھے کچھ کہنا ہے۔ مجھے تم سے اپنے درد و کرب کا اعتراف کرنا ہے۔ اے پالیموں! تم جانتے ہو کہ میں نے سیہ کار تائیس کی روح پر فتح پائی۔ اس فتح پر مجھے فخر تھا اور میں شاداں تھا۔ اور پھر میں اس پرسکون صحرا میں واپس آیا۔ لیکن اب اطمینان قلب مجھ سے کوسوں دور ہے۔ میں نے اپنے نفس کو بیرحمی سے کچلا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اپنے جسم کو زخموں سے چور چور کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ میں کسی شیطانی جذبے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ اس عورت کے حسن کا تصور مجھے دیوانہ بنا رہا ہے۔ مجھے سوائے تائیس کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور اُس ایک ہستی میں مجھے جسم کی ہر لذت اور دنیائے حسن کا ہر جلوہ دکھائی دیتا ہے +

[شرم کے مارے پانی پانی ہو کر پالیموں کے قدموں پر گر پڑتا ہے]

پالیموں - (نرمی کے ساتھ) میں نے تم سے کہا نہ تھا "میرے بیٹے ہم راہبوں کو اس دنیا کے لوگوں سے احتراز واجب ہے۔ شیطان کے مکر سے خبردار رہو؟ تو پھر تم کیوں جانے پر تلے ہوئے تھے؟ آسمانی باپ تمہارا حامی و ناصر ہو! --- خدا حافظ +

[اتانئیل کھڑا ہو جاتا ہے۔ پالیموں اُسے گلے سے لگا کر چلا جاتا ہے۔ اتانئیل تنہا گھٹنوں کے بل چٹائی پر گر کر اپنے بازو پھیلا دیتا ہے۔ اور

اور خاموشی کے ساتھ خدا سے دعا مانگتا ہے۔ پھر ہاتھ باندھے لیٹ کر سو جاتا ہے]

[تھوڑی دیر کے بعد اندھیرے میں تائیس کا تصور چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے]

تائیس۔ (اتانئیل سے دلفریب اور زہد شکن انداز میں) تم کس لئے اسقدر غصے سے بھرے ہو؟ اور تمہاری آنکھوں میں جو روشنی چمک رہی ہے۔ اسے کیوں جھٹلا رہے ہو؟ ——

اتانئیل۔ (عالم خواب میں) تائیس!.....

تائیس۔ وہ کونسی منحوس حماقت ہے جو تمہاری تقدیر کے رستے میں حائل ہے؟ انسان عشق کے لئے بنا ہے۔ اور تم دھوکا کھا رہے ہو!

اتانئیل۔ (گھبرا کر جاگ اٹھتا ہے) ملعون شیطان۔ میرے سامنے سے ہٹ جا..... ! آہ میرا جسم پھک رہا ہے!

تائیس۔ (غصہ دلا کر) دنیس سے سرکشی کرنے والے۔ ہمت ہو تو آجانا!

اتانئیل۔ (سراسیمہ) میرا دم نکل رہا ہے! تائیس! میرے پاس آؤ!

[تائیس کا بلند قہقہہ سنائی دیتا ہے۔ اور اسکی شکل دفعۃً غائب ہو جاتی ہے]

[پھر ایک اور خواب صورت پذیر ہوتا ہے۔ آسمان نکھرا ہوا ہے اور سامنے البین کا گھر نظر آ رہا ہے +

ایک انجیر کے درخت کے سایے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے۔ اس کے ارد گرد راہب عورتیں گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں]

اتانئیل۔ (اس خواب کو دیکھ کر دہشت کے مارے چیخ مارتا ہے) آہ!

آوازیں۔ ایک مقدس ہستی اس دنیا سے رخصت ہونے والی ہے۔ سکندریہ کی تائیس مرنے کو ہے! تائیس مرنے کو ہے!

اتانئیل۔ (دیوانہ وار) تائیس مرنے کو ہے! تائیس مرنے کو ہے (غصے سے بیتاب ہو کر) تو پھر یہ آسمان گر کیوں نہیں پڑتا؟ سینوں میں دھڑکیوں باقی ہے روشنی میں چمک کیوں ہے۔ کون و مکان فنا کیوں نہیں ہو جاتے! تائیس مرنے کو ہے —! آہ ایک دفعہ پھر اس کو دیکھ لوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں — اسے گلے سے لگا لوں اسے اپنے پاس رکھ لوں — میں اسی کو چاہتا ہوں۔ میری عقل اندھی تھی جو اس سے پہلے میری سمجھ میں نہ آیا۔ کہ وہی میرا سب کچھ ہے — اس کا ایک بوسہ جنت سے بھی زیادہ عزیز ہے — میں اس کے سب چاہنے والوں کو ایک ایک کر کے قتل کر دیتا۔ نہیں تائیس ابھی نہ مرو۔ نہیں نہیں۔ میں تمہیں سینے سے لگا لونگا۔ میری ہو جاؤ! میری ہو جاؤ!!

[بھاگ اٹھتا ہے۔ اور رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے +

اندھیرا۔ سیاہ بادل۔ بجلی اور گرج +

موسیقی اگلے سین کے آغاز تک جاری رہتی ہے]

باب سویم

تیسرا منظر

[البین کے گھر کا باغیچہ +

ایک انجیر کے درخت کے سایے میں تائیس بے حس و حرکت پڑی ہے۔ گویا مردہ ہے +

راہب عورتیں اور البین اس کے ارد گرد جمع ہیں]

راہب عورتیں۔ (ہاتھ باندھے گھٹنوں کے بل کھڑی ہیں۔ اور زیر لب دعا مانگ رہی ہیں) اے خداوند۔ مجھ پر رحم کر! اے خدا اپنی محبت کے صدقے۔ اپنی رحمانیت کی طفیل میرے گناہوں کو دھو ڈال!

البین۔ (تائیس کو دیکھ کر) خدا بلا رہا ہے۔ اور آج رات یہ پاکیزہ چہرہ کفن کی سفیدی میں چھپ جائیگا۔ تین مہینے تک یہ راتوں کو جاگ جاگ کر دعائیں مانگتی رہی ہے۔ اور آنسو بہاتی رہی ہے۔ اس کا جسم نحیف و نزار ہے۔ لیکن اس کے گناہ سب دھل چکے ہیں +

راہب عورتیں۔ اے خدا مجھ پر رحم کر۔ اے خدا اپنی محبت کے صدقے!

[اتانئیل۔ زرد رو اور از حد مغموم باغ میں داخل ہوتا ہے۔ البین کو دیکھ کر سنبھل جاتا ہے۔ اور عاجزی کے انداز میں ٹھہر جاتا ہے۔ البین آگے بڑھتی ہے۔ اور راہب عورتیں اتانئیل اور تائیس کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں]

البین۔ (اتانئیل سے) محترم باپ۔ تمہارا آنا مبارک ہو۔ یقیناً تم اس مقدس ہستی کو برکت دینے کے لئے آئے ہو +

اتانئیل۔ (اپنی بدحواسی پر مشکل سے قابو پا کر)۔ ہاں..... تائیس!...

البین۔ تمہارے احکام کی پوری پوری تعمیل کرنے کے بعد اب وہ خدا کے دیدار سے مشرف ہونے والی ہے +

[راہب عورتیں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور اتانئیل کی نظر تائیس پر پڑتی ہے]

اتانئیل - (جیسے درد سے بیقرار ہو) تائیس !... تائیس !...

[بیتاب ہو کر منہ کے بل گر پڑتا ہے - ابیس اور راہب عورتیں پرے ہٹ جاتی ہیں - اور دعا میں مشغول ہو جاتی ہیں - اتانئیل بصد مشکل گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر اپنے بازو تائیس کی طرف پھیلا دیتا ہے]

اتانئیل - (بہت ہی ہلکی آواز میں) تائیس !——

تائیس - (آنکھیں کھول دیتی ہے - اور حسرت زدہ نظروں سے اتانئیل کے چہرے کو دیکھتی ہے) محترم باپ - تم ہو ؟ (اتانئیل کا جواب اسے بالکل سنائی نہیں دیتا) تمہیں وہ شاندار سفر یاد ہے - جب تم مجھے یہاں لے کر آئے تھے ؟

اتانئیل - میں تمہارے نسوانی حسن کے سوا باقی سب کچھ بھلا چکا ہوں +

تائیس - تمہیں وہ راحت اور آرام کی گھڑیاں یاد ہیں - اُس خیابان کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ؟

اتانئیل - (والہانہ) مجھے صرف وہ پیاس یاد ہے - جو تمہارے سوا اور کوئی نہیں بجھا سکتا +

تائیس - اور پھر تمہیں وہ مقدس الفاظ یاد ہیں - وہ جب تمہاری زبان سے بنے سچے عشق کی حقیقت کو پہچانا +

اتانئیل - (بیقرار ہو کر) میں تمہیں دھوکا دے رہا تھا +

تائیس - اور وہ دیکھو صبح ہونے آئی - مشرق کے شہابی رنگ کو دیکھو !

اتانئیل - نہیں نہیں - آسمان بے حقیقت ہے - سب کچھ ہیچ ہے - زندگی اور انسانی محبت کے سوائے باقی سب جھوٹ ہے - میں تم پر مر چکا ہوں !

تائیس - جنت کے دروازے کھل رہے ہیں - وہ دیکھو خدا کے فرشتے اور رسول آ پہنچے - وہ مسکراتے ہوئے - ہاتھوں میں پھول اٹھائے آ رہے ہیں +

اتانئیل - میری راحت میری زندگی میری بات سنو +

تائیس - (اٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے اور کانپ رہی ہے) دو سفید سفید پروں والے فرشتے آسمان میں اُڑ رہے ہیں - اور جیسا کہ تم نے کہا تھا - شفیع خداوندی اپنی نور کی انگلیوں سے میرے آنسو ہمیشہ کے لئے پونچھ رہا ہے +

اتانئیل - کہو کہ میں زندہ رہونگی - کہو کہ میں ابھی نہ مرونگی +

تائیس - سنہری ساز کا ترنم مجھے مسحور کر رہا ہے - معطر ہوائیں مجھے مست کر رہی ہیں - میری مصیبتوں پر آسمانی برکات کا نزول ہو رہا ہے - آہ - خداوند آہ - مجھے خدا نظر آ رہا ہے +

[مر جاتی ہے]

[اتانئیل چیخ کر گھٹنوں کے بل گر پڑتا ہے] (جملہ حقوق محفوظ)

تمت

انتباہ

سالنامہ کے تمام مضامین کے حقوق محفوظ ہیں (۲) افسانوں میں ...

ایڈیٹر

دسمبر ۱۹۲۷ء

ایک مصوّر کا تخیّل

پیغام

کانپتا ہوا شبنم کا قطرہ پھول سے محبت کا اظہار کرنے کو لبوں میں لفظ تول رہا تھا کہ ایک کرن آئی اُس نے اُسے کچھ کہہ دیا

اور وہ خاموش ہو گیا

مگر پھول کے کھلے ہوئے بازو ابھی تک کانپ رہے ہیں۔ اور وہ ہوا میں سر اُٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے +

خودی

شاہ بلوط کے درخت۔ نرجس کے بازو کہستان کی کھلی ہواؤں میں جھوم رہے ہیں۔ اپنے بازوؤں کو تمام خوبصورت پودوں اور خوشبودار پھولوں پر ترجیح دی۔ اور اپنی بلندی پہ ناز کرتے ہوئے منادی کر دی "ہماری دنیا میں، ہمارے بازوؤں پر، تمام رنگین خوش گلو طائر گاتے ہیں۔ بسیرا لیتے ہیں۔ کھیلتے پھرتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ اَور زور سے جھومنے لگا!

لالۂ صحرا جو بہت دور شباب کی مستی میں جھوم رہا تھا یہ سُن کر نشہ میں ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گیا۔ وہ کہنے لگا:۔

پرندوں کا سارا ترنّم ہماری مج میں ہے! چغتائی



الف لیلہ کی ایک رات



لال بجھکڑ

(حضرت احسن سنبھلی کے قلم سے)

لال بجھکڑ دراصل اگلے زمانے میں ایک مقدس ترین انسان کا خطاب تھا جس کی تحیر خیز ذہانت اور عقل فریب ذکاوت کی آج تک دھوم ہے۔ لیکن مورخین کی کوتہ نظری اور تعصب پرستی نے آج لال بجھکڑ کی زندگی پر ایسا پردہ ڈال رکھا ہے کہ اس نکتہ سنج شخص کے حالاتِ زندگی تاریخی روشنی سے قطعاً محروم ہیں +

اوّل تو تاریخی زمانہ کی عمر اتنی قلیل ہے کہ اس میں کسی قدیم الایام واقعہ کا صحت کے ساتھ درج ہونا غیر ممکن ہے۔ اور دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر کسی ایک واقعہ کو مختلف تاریخوں میں پڑھئے تو سلسلے کی اکثر کڑیاں آپ کو مختلف نظر آئینگی بات یہ ہے کہ تاریخیں عموماً مصنفین کی ذاتی آرا کا آئینہ ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ لال بجھکڑ کی ہستی مورخین کی فہم و فراست سے بالاتر ہو۔ اور اُنہوں نے مجرد فہم کی بنا پر اس معرکۃ الآرا موضوع سے دانستہ روگردانی کر لی ہو +

زمانۂ سلف کے متعلق جتنی تاریخیں ملتی ہیں۔ اُن کی بنیاد عموماً سنی سنائی باتوں پر ہوتی ہے۔ کسی واقع کی صداقت کسی مورخین کے زورِ قلم پر موقوف ہے۔ اکثر ان حضرات نے متعدد روایات سے مدد لی ہے تو اُن ہونی بات میں سچ، اور نہ سچا واقعہ بھی جھوٹا۔ اور یہی ایک معیار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جس پر کسی گذشتہ واقعہ کو پرکھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سست جلّی آدمی یعنی لال بجھکڑ کو سب سے پہلی تاریخ مرتب کرنے والے شخص نے عداوت یا لاعلمی کی بنا پر نظر انداز کر دیا ہو اس بنا پر مابعد کے مورخین کو اس واقع پر قلم اُٹھانے کی جرأت نہ ہوئی ہو ورنہ فہرست کے لحاظ سے۔ لال بجھکڑ کی شخصیت اس قابل نہ تھی کہ اس آسانی کے ساتھ تاریخ نگاروں کے تغافل کا شکار ہوتی۔ مگر سچ یہ ہے کہ زمانہ اہل کمال کا دشمن ہے +

کون اعتبار کر سکتا ہے کہ ست جگ کے راستباز انسانوں میں لال بجھکڑ ایک نمایاں شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اُن باتوں کو چشم زدن میں حل کر دیتا تھا جس کے سمجھنے سے اس وقت کے لوگ قاصر ہوتے تھے۔ وہ اُن پیچیدہ سی پیچیدہ گتھیوں کو آسانی سے سُلجھا دیا کرتا تھا جس کے سُلجھانے میں اُس کے معاصرین کا دماغ چکر گھنی بن جایا کرتا تھا۔ اس کی رائے دلائل و براہین کی محتاج نہ تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا۔ پورے وثوق سے کہتا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں خود اعتمادی کا عنصر غالب تھا۔ اسی لئے وہ اپنی نظر میں بھی ممتاز تھا اور اغیار کی نظر میں بھی۔ اُس کے خیالات کی پرواز صرف زمین ہی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ کبھی کبھی وہ فلکیات میں بھی دخل دیتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُس سے سوال کیا گیا کہ ہر مہینہ میں تو نیا چاند نکلتا ہے۔ آخر پرانا چاند کیا ہوتا ہے۔ لال بجھکڑ نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ میرے دوستو تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ کیا تم ستاروں کی کثرت نہیں دیکھتے۔ کیا آسمان سے ٹوٹنے والے ستارے نہیں نظر نہیں آتے۔ اتنا سمجھنے کے بعد معاملہ بالکل صاف ہے۔ اور آسانی سے یہ راز سمجھ میں آجاتا ہے کہ قدرت ہر مہینے پرانے چاند کو توڑ کر ٹوٹنے والے ستاروں کی جگہ پر کیا کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ آج ہم اور آپ اس جواب کو مضحکہ انگیز خیال کریں۔ لیکن اس کے مسکت اور تسکین بخش ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ زمین پر ہاتھی کے پاؤں کے نشانات دیکھ کر لال بجھکڑ کے زمانے والوں کو سخت حیرت ہوئی۔ کیونکہ ایسے زبردست جانور کا قیاس کرنا اُن کے لئے قطعاً ممکن نہ تھا۔ جس کے قدم کے نشانات سے زمین پر اتنے بڑے بڑے دائرے بن سکتے ہوں۔ ان مدوّر نقوش کو دیکھ کر ہر جیرت میں آگئی۔ اور سراسیمگی کے عالم میں لال بجھکڑ صاحب سے اس مسئلہ لاینحل کو حل کرنے کی درخواست کی۔ لال بجھکڑ صاحب نے ادھر ادھر سے ملاحظہ کیا۔ لیکن بات سمجھ میں نہ آئی۔ دفعتاً کچھ سمجھے اور چیخ اُٹھے

لال بجھکڑ بوجھ گئے اور نہ بوجھا کوئے
پاؤں میں چکی باندھ کے ہرن نہ کودا ہوئے

بات پتے کی تھی۔ سب کی سمجھ میں آگئی۔ اگر ضرور یہ کسی ہرن کی ستم ظریفی ہے۔ جس نے پاؤں میں چکی باندھ کر جست و خیز کی مشق کی ہے +

دسمبر ۱۹۳۸ء

کبھی کبھی لال بجھکڑ کو مجبوراً اپنے عجز کا بھی اعتراف کرنا پڑا ہے لیکن اس اعتراف میں بھی وہی شان خودداری اور اندیشانہ روش مضمر ہوتی تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ تالاب کے کنارے کسی مسافر نے اپنے کپڑے دھوئے۔ اور شلوار کے پائنچے باندھ کر سوکھنے کو لٹکا دیئے۔ ہوا کے جھونکوں کو شرارت سوجھی اور شلوار کے اندر سما گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شلوار کی ہئیت بدل گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ گویا دو ہوا کے تکیے دست و گریبان ہیں۔ یہ انوکھی چیز دیکھنے والوں کے لئے محیر العقل تھی۔ گھبرائے ہوئے لال بجھکڑ صاحب کے پاس پہنچے۔ اور عرض کی قبلۂ عالم ایک ایسی چیز آسمان سے نازل ہوئی ہے جس کا نظارہ ہماری مادی آنکھوں کو آج سے پہلے کبھی نہ نصیب ہوا تھا۔ لال بجھکڑ صاحب متانت اور ثقاہت کے ساتھ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تالاب کے کنارے تشریف لائے۔ دور سے نظارہ کیا پھولے ہوئے پائنچوں کی بے اختیار جنبش دیکھکر ہوش و حواس میں جنبش ہونے لگی۔ جواب کی کوشش میں عقل جواب دینے لگی۔ بے اختیار رو پڑے۔ ابھی آنسو آنکھوں سے باہر نکلے ہی تھے کہ پھر خود بخود ہنسی آگئی۔ لوگوں نے پوچھا حضرت یہ متضاد کیفیت کیسی۔ یہ بیک وقت انبساط و انقباض کے کیا معنی۔ بولے۔ ہائے تم لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ ابھی تو جو چیز تمہاری سمجھ میں نہیں آتی مجھ سے پوچھ لیا کرتے ہو۔ لیکن جب میں نہ ہونگا تو کس سے پوچھو گے۔ اس دل شکن خیال نے مجھے رلا دیا۔ لیکن جب میں نے اصل چیز پر غور کیا تو ہنسی آگئی۔ کیونکہ یہ دراصل مجھے بھی معلوم نہیں +

اس قسم کے واقعات تقریباً ہندوستان کے ہر گوشے میں مشہور ہیں۔ بلکہ اگر آپ ہمت کر کے ہندوستان سے باہر والے ممالک میں جستجو کی زحمت گوارا فرمائیں۔ تو شاید وہاں بھی "لال بجھکڑ صاحب" کے کارنامے کسی نہ کسی رنگ میں نظر آئیں گے۔ البتہ نام اور لقب کا فرق ہوگا۔ بہرحال لال بجھکڑ کی ہستی میں کوئی شبہ نہیں۔ ہاں یہ یقین دشوار ہے کہ وہ کس سنہ میں پیدا ہوئے۔ مرزبوم کے متعلق تو یہ متفق علیہ خیال ہے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اور اگر قیاس پر زور دیجئے تو غالباً یہ بھی مان لینا پڑیگا۔ کہ اودھ کے اس مشہور خرد پرور سرزمین کے آس پاس پیدا ہوئے ہونگے جس کی خاک پاک کا ہر ذرہ لال بجھکڑ کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ اور جہاں کسی زمانے میں پتھر کے کولھو کو امرود یا ناتھی سے تشبیہ دی گئی ہے +

بعض اہل تحقیق کا خیال ہے کہ سیمرغ اور عنقا کی طرح، لال بجھکڑ کی ہستی بھی موہوم شے ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں۔ شاہنامے والے سیمرغ کا وجود فرضی سہی۔ مگر بوستاں والا سیمرغ اب بھی کوہ قاف میں موجود ہے۔ سعدی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ سیمرغ در قاف قسمت خورد +

عنقا کا ذکر بھی اس تواتر سے زبانوں پر جاری ہے کہ اسے موہوم سمجھنا ظلم ہے۔ حضرت ذوق فرماتے ہیں کہ "عنقا ہماری تلاش میں گم ہوا ہے" اب خیال فرمائیے کہ جس چیز کا وجود ہی نہ رہا وہ گم کیونکر ہو سکتی ہے۔ لامحالہ حضرت ذوق کی تائید میں ماننا پڑیگا کہ عنقا پہلے تھا۔ لیکن جناب ذوق کی تلاش میں گم ہو گیا۔ اور پھر یہ گم ہونا بھی دائمی نہیں عارضی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ انہی گمگشتگی سے عاجز آکر کوہ قاف میں پھر نمودار ہو گیا ہو۔ حضرت ذوق کا پورا شعر سن لیجئے :-

جا بجا نام تو جوں نقش قدم چھوڑ گیا
خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈھنے عنقا ہم کو

جب سیمرغ اور عنقا کا وجود کسی نہ کسی حیثیت سے ثابت ہے تو لال بجھکڑ کی ہستی بھی تسلیم کرنی پڑیگی۔ اس کے علاوہ یہ تشبیہ بھی درست نہیں۔ لال بجھکڑ صاحب آدمی تھے۔ اور سیمرغ و عنقا جانور۔ آدمی کو جانور سے کیا نسبت۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ سیمرغ و عنقا چاہے ہوں نہ ہوں۔ لیکن لال بجھکڑ ضرور تھے۔ اور اب بھی دنیا میں ان کے ہزاروں جانشین موجود ہیں +

بعض دقیقہ سنج حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ لال بجھکڑ، خان بہادر، اور رائے بہادر کی طرح ایک اعزازی خطاب ہے۔ اور ہر دور میں ایسے خطاب یافتہ اشخاص مختلف قوموں اور فرقوں میں مبعوث ہو چکے ہیں۔ مثلاً ایک طرف امریکہ میں ڈارون، ہندروں کو انسان کا مورث اعلیٰ ثابت کرنے میں منہمک تھا۔ اور دوسری طرف یورپ میں ایک اور بالکمال پروفیسر اسی نتیجہ پر غور کر رہا تھا۔ گویا یورپ و امریکہ میں بہ یک وقت دو لال بجھکڑ موجود تھے۔ اسی موقع پر دور حاضرہ کے ایک سائنس داں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جو ان لال بجھکڑوں کی تعلیمات پر خط نسخ کھینچکر اس میدان میں کوس لمن الملک بجا رہا ہے۔ اور کہتا ہے کہ انسان بندر کی نسل سے پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا جد امجد مینڈک ہے +

ہم یہ کہہ چکے ہیں۔ کہ لال بجھکڑوں کے مورث اعلیٰ کا زمانہ تحقیق نہیں۔ مصریوں کی قدیم تمدن اور یونانیوں کے گذشتہ دور حکمت میں اس قسم کی دور اندیش ہستیوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ مصر قدیم کے دیوتاؤں کی موتیں اس دعوے کے ثبوت میں بغیر کسی پس و پیش کے پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان سب کا اختراع کسی ایسے ہی دماغ سے ہوا ہے۔ جس نے لال بجھکڑ ہونے کی کافی اہلیت موجود تھی۔ اسی طرح یونان قدیم میں فلکیات کی تحقیقات بھی اسی خیال کی مؤید تھی

بطلیموس اور اُس کے مؤیدین نے آفتاب کو ایک آسمانی گنبد مانا تھا جس سے آفتاب کا ریوتا کھیلا کرتا تھا۔ یہ کھیل روزانہ صبح کے وقت مشرق سے شروع ہوتا اور شام کے وقت مغرب میں ختم ہو جاتا تھا +

لیکن ہر دور کے لال بجھکڑوں کی خصوصیات میں کچھ نہ کچھ فرق بھی تھا۔ اور یہ فرق ہر زمانے کے تمدن اور معاشرت کے اعتبار سے تھا۔ آج کل پور ہین لال بجھکڑ مریخ کے باشندوں سے مراسلت قایم کرنے کی فکر میں ہیں۔ اپنا مزعوم کے ذریعے اس خونی ستارہ کے باشندوں کی معاشرت کا فرضی مشاہدہ کیا گیا ہے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اسی طرح روح کا مسئلہ بھی ہے۔ جو آجکل یورپ و امریکہ میں زیر بحث ہے۔ روحوں کو بلانے کی کوششیں ہو رہی اور دنیا کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ روحیں ہماری دعوت پر آتی ہیں۔ اور اپنے حالات خود بیان کرتی ہیں +

جس طرح تخیل انسانی کسی خاص دائرہ کے اندر محدود نہیں اسی طرح لال بجھکڑوں کی دنیا بھی لامحدود ہے۔ اس دنیا میں تمام انسانی ضروریات سے بحث کی جاتی ہے۔ اور ہر شعبے میں خواہ وہ علم سے متعلق ہو یا عمل سے۔ لال بجھکڑ حضرات کی موشگافیوں اور دقیقہ سنجیوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے ان کی تقسیم بھی جداگانہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً فلسفی لال بجھکڑ۔ مذہبی لال بجھکڑ۔ سیاسی لال بجھکڑ۔ طبی لال بجھکڑ۔ اخباری لال بجھکڑ۔ جوتشی لال بجھکڑ وغیرہ۔ اس مضمون مضمون میں اتنی گنجایش نہیں کہ ہر قسم کے لال بجھکڑوں پر تفصیلی تبصرہ کریں۔ ورنہر صنف بجائے خود ایک مستقل مبحث ہے۔ جوتشی لال بجھکڑوں کے خیالی کارنامے آئے دن دعویٰ بے دلیل کی طرح سامنے آتے رہتے ہیں۔ آج کسی صاحب نے جنگ کی پیشینگوئی کی۔ تو کل کسی صاحب نے وروِ قیامت پر تبصرہ کیا۔ پرسوں ایک حضرت نے فلکیات کے متعلق ایک نیا نکتہ بنا کر دنیا کو محو حیرت کر دیا۔ حالانکہ ان قیاسات سے عقل کو اتنا ہی تعلق ہوتا ہے جتنا ہرن کے پانوں کو چکنی کے پاٹ سے۔ ابھی چند برس گذرے ہیں کہ ایک ولایتی نجومی یعنی جوتشی لال بجھکڑ نے اعلان کیا تھا کہ بستی دُمدار ستارہ کی دُم زمین سے ٹکرائیگی اور زمین پاش پاش ہو جائیگی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بستی دُم دبا کر رخصت ہو گیا۔ اور دُنیا جوں کی توں رہ گئی۔ آج کل بھی روس کے ایک پروفیسر صاحب ایک ایسے زلزلے کی پیشین گوئی فرما رہے ہیں جس کے اثر سے دنیا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی لیکن دیکھئے پہلے دنیا ٹکڑے ہوتی ہے یا پروفیسر صاحب کے دماغ کے پرخچے اُڑتے ہیں +

سیاسی لال بجھکڑوں سے دنیا بڑی حد تک واقف ہو چکی ہے۔ اور اگر آپ بغیر چراغ کے بھی ڈھونڈیئے تو میدان سیاست میں سیکڑوں سیاسی لال بجھکڑ ٹھوکریں کھاتے نظر آئینگے۔ سوراج کی گذشتہ یورش اور تربیت کی فرسودہ کشمکش نے اس میدان کو سجا رکھا ہے۔ کیا آپ اُن خواب ہائے پریشان کو فراموش کر چکے ہیں جن میں تخت و تاج کے نظارے شامل تھے۔ کیا آپ کو وہ پیشینگوئیاں یاد نہیں جو ایک میعاد معینہ کے اندر آپ کو سرفراز حریت کر سکتی تھیں ممکن ہے کہ کوئی سیاسی لال بجھکڑ ہمیں فقدار قوم کہہ دے۔ لیکن یہ بات بھی اُسی دائرہ کے اندر ہوگی جس پر ہم بحث کر رہے ہیں +

مذہبی لال بجھکڑوں کا شمار بھی امکان سے باہر ہے مسیلمہ کذاب کی طرح ہزاروں مدعیان نبوت پیدا ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت بھی موجود ہیں۔ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں تو رسالت کے علاوہ الوہیت کے دعویدار بھی پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت حقانیت کی تلوار اپنا کام کر رہی تھی۔ اس لئے ساری لال بجھکڑی کا خاتمہ ہو گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عباسی درباروں میں کئی مرتبہ مذہبی لال بجھکڑ گرفتار کر کے لائے گئے۔ ایک مرتبہ ایک مدعی رسالت کے قتل ہونے کے بعد ایک مدعی الوہیت گرفتار کر کے لایا گیا۔ ہارون رشید نے کہا کیا تو نے اُس جھوٹے رسول کا حشر نہیں سُنا، جو ہمارے دربار میں تجھ سے پیشتر گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ خدائے خانہ ساز نے فوراً جواب دیا۔ حضرت آپنے اچھا کیا وہ ہمارا بھیجا ہوا رسول نہ تھا۔ اس ظریفانہ جواب پر خلیفہ کو ہنسی آگئی۔ اور اُس مذہبی لال بجھکڑ کی جان بچ گئی۔ اسی طرح دربار عباسیہ میں ایک اور مدعی الوہیت حاضر کیا گیا۔ خلیفہ نے کہا کیا تم کوئی ماری کرشمہ دکھا سکتے ہو۔ اُس نے کہا ہاں۔ خلیفہ نے فرمایا اچھا تو ایک خربوزہ پیدا کرو۔ چونکہ اس وقت خربوزے کی فصل نہ تھی۔ اس لئے اس جھوٹے خدا نے دو روز کی مہلت طلب کی خلیفہ نے فرمایا کہ اگر تم خدائی طاقت کے مدعی ہو تو تمہیں مہلت کی ضرورت نہیں چٹل خدا بول اُٹھا۔ واہ آپ کا خدا تو بایں ہمہ قدرت تین مہینے میں خربوزے تیار کرے۔ اور مجھے دو روز کی بھی مہلت نہ ہو۔ اس جواب پر خلیفہ ہنس پڑا۔ اور اس فرضی خدا کو آزاد کر دیا۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ خلیفہ کو اس مدعی الوہیت کے ظریفانہ جواب نے رہائی پر مجبور کیا نہیں بلکہ خلیفہ سمجھ گیا کہ یہ مذہبی لال بجھکڑ ہے۔ اور اسے زندہ رہنا چاہئے۔ اس کی ذات سے فتنے کا اندیشہ نہیں +

ہندوستان میں اس وقت بھی مذہبی لال بجھکڑ موجود ہیں۔ بمبئی کا خدا اب بھی گھوڑ دوڑ کے مزے اُڑا رہا ہے۔ کئی برس پہلے الہ آباد میں ایک فتری خدا موجود تھا۔ جس نے رنگون اور بمبئی کے بعض سیٹھوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا

دسمبر ۱۹۳۷ء

حیدرآباد سے ایک اور نبی کی بعثت کی اطلاع ملی تھی۔ اس کے صحیفۂ آسمانی کی ہمیں بھی زیارت نصیب ہو چکی ہے۔ آپ نے صرف رمضان کے تین روزے فرض بتائے تھے۔ صوبہ بہار میں بھی ایک نبی کا ظہور ہوا تھا۔ جو کتابوں کے ذریعہ اپنی تعلیمات کی اشاعت کرنا چاہتے تھے۔ ہماری نظر سے بھی اُن کی ایک کتاب گذری ہے۔ بہرحال ان مدعیان رسالت کو آپ کیا کہیں گے، یا تو انہیں نبیٔ برحق مانئے یا مذہبی لال بجھکڑ سمجھ کر چپ ہو جائیے۔ آجکل پونچھ صدود ریاست کشمیر میں بھی ایک مذہبی لال بجھکڑ موجود ہیں۔ جو مہدی آخر الزماں ہونے کے مدعی ہیں +

اسی سلسلہ میں شاعری کے لال بجھکڑوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے اس گروہ میں بعض ایسے ایسے جید لال بجھکڑ گذرے ہیں۔ جو در اصل چیستی تھی باتیں بنا دیا کرتے تھے مشہور ہے اکبر نے بارہا کبیشروں کی آزمائش کی لیکن جب اُس نے کسی واقعہ کے متعلق کسی کبیشر کو کوئی چھچھو دیا تو اُس نے اپنی کہنت میں سارا واقعہ کھول کے رکھ دیا۔ اسی طرح ہارون رشید کے درباری شعراء میں بھی بعض ایسے شاعر موجود تھے جو ایک ذرا سے اشارہ پر سب کچھ اپنی شاعری کے زور سے بتایا کرتے تھے۔ ایک دن خلیفہ نے ایک کنیز کے خلوتخانہ کو سرفراز فرمانے کا وعدہ کیا۔ لیکن یہ وعدہ آدھی رات کے وقت یاد آیا۔ خلیفہ اُسی وقت شبستان شاہی سے نکل کر اُس کنیز کے حجرے میں پہنچا۔ غریب کنیز بناؤ سنگار کئے ہوئے خلیفہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اور اسی حالت میں اُس کی آنکھ جھپک گئی۔ خلیفہ کی آہٹ پا کر اُس کی آنکھ کھل گئی اور بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلا۔

یا امین اللہ ماہذا الجسر

دوسرے روز خلیفہ نے یہ مصرعہ درباری شعرا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور درباری لال بجھکڑوں نے انکشاف راز میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگانا شروع کیا۔ کو شعرا تو اصل معاملہ کی تہہ کو نہ پہنچ سکے۔ لیکن ابونواس نے من وعن سارا ماجرا نظم کر دیا +

ممکن ہے کہ ان واقعات کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ ان باکمال لال بجھکڑوں کی شخصیت عام لال بجھکڑوں کے زمرے میں نہیں آتی۔ کیونکہ یہاں صداقت کا جلوہ ہے اور وہاں کذب وافترا کا۔ لیکن اگر ذرا چشم تامل سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ سلسلہ ایک ہے۔ کوئی کڑی منبسط ہے اور کوئی پھس پھسی۔ اس قسم کے لال بجھکڑ، لال بجھکڑوں کی ہر صنف میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً کوئی نجومی ایسا بھی ہوتا ہے جس کی قیاسی تگ و دو منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے اور اس کی پیشین گوئیاں صحیح نکلتی ہیں یا کسی صوفی لال بجھکڑ کے منہ سے اپنے معتقدوں کو بھانپنے کے لئے اتفاقیہ طور پر کوئی ایسی بات بھی نکل جاتی ہے جو ہو بہو صحیح نکلتی ہے۔ یا کوئی اخبار نویس اپنے ایڈیٹوریل نوٹ میں کوئی ایسی بات بھی لکھ جاتا ہے۔ جو صحیح ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ صوفی یا جوتشی یا اخبار نویس زمرہ لال بجھکڑوں سے خارج کر دیا جائے۔ کیونکہ کسی کے کیرکٹر کا اندازہ عام حالات پر موقوف ہوتا ہے۔ نہ کہ خاص واقع پر۔ بہرحال مذکورہ بالا شعرا بھی لال بجھکڑوں کی صف سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے قیاسات متحد بہ صداقت تھے اور شاعری کے عام لال بجھکڑ صداقت سے بہت کم سروکار رکھتے ہیں۔ اور ان کے قیاسات کی بنیاد نرے مبالغہ پر ہوتی ہے۔ بیشک گروہ شعرا میں ایسے لال بجھکڑ بہت کم ملتے ہیں۔ کیونکہ شاعروں کو عام حالات کے انکشاف سے زیادہ اپنے جذبات وقابلیت کی پردہ دری سے کام پڑتا ہے۔ چنانچہ شاعری کا لال بجھکڑ پرائے جذبات کی نقالی اور اپنے مخصوص انداز بیان سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ مجازی باتوں کو حقیقت سے تعبیر کرتا ہے۔ اور بیک وقت عاشق، صوفی، شرابی، بیمار وغیرہ سب کا روپ بھر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کے لال بجھکڑوں کو پیشین گوئی یا انکشاف راز سے تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ زیادہ تر فرضی جذبات وخیالات کو نظم کرتے رہتے ہیں۔ اب تک اس دنیا میں صرف ایک شاہ صاحب کا قصیدہ مشہور ہے جس میں قیامت تک کی پیشینگوئی موجود ہے۔ لیکن اسے الشاذ کالمعدوم کے دائرے میں محدود سمجھئے۔ اس موقع پر ہم ایک اور نکتہ آپ کے ذہن نشین کر دینا چاہتے ہیں تاکہ لال بجھکڑوں کی شناخت میں آپ کو زحمت نہ ہو۔ جب کبھی آپ کسی لال بجھکڑ کو پرکھنا چاہیں تو پہلے یہ دیکھئے اور یہ دیکھنے کہ وہ اپنے خاص فن میں کسقدر مبالغہ واغراق یا تخیل لامکان پرواز سے کام لیتا ہے۔ مثلاً ایک فلسفی لال بجھکڑ سے ایک صوفی لال بجھکڑ کا تقابل بالکل فضول ہے۔ کیونکہ دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ اسی طرح شاعری لال بجھکڑ بھی اپنی نوعیت خصوصیت میں اور شعبوں کے لال بجھکڑوں سے بالکل متضاد ومختلف ہوتا ہے وہ اپنے کمال شاعری اور انداز بیان سے پہچانا جاتا ہے +

طبقی لال بجھکڑوں کے واقعات نہایت مضحکہ خیز و عبرت انگیز ہیں۔ کیونکہ ان کی جودت طبع اکثر دوسروں کے لئے جانستاں ثابت ہوتی ہے۔ یہ حضرات اپنے قیاسات کی بنیاد پر چاہے ہزیانی کیفیت کو سرسام بتائیں

یا حل کو استثنا سے تعبیر کریں۔ لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ حکیم صاحب کی بات سے انکار کر دے۔ تشخیص و علاج میں بھی وہی مطلق العنانی و خود رائی برتی جاتی ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ مریض اچھا ہو جائے تو حکیم صاحب کی کرامت ہے ورنہ خدا کی قدرت اور مریض کی قسمت۔ حکیم صاحب کی لال بجھکڑی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ حکیم صاحب کا ہاتھ نبض پر پہنچا اور غریب مریض کے معدے میں بُوسٹ شروع ہے۔ جگر کا فعل ماؤف ہونے لگا۔ تسخیر دماغ کی طرف سود کرنے لگی۔ بیچارہ مریض ان باتوں کو کیا جانے۔ حکیم صاحب نے جو گھاس پات تجویز کر دیا۔ اُسی پر ایمان لایا۔ مشہور ہے کہ ایک حکیم صاحب کسی مریض کو دیکھنے تشریف لے گئے۔ صاحبزادۂ بلند اقبال بھی ساتھ تھے۔ آپ نے مریض کی نبض دیکھ کر فرمایا۔ شاید تم نے آج گنے کی گنڈیریاں کھائی ہیں۔ اس وجہ سے نبض میں سرعت ہے۔ مریض نے متحیر ہو کر کہا۔ ہاں حکیم صاحب میں نے صرف ایک گنڈیری کھائی تھی۔ چھوٹے حکیم صاحب ان باتوں کو غور سے سُن رہے تھے۔ کیونکہ انہیں بھی ایک نہ ایک دن لال بجھکڑی کے فرائض انجام دینے تھے۔ گھر آ کر والد ماجد سے پوچھنے لگے۔ ابا جان۔ آپ نے کیوں کر پہچان لیا کہ اسے گنا کھایا تھا۔ کیا اس کی نبض نے بتا دیا تھا۔ حکیم صاحب بولے کیا سب باتیں نبض ہی بتا دیا کرتی ہے۔ ارے میاں قیاس و تجربہ بڑی چیز ہے۔ میں نے مریض کے پلنگ کے پاس گنے کے چھلکے دیکھے تھے۔ قیاس ہوا کہ اس نے ضرور گنا کھایا ہوگا۔ صاحبزادے نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ اور لال بجھکڑ کے مدارج طے کرنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد حکیم صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور صاحبزادۂ بلند اقبال باپ کی جگہ پر بیٹھ کر طبابت کے فرائض انجام دینے لگے۔ ایک دن کسی مریض کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگے۔ اتفاقیہ نمدے کا ایک ٹکڑا نظر آیا۔ کُرک کر بولے۔ بھائی اگر تم نمدے کھایا کرو گے تو علاج ہو چکا۔ مریض بولا۔ جناب حکیم صاحب۔ نمدا بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ حکیم صاحب بولے۔ چاہے تم کچھ کہو لیکن تم نے نمدا ضرور کھایا ہے ✣

لیکن یونانی اطبا میں لال بجھکڑوں کی تعداد بمقابل ڈاکٹروں کے بہت کم ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کا مقیاس الحرارت بگڑ جائے یا غلط کام دے۔ تو آپ کے قیاسات کی دنیا میں خاک اُڑنے لگتی ہے۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کسی ڈاکٹر صاحب کا تھرمامیٹر بگڑ گیا تھا۔ آپ نے ایک معمولی بخار کے مریض کا درجۂ حرارت ایک سو سو ڈگری سے اونچا تجویز کیا۔ جب ڈاکٹر صاحب موصوف کی تشخیص ایک بڑے لال بجھکڑ نے سُنی تو اس نے علاج کے لئے بجائے کونین کے آگ بجھانے والا انجن تجویز کیا۔ بہرحال ڈاکٹر حضرات تشخیص و علاج میں بالکل مطلق العنان ہیں۔ اور اسی نسبت سے اگر انہیں بڑے لال بجھکڑ کہیں تو بیجا نہیں ✣

اگر آپ لال بجھکڑ حضرات کی تاریخ لکھنا چاہیں تو بسم اللہ کر کے آج ہی سے کمر ہمت باندھ لیجئے۔ افیونیوں کے زمرے میں بیٹھئے۔ چانڈو خانے کی سیر کیجئے نجومیوں سے گفتگو کیجئے۔ پھر انشاء اللہ آپ کو زیادہ زحمت نہ ہوگی۔ لیکن سب سے پہلے سر جھکا کر یہ غور کر لیجئے کہ آپ میں خود لال بجھکڑ بننے کی کہاں تک صلاحیت موجود ہے ✣

راقم ایک لال بجھکڑ

اوسکر وائلڈ

خوبصورت جسم کے لئے اس جہان میں آرام لکھا ہے۔ لیکن روح کے لئے تکلیف ✣

رازِ حیات دُکھ اور تکلیف میں پنہاں ہے۔ اور یہی دُکھ دنیا کی ہر چیز میں پوشیدہ ہے قیدخانہ کی زندگی ہمکو یہ سبق دیتی ہے کہ ہم اس جہان اور اُس کے معاملات کو کس نظر سے دیکھیں ✣

اے انسان غور کر کیا مصیبت کا بھیجنے والا تجھ سے عقلمند نہیں ✣ اوسکر وائلڈ

چچا چھکّن نوچندی دیکھنے چلے

خدا نہ کرے۔ جو چچا چھکّن کو کہیں کا سفر درپیش ہو۔ وہ آفت مچاتے اور دھوکہ دھیا کرتے ہیں۔ کہ خدا کی پناہ! بڑے شکر کا مقام تو یہ ہے۔ کہ خود سفر سے کتراتے ہیں۔ چھنّو آپا کی شادی ہوئی۔ چچی بیچاری جانا جانا کرتی رہ گئیں۔ پر چچا نے لکھ بھیجا۔ "ننھی کو گئے دنوں پسلی ہو گئی تھی۔ حکیم جی ابھی سفر کی اجازت نہیں دیتے۔" بنّو آپا کے ہاں پہلوٹھی کا لڑکا ہوا۔ چچی غریب نے بچے کے لئے کچھ نہیں تو درجن بھر جوڑے تیار کئے ہوں گے۔ خود لے کر جانا چاہتی تھیں۔ پر چچا نے عین وقت پر ارادہ فسخ کر دیا۔ پارسل کے ساتھ خط میں لکھ بھیجا۔ "چھٹن کی باری ابھی نہیں ٹلی۔ مجبور ہوں کو نہیں آسکتا۔"

چچی غریب کا کہنا تو بآسانی ٹل جاتا ہے۔ پر جہاں کہیں یاروں دوستوں نے کسی میلے یا عرس پر جانے کی تیاریاں کیں۔ چچا سے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ ذرا وہاں کی رونق اور گرانگھی بیان کر دی۔ ساتھ ہی طعنہ دیا۔ "اماں جا چکے تم۔ گھر سے اجازت ہی نہیں ملنے کی۔ ڈانٹ دیں گی بیگم صاحبہ۔" بس تڑپ اٹھے چچا۔ "واہ! وہ نیک بخت تو خود مجھ سے کہتی رہتی ہے۔ کہ کبھی گھر سے نکلا بھی کرو۔ اور اگر نہ بھی کہتی ہو تو میں کسی کا بندھا غلام ہوں۔ کہ جی چاہے اور نہ جاؤں؟ بھئی تمہیں ہماری ہی قسم جواب جانے کا ارادہ ملتوی کرو۔"

یہ صورت حالات ہو تو اللہ ہی نے کہا ہے۔ کہ اس قسم کے ہر سفر پر چچا اور چچی میں کھٹ پٹ ہو جائے۔

ابھی پچھلی ہی نوچندی پر مُنّے مرزا اور نوشاہ میاں نے میرٹھ چلنے کی ٹھانی۔ چچا سے ٹھہری ان کی دانت کاٹی روٹی۔ دو چار فقرے جو گسے۔ تو چچا چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ شام کو روانگی کا ارادہ تھا۔ صبح ناشتہ کے وقت باتوں باتوں میں چچی اماں سے اس کا ذکر کیا۔

"وہ مُنّے اور نوشاہ جا رہے تھے نوچندی میں۔ کہو تو ہم بھی ہو آئیں؟"

چچی اماں بھڑک اٹھیں۔ "اللہ سمجھے اس مُنّے اور نوشاہ سے۔ خدائی خوار کہیں کے۔ کبھی کوئی نیک راہ نہ دکھائی۔ میں کہتی ہوں۔ یہ تو تمہاری عمر بال کھچڑی ہو گئے۔ خیر سے کئی کئی بچوں کے باپ بن چکے۔ ابھی میلے ٹھیلے کا شوق نہیں گیا؟ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ کہ کہو تو ہم بھی ہو آئیں۔ جیسے میرے ہی کہے میں تو ہیں۔ گنبے میں شادی غمی کے بیسیوں موقعے گزر گئے۔ کہتی رہ گئی۔ کہ وقت گزر جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ بس ایک دو روز کے لئے مجھے لے چلتے۔ ٹلا ٹلا دیا۔ غضب خدا کا سفید بال ہوتے جھوٹے بہانے لکھ لکھ بھیج دیئے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ آج نوچندی کے لئے مجھ سے پوچھنے آئے ہیں۔ کہ کہو تو ہم بھی ہو آئیں! شوق سے جاؤ۔ میں نے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں؟ میرا کیا ہے۔ دنیا کہے گی۔ بوڑھے منہ مہاسے۔ باسی کڑھی کا اُبال۔ پڑی کہے۔ مجھے تو جب خیال ہوتا۔ جو میرے کہے میں ہوتے۔"

ایسے موقعوں پر بچے غریب ضرور کوئی خطا کر بیٹھتے ہیں۔ چھٹن دکھیا صحن میں بیٹھا مرغی کے بچوں کو دانہ کھلا رہا تھا۔ چچا کی نظر پڑ گئی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے چھٹن؟ بس صبح ہوئی نہیں اور تیرا مرغی کے بچوں کا کھیل شروع ہو گیا۔ تختی لکھ لی؟ آموختہ دہرایا؟ نالائق کہیں کا۔ سال بھر ہو گیا مولوی صاحب سے پڑھتے پڑھتے۔ ابھی نام تک لکھنا نہیں سیکھا۔ جب دیکھو مرغی کے بچوں کا کھیل جب دیکھو مرغی کے بچوں کا کھیل۔ یہ ہوتے ہیں اشرافوں کے۔ بچوں کے لچھن۔ مرغ باز بننا ہے تجھے؟ اٹھ یہاں سے۔ چل اپنی کتاب پڑھ۔"

اس کے بعد چچا امامی کو حقہ تازہ کرنے کا حکم دے کر دیوان خانے میں چپ چاپ جا بیٹھے۔

گھنٹے بھر کے بعد چچی نے گزرتے گزرتے دیوان خانے کا کواڑ کھول کر پوچھا۔ "وہ کیا اسباب جائے گا ساتھ؟ بتا دیتے تو بندھ جاتا۔"

چچا نے بیٹھے بیٹھے کڑک کر جواب دیا۔ "میں نہیں جا رہا۔"

چچی اندر چلی گئیں۔ بولیں "یہ بگڑ کس بات پر بیٹھے؟ اے بس اتنی ہی بات میرے منہ سے نکل گئی نہ۔ کہ کنبے میں سے بلاوے آئے۔ تو ٹال ٹال گئے۔ اور نوچندی جانے کی جھٹ پٹ تیاری کر لی۔ تمہیں کہو کچھ جھوٹ کہا تھا میں نے؟"

چچا نے بگڑ کر کہا۔ "بس کان نہ کھاؤ میرے۔ کہہ جو دیا۔ میں نہیں جا رہا۔"

چچی کو بھی غصہ آ گیا۔ "نہیں جاتے نہ جاؤ۔ میری بلا سے۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی ——— اور نہیں تو۔"

یہ کہہ چچی زور سے کواڑ بند کر اندر چلی آئیں۔

ذرا سی دیر بعد مُنّے اور نوشاد آ پہنچے۔ دروازے کی چق اُٹھا کر باہر ہی کھڑے کھڑے بولے "بس بس بیٹھیں گے نہیں۔ اس وقت پوچھنے آئے تھے۔ کہ تیار ہو۔ کہیں عین وقت پر بہانے بنانے بیٹھ جاؤ۔ ساڑھے چار چھوٹ جاتی ہے گاڑی۔ ذرا اس کا خیال رہے"۔

دوپہر تک چچا دیوان خانے ہی میں بیٹھے رہے۔ دے حقہ پہ حقہ اور پان پہ پان۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں منگوایا۔ امامی جھوٹے برتن اُٹھا کر چلنے لگا۔ تو اُس سے کہا "دیکھ بیوی سے جا کر کہہ دے۔ اسباب بندھ جائے گا آپ بس ہاشتہ سا انتظام کر دیجئے گا"۔

پیغام بھیج کر چچا کان کواڑ سے لگائے سنتے رہے کہ کیا جواب ملتا ہے۔ چچی سن کر چپ ہو رہیں۔ تو آپ کواڑ کھول اندر آ گئے۔ دو ایک مرتبہ زنان خانے سے مردانے میں اور مردانے سے زنان خانے میں آئے گئے۔ کبھی رستے میں تھم گئے۔ مڑنا چاہا۔ نہ مڑے۔ بڑھے چلے آئے۔ پھر یک لخت مڑ گئے۔ کھڑے ہو کر پل بھر داڑھی کے بالوں میں سے تھوڑی کھجلائی۔ پھر سیدھا اپنے کمرے کا رستہ لیا۔ ذرا سی دیر کے بعد گُرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر سینہ کھجلاتے ہوئے باہر نکل آئے۔ کچھ دیر چبوترے پر کھڑے رہے۔ پھر غرّب سے اندر۔

آواز آئی "او امامی! یہاں آئیو!"

گھر بھر کے کان کھڑے ہوئے۔ کہ ہوئیں سفر کی تیاریاں شروع۔

"ذرا جائیو تو بھاگ کر الانجش درزی کے ہاں۔ کہنا میاں آج تو چندی میں جا رہے ہیں۔ انگرکھا سِل گیا ہو۔ تو دیدے۔ اور نہ سِلا ہو تو یاد کر کے کہہ دیجو۔ میاں کہتے تھے۔ سلائی نہیں ملنے کی سمجھ گیا؟"

ادھر امامی رخصت ہوا۔ اُدھر مودے کی باری آئی "مودے! ارے او مودے! یہاں آئیو! جانا ذرا مانا دین کے ہاں۔ پرسوں اُس نے وعدہ کیا تھا کہ آج ہمارے کپڑے دھو کر دے دیگا۔ اُس سے کہیو۔ میاں آج نوچندی میں جا رہے ہیں۔ کپڑے دُھل گئے ہوں تو دیدے۔ سمجھ گیا؟ جائیو تو چھپاک سے۔ اور ہاں سننا۔ دو جوڑے میں ہمارے۔ ایک میں غرارہ ہے۔ اور ساتھ ایک انگرکھا ہے ——— بٹی ہے۔ وہ امامی چلا گیا درزی کے ہاں؟ اب کیا کروں؟ یہ بندو کہاں گیا؟ او بندو! ارے بندو جانا تو بھاگ کے امامی کے پیچھے الانجش درزی کے ہاں۔ اور اُس سے کہیو۔ کہ ایک انگرکھا جو نمونے کا دے رکھا ہے وہ بھی دے دے۔ میاں نوچندی میں جا رہے ہیں۔ نیا انگرکھا سلا ہوا نہ ملا ہو۔ نمونے کا انگرکھا لے لینا۔ سمجھ گیا؟ دوڑ کر جا ——— ہاں تو کہو امامی

سے کہ میاں نوچندی میں جا رہے ہیں۔ سمجھ گیا؟ دو جوڑے۔ ایک انگرکھا۔ ایک رومال۔ ایک بنیان۔ ایک ازار بند۔ سب چیزیں گن کر لیجو۔ اور دیکھنا راستے میں کچھ گرا نہ دینا۔ دیکھوں تو کتنی جلدی آتا ہے"۔

ملازم کام پر روانہ ہو گئے۔ تو اب گھر کے لوگوں کی باری آئی۔ "ارے بھئی کہاں چھپ کر بیٹھ رہے تم سب لوگ؟ کام نظر آیا اور بس ہوئی روح فنا۔ یوں نہیں کہ مل جل کر ختم کر دیں قصّہ۔ ارے بھئی یہاں آؤ۔ تم میرا بستر اُٹھا کر لاؤ۔ تم بتو بیٹی! جاؤ۔ تم غسل خانے میں سے ہماری صابن دانی۔ منجن کی ڈبیا اور تولیا لے آؤ۔ چھٹن! ارے او چھٹن! جانا اپنی اماں کے کمرے میں۔ وہاں سے ہمارا آئینہ۔ کنگھا اور تیل کی شیشی اُٹھا لا۔ سب چیزیں لا کر یہاں فرش پر رکھ دو۔ اور یہ تم کہاں چلے دو دو؟ ارے بھئی کہا جو ہے کہ ٹھہرے رہو تھوڑی دیر یہیں۔ جانتے ہو شام کی گاڑی سے نوچندی جا رہا ہوں۔ کام ہی یہ کثرت ہے اور سرک چلے۔ جاؤ میرا کیس اُٹھا کر لاؤ۔ اور پھر اپنی چچی اماں سے جا کر کہنا بچی دھلائی آئی تھی۔ تو ہمارے دو رومال آپ کے کپڑوں میں چلے گئے تھے۔ وہ نکال دیں ——— بتو بیٹی لے آئیں سب چیزیں؟ شاباش شاباش۔ یہاں رکھ دو پر یہ کیا اُٹھا لائیں تم؟ یہ میری منجن دانی ہے یا سامنے رکھی ہوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔ ارے چھٹن کون سا آئینہ اُٹھائے لا رہا ہے بھئی بڑا پریشان کیا ہے ان لوگوں نے۔ ارے احمق ہمارا آئینہ۔ ہمارا آئینہ!"

گھنٹے بھر کی تو تو مَیں مَیں کے بعد کہیں سب چیزیں کمرے میں جمع ہوئیں اور چچا نے اُنہیں کیس میں رکھنا شروع کیا۔ تمام فوکر اور بچے اردلی میں موجود۔ چیزیں زیادہ۔ کیس میں جگہ کم۔ چچا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انہیں ٹھونس رہے ہیں پر کسی طرح نہیں سماتی ہیں۔ زور لگا لگا کر سُرخ لال ہو رہا ہے۔ پیشانی سے پسینہ کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ایسے موقع پر کسی بچے کو ہنسی آ جانا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ چچا چونک کر مڑتے ہیں "کون تھا یہ؟ نالائق۔ بدتمیز کہیں کے ہنسی کی کیا بات تھی؟ کوئی تماشہ ہو رہا ہے یہاں؟ ریل کا وقت سر پر آ گیا ہے۔ اور انہیں ہنسی سوجھ رہی ہے۔ نکلو یہاں سے۔ باہر جا کر ہنسو"۔

اِدھر کمرے میں سے قافلہ نکلتا ہے۔ اُدھر آواز آتی ہے "ارے کم بختو۔ کہاں جا کر مر رہے سب کے سب ہو او امامی! ارے او بندو! سانپ سونگھ گیا کیا؟ یہاں آ کر کیس کا ڈھکنا بند کراؤ۔ بیٹھو اس کے اوپر چڑھ کر"۔

کیس بند ہو چکا۔ تو اب بستر کی باری آئی "اے یوں نہیں۔ یوں۔ اس طرح موڑ۔ اندھے ادھر دیکھ۔ میں کیا کر رہا ہوں۔ اب لپیٹ۔ اچھی طرح دبا کر۔

جان بھی ہے ہاتھوں میں؟ کھا کھا کر سانڈ تو بن گیا ہے۔ اور بستر نہیں لپٹ سکتا؟ ابے اس طرح۔ یوں۔ بس اب بیٹھا رہنا اوپر۔ ہلٹو ہی مت۔ میں نکالتا ہوں رسّی نیچے سے۔ ہا گدھے! ساری کی کرائی پر پانی پھیر دیا"۔

یہاں بستر ہی سے کُشتی ہو رہی تھی۔ اور باہر مُنّے مرزا اور نوشاہ میاں تیار ہو کر آ بھی پہنچے۔ آوازیں آنی شروع ہو گئیں "اماں چلو۔ اب کیا ہو رہا ہے اندر؟ آدھ گھنٹہ رہ گیا ہے ریل کے چھوٹنے میں۔ ارے بھئی کون سا مہینوں کا سفر ہے کہ رخصت ہونے میں گھنٹے صرف ہو گئے؟ اب نکل بھی چکو گھر میں سے۔ سامان تو بھجوا دو۔ کہ تانگہ میں رکھ دیا جائے"۔

اُدھر اندر چچا بستر باندھ رہے ہیں۔ ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔ اور پُکار پُکار کر احکام سُنا رہے۔ "اماں للّو۔ دیکھنا وہ ناشتہ بھی بندھ گیا۔ اپنی اماں سے کہنا ایک لوٹا اور ایلومنیم کا گلاس بھی نکال دیں۔ ارے بھئی ودّو۔ کسی سے کہو اسباب باہر پہنچانا شروع کرے۔ ہئی ہئی وقت تو بہت ہی تھوڑا رہ گیا۔ ارے بھئی کہہ دو باہر کہ بس ابھی آیا۔ ذرا میری اچکن اور ٹوپی کھونٹی پر سے اُتار دینا۔ اور اپنی چچی سے کہنا۔ کچھ روپے بھی سفر خرچ کے لئے نکال دیں۔ اماں آ رہا ہوں مُنّے۔ آ رہا ہوں تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اسباب باندھ رہا تھا۔ بس آیا"۔

اتنے میں چچی کمرے میں آ گئیں۔ بولیں "اور یہ نئی دھلی کی جوتی ساتھ نہ لیتے گئے؟"

چچا پاگلوں کی طرح مُڑ کر دیکھتے ہیں۔ تو جوتی بندھنے سے رہ گئی ہے۔ "اب کیا کروں؟ ریل کا تو وقت ہو گیا۔ اماں ٹھونس بھی دو بستر میں کہیں۔ نہ نہ یوں تو گر پڑے گی۔ تم کھول لو بستر۔ ارے بھئی جلدی کرو۔ ریل کا تو وقت ہو گیا۔ اماں آ رہا ہوں نوشے! چھٹن بیٹے باہر جا کر کہنا۔ اسباب باندھ رہے ہیں۔ ابھی آئے۔ اماں کھول بھی چکو بستر۔ لاحول ولا۔ ارے بھئی کاٹ دو رسّیوں کو۔ ذرا سا تو وقت رہ گیا ہے"۔

بستر کھلا پڑا تھا۔ کہ چچی پوچھ بیٹھیں "کوئی موزوں کی جوڑی بھی رکھ لی صندوق میں؟"

چچا بستر چھوڑ چچی کا مُنہ تکنے لگے "موزے؟ رکھ ہی لئے ہونگے ——— کہ اللہ جانے رہ گئے! کچھ یاد نہیں آتا۔ ارے بھئی کھولنا جلدی سے صندوق تم بستر باندھو للّو۔ یہ رہی چابی صندوق کی۔ کھولتا ہوں۔ ریل کا تو وقت ہو گیا۔ ارماں ودّو جا کر کہنا باہر کہ بس میں آیا کہ آیا۔ بنّو بیٹی۔ دیکھنا تو ذرا صندوق میں موزے۔ ارے بھئی بستر نہیں بندھا اب تک؟ اب کہیں باندھ بھی چکو۔ اس کونے میں دیکھو موزے۔ ہوں گے تو ادھر ہی ہوں گے۔ یہ رکھے تو ہیں۔ خواہ مخواہ وقت ضایع کرواتی ہیں۔ دوسرے کو تو نرا احمق سمجھ رکھا ہے۔ ارے بھئی بس بند کرو صندوق۔ یہ نفاستیں رہنے دو۔ چیزیں جیسی ہیں اب پڑی رہیں۔ خدا کے لئے تالہ لگاؤ تم۔ کہاں گیا تالہ؟ ارے بھئی تالا کون لے گیا۔ کس نے اُٹھا لیا تالہ؟"

لیجئے تالے کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ جسے دیکھئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرش پر تالہ تلاش کر رہا ہے۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ چچا میاں کے ہاتھ ہی میں تھا۔ چچا اچکن کی آستینوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے زنان خانے سے نکلے۔ تو انتظار کر کر کے مُنّے مرزا اور نوشاہ یہاں اسٹیشن پر جا چکے تھے۔

"ارے امامی لپک کر کوئی اکّا تو پکڑ۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھ۔ پیسے ٹھیک کر لیجو۔ تم عدد گنو للّو اور ہمارے ساتھ کون جائے گا؟ ودّو تم چلنا۔ اور تو امامی۔ اے لو وہ آ گیا اکّا۔ اسباب لا دو۔ تم سوار ہو جاؤ ودّو۔ تو بھی بیٹھ جا امامی۔ پیسے ٹھہرا لئے نہ اِکّے والے سے؟ لے میرا بھائی۔ اب ہوا کی طرح چل۔ نوچندی پر جا رہے ہیں ہم۔ ریل کا وقت ہو گیا ہے۔ اُڑ کر چل۔ رہ نہ جائیں گاڑی سے عدد گن لئے تھے ودّو؟ اور وہ پانوں کی ڈبیا؟ ہئی ہے۔ خیال ہی نہ رہا۔ چلو نوشے کے پاس ہونگے پان۔ ارے بھئی ذرا چال دکھا جانور کی۔ . . . ایسے نکمّے لوگ ہیں کہ خدا کی پناہ! بس ذرا سا کام ہو۔ بوکھلا جاتے ہیں۔ یوں نہیں۔ آرام آرام سے مزے مزے فارغ ہو جائیں۔ گھنٹوں پہلے تیاری شروع کرو۔ وقت پر وہی جھینکنا عاجز آ گیا ہوں میں تو"۔

خدا خدا کر کے کہیں اسٹیشن پر پہنچنا ہوا۔ وہاں قلیوں سے بات نہ ٹھہر سکی اچھی خاصی ردّ و قدح کے بعد بکس اور بستر امامی کے سر پر رکھ کر پُل کا رُخ کیا۔ وہاں بابو [illegible] ٹکٹ کے بغیر ریل کے سفر کی کوشش جرم ہے۔ چچا لاحول پڑھتے ہوئے [illegible] طرف دوڑے۔ بابو سے میرٹھ کا ٹکٹ مانگا تو معلوم ہوا کہ کل صبح سے پہلے کوئی [illegible] روانہ نہ ہوگی۔

سیّد امتیاز علی تاج

آنکھ کا نشہ

(حضرت آغا حشر کاشمیری کے شاہکار کی ایک جھلک)

[اُردو علم ادب کی کتنی بڑی بدقسمتی ہے۔ کہ اُردو زبان کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار حضرت آغا حشر کاشمیری کی تصانیف سے اب تک اُردو مطبوعات کا دامن خالی ہے۔ آپکی پچیس تیس تصنیفات میں سے ایک بھی صحیح طور پر طبع نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے دس پندرہ ڈرامے کتب فروشوں سے مل سکتے ہیں۔ لیکن ان کی حالت دیکھ کر شرم آتی ہے۔ یہ ردّی کاغذ۔ بدترین کتابت اور بھدّی طباعت کا نمونہ ہیں۔ یہ ڈرامے ناشروں نے بعض ایکٹروں کی "زبانی" جمع کر کے شایع کئے ہیں۔ اس لئے اصل ڈراما میں اور ان طبع شدہ ڈراموں میں بہت فرق ہے۔ اور اغلاط تو اسقدر ہیں کہ مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ حضرت آغا حشر کے ڈراموں کا اصلی رنگ روپ میں شایع نہ ہونا ملک کی بے حسی سمجھئے یا آغا صاحب کی شان استغنا۔ بہرحال اُردو علم ادب اپنے سب سے بڑے ڈرامہ نویس کے لٹریچر سے یکسر خالی ہے ✦

اس لئے اگر ہم آغا صاحب کے مشہور ترین ڈرامہ آنکھ کا نشہ کا ایک غیر مطبوعہ سین "براہ راست" حاصل کر کے شایع کر رہے ہیں۔ تو اس پر جسقدر بھی فخر کریں کم ہے۔ آج اُردو رسائل میں نیرنگ خیال ہی کو یہ فخر حاصل ہے۔ کہ وہ آغا صاحب کے شاہکار کا ایک منظر پیش کر رہا ہے۔ ایڈیٹر]

منظر۔ کام لتا کا مکان

[سدا رنگ کام لتا کی دودھ پیتی لڑکی کو گود میں کھلا رہا ہے]

سدا رنگ

رسیلی آنکھیں۔ جُٹواں بھویں۔ پتلے پتلے ہونٹ چنبیلی کی سفیدی اور گلاب کی لالی سے بنا ہوا گورا رنگ کیلے کے پتے جیسے چکنے چکنے ہاتھ پاؤں۔ ارے میری درشنی ہنڈی! آجکل اس شہر کے سیٹھ ساہوکاروں کے پاس بہت روپے ہو گئے ہیں۔ تو کب جوان ہوگی اور کب ان کا دیوالہ نکالے گی؟

[بینی داخل ہوتا ہے]

بینی

اوہ کتنی بے مروّت۔ آدمی کے چہرے پر طوطے کی آنکھیں لگی ہوئی نہ دیکھی ہوں۔ تو ان رنڈیوں کو دیکھ لو۔ یہ محبت بھرے ہوئے دل کو نہیں دیکھتیں روپے سے بھری ہوئی جیب کو دیکھتی ہیں ✦

[راج کنور داخل ہوتی ہے]

راج کنور

لال۔ نیبو سے چٹنی کا اور لڑائی سے پیار کا مزا بڑھ جاتا ہے۔ بگڑ کر جاتے کہاں ہو؟

سدا رنگ

کیا ہوا بینی بابو؟

بینی پرشاد

ہوا کیا۔ تمہاری چھوٹی بائی جی نے ہیرے کی کنگھی اور جڑاؤ ریسٹ واچ کی فرمایش کی تھی میں نے آٹھ دن کا سمے مانگا۔ بس اتنی ہی بات پر نتھنے پھول گئے۔ اور تیور بدل کر کہنے لگیں۔ کہ رنڈی گھر کی بیوی نہیں ہے کہ جو کھلاؤ گے کھائے گی۔ اور جو پہناؤ گے پہنے گی۔ رنڈی کی فرمایش نہیں دے سکتے تو رنڈی کے گھر آتے ہی کیوں ہو۔ کہو یہ اسے کہنا چاہئے تھا؟

سدا رنگ

بابو جی۔ یہ جگت تو لوہار کی دُکان ہے جس میں رات دن کھٹ پٹ ہوا کرتی ہے۔ ایک نے کہا آؤ جی۔ دوسرے نے کہا جاؤ جی۔ کو لڑائی نہیں کہتے۔

بینی

پھر کیا کہتے ہیں؟

سدا رنگ

اسے من رجھانے کا ڈھنگ اور رنڈی کا چوچلا کہتے ہیں ✦

[کام لتا داخل ہوتی ہے]

کام لتا

کیا ہے ماں؟

راج کنور

اب تم ہی مناؤ۔ یہ تو بگڑ کر چلے جا رہے ہیں۔

کام لتا

جا رہے ہیں۔ کہاں جاتے ہو؟

بینی

نرگ میں ✦

کام لتا

اچھی بات ہے۔ کل ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ آٹھ دن سے نرگ کے دروازے پر ٹو لیٹ لکھا ہوا ہے۔ جاؤ آرام سے رہو گے ✦

بینی

میں تمہارے ہتھکنڈے خوب سمجھتا ہوں جگل جیسا سیدھا سادا آسامی مل گیا ہے۔ اس لئے مجھ سے الگ ہونے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہو ——— سنو! جگل میرا دوست ہونے پر بھی آج تک میرے اور تمہارے پرانے سمبندھ کا حال نہیں جانتا جس

دن جان گیا۔ تمہاری صورت بھی نہ دیکھے گا +

کام لتا

(منہ بنا کر) اونہہ۔ یہ رس گلا جیسے گال سلامت رہیں۔ ایک مکھی جائیگی تو سو مکھیاں آجائینگی +

راج کنور

(گود کی بچی سے) ارے کیسی لڑکی ہے۔ ماں باپ لڑ رہے ہیں۔ اور تو ٹک ٹک دیکھ رہی ہے۔ لو اس برف کے ٹکڑے کو کلیجے سے لگاؤ۔ ابھی غصہ ٹھنڈا ہو جائیگا +

بینی

کام لتا۔ یہ میرے اور تمہارے پریم برکش کا اپوتر پھل ہے۔ نہ جانے پورو جنم میں اس نے کونسا اپرادھ کیا تھا۔ جو کسی شریف عورت کی کوکھ سے جنم لینے کے بدلے تم جیسی دیشیا کے گربھ سے جنم لیا + میں باپ ہونے کے ادھیکار سے اب اپنی سنتان کو تمہارے زہری دودھ سے نہیں پالنا چاہتا +

کام لتا

تو؟

بینی

آدمی کا بچہ بھیڑیوں کے بھٹ میں پل کر بھیڑیوں کے سبھاؤ کے سوا اور کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ اس لئے اپنی سنتان کا بھوش۔ اپنی عزت۔ اپنی مرجادا بچانے کے لئے اسے اپنے ساتھ لے جاؤنگا۔ میں یہ کبھی برداشت نہ کر سکونگا۔ کہ یہ بڑی ہو کر کل ودھو بننے کے بدلے تم جیسی دیشیا بنے +

کام لتا

یہ وچار آج آیا؟ کبھ کرن کی نیند لنکا جل چکنے کے بعد کھلی؟ بابو صاحب یہ بات اسی روز سوچنی تھی۔ جب ماں باپ کی کمائی کے پوتر روپے جیب میں ڈال کر پہلی مرتبہ رنڈی کے کوٹھے کی طرف آنکھ اٹھائی تھی۔ رنڈی کے گربھ سے جنم لینے والی کنیائیں آکاش سے نہیں گرتیں۔ تم ہی جیسے دھنوان کلوان پرشوں کی سنتان ہوتی ہیں۔ جو لوگ اپنے کل کو کلنک لگانا۔ رنڈی کی لڑکی کا باپ کہلانا۔ دیشیا کے پیٹ سے جنم لینے والی اپنی سنتان کو کوٹھوں پر نچوانا نہیں چاہتے۔ انہیں رنڈی کی چوکھٹ پر پاؤں ہی نہ رکھنا چاہئے +

بینی

جو نہ ہونا چاہئے تھا۔ ہو چکا۔ لیکن اب ——

کام لتا

بینی پرشاد جی۔ رنڈی کے گھر کو کبوتر کی چھتری کہتے ہیں۔ تمہارے پاس کیا پرمان ہے کہ یہ تمہاری لڑکی ہے؟

بینی

اس کے جنم لینے کے چھ مہینے بعد۔ تم نے میرے نام کا پہلا اور دوسرا اکشر اس کی کلائی پر کھدوا دیا تھا۔ یہ دیکھو بینی کا بی۔ اور پرشاد کا پی۔ کیا ان اکشروں کے ہوتے ہوئے بھی کسی اور پرمان کی آوشکتا ہے؟

کام لتا

کلائی پر کھدے ہوئے دو اکشروں سے لڑکی پر ڈگری مل سکتی ہے۔ تو جاؤ عدالت میں دعویٰ دائر کرو۔ کیا تم نہیں جانتے۔ کہ میں نے اب تک اس کے لالن پالن پر ہزاروں روپے خرچ کئے ہیں +

بینی

وہ روپے بھی تمہاری تجوری سے نہیں میری ہی جیب سے نکلے تھے۔ پھر بھی لڑکی کے بدلے تم پانسو مانگو۔ تو میں پانچ ہزار دینے کو تیار ہوں +

کام لتا

پانچ ہزار؟ — بس اتنا ہی؟ ارے اسے جوان تو ہونے دو۔ جس دن یہ اپنا روپ اور جوانی بیچنے کے لئے بازار میں آنکلی۔ اس دن میں پانچ ہزار تو اس کی ایک مسکراہٹ سے وصول کر لونگی +

بینی

تو کیا تم اسے بھی دیشیا بنانے کا وچار رکھتی ہو!

کام لتا

رنڈی کے گھر میں پیدا ہونے والی لڑکی۔ دیشیا نہ بنے گی۔ تو کیا دیبی بنیگی؟ رنڈی کی دوستی کا یہی پرنیام ہے۔ میں نے رنڈی بنکر اپنے باپ کا سر نیچا کیا۔ یہ دیشیا بنکر تمہاری ناک کاٹے گی +

بینی

وہ دن آیا تو نہ یہ جئے گی۔ نہ میں جیوں گا۔ لاؤ لڑکی؟

[چھیننا چاہتا ہے]

راج کنور

بیٹا۔ یہ تو غصہ دلا کر دل لگی دیکھنے کے لئے تمہیں چھیڑ رہی ہے۔ (کام لتا سے) ارے تو بڑی پاجی لڑکی ہے۔ لال۔ اتنی ننھی سی جان کو ماں اور نانی کے سوا دوسرا نہیں پال سکتا۔ اسے تین چار برس کی ہونے دو۔ پھر لے جانا +

[آنکھ مارتی ہے سدا رنگ مطلب سمجھ کر لڑکی کو وہاں سے لے جاتا ہے]

بینی

اتنا سمے؟ اچھا۔ اس کے بعد روپے سے۔ زبردستی۔ عدالت سے۔ جس طرح بھی تم راضی ہوگی۔ اسے میرے حوالے کرنا ہوگا۔ سن لیا؟ تین برس کی تاریخ یاد رکھنا +

[جاتا ہے]

راج کنور

(ہنس کر) آہا ہا ہا۔ چلے گئے۔ ڈگڈگی بجاتے ہوئے

[سدارنگ لڑکی کو گھر میں چھوڑ کر واپس آتا ہے]

دیکھا سدارنگ جی۔ چور کے گھر بھی سیندھ لگانا چاہتا تھا +

کام لتا

کنتو ماں۔ تم بھی اپنے باپ کی چچی ہو۔ ایک ہی چھونتر میں اڑیل گھوڑے کو مریل گدھا بنا دیا +

سدارنگ

چھوٹی بائی جی۔ نانکا بننا سہج نہیں ہے۔ رنڈی کو چوہے کی طرح پھونک پھونک کر کاٹنا چاہئے +

کام لتا

اچھا ماں۔ یہ موا تو گیا۔ تھوڑی دیر میں جگل آپہنچے گا۔ اب اُس کے پھانسنے کے لئے ہمیں تیار ہو جانا چاہئے +

سدارنگ

بائی جی۔ تم نے جگل کے دیوالہ نکالنے کی جو چال سوچی ہے وہ سُر اور تال سے تو ٹھیک ہے بڑی بائی جی کے ساتھ سُر پر میں بھی سر ہلا دونگا۔ کنتو ——

کام لتا

کنتو کیا۔ دیکھو اُستاد جس کے پاس انبھو اور بدھی کا بھاؤ ہو۔ جوانی ہو۔ پیسہ ہو۔ بگاڑنیوالے دوست اور رنڈی سے چوتھ کھانے والے مصاحب ہوں۔ اُس کا وعدہ اور محبت کا کوئی بھروسہ نہیں۔ جگل ہزار دو ہزار کی نہیں کئی لاکھ کی آسامی ہے۔ یہ سونے کی مچھلی دوسرے کے جال میں پھنس گئی۔ تو ہم سب ڈور اور کانٹے سے کھیلتے ہی رہجائینگے +

سدارنگ

بائی جی۔ اپنے پریم کا وشواس دلانے کے لئے ماں کے ساتھ جھوٹی لڑائی لڑ کر جگل کے گھر جا تو رہوگی کنتو مجھے ڈر ہے کہ جانے کے بعد واپس آنا نہ بھول جاؤ۔

کام لتا

پاگل ہو گئے ہو۔ کہیں ہوا میں اُڑنے والا پکھیرو پنجرے میں بند رہ سکتا ہے۔ دو ہی چار مہینے کے اندر اس کی جیب۔ بینک اور صندوق کے روپوں کا صفایا کر کے کوئی نیا شکار پھانسنے کے لئے پھر اپنی پُرانی چھتری پر آبیٹھونگی +

راج کنور

اور تمہاری دودھ پیتی لڑکی ؟

کام لتا

وہ تمہارے پاس رہے گی آٹھویں دسویں دیکھنے کو بلا لیا کرونگی +

راج کنور

ارے چپ چپ۔ جگل آپہنچا +

کام لتا

ہاں تو لڑائی کے ناٹک کا پہلا سین شروع ہو جانا چاہئے۔ دیکھو ماں ٹھیک ٹھیک پارٹ کرنا یہ معلوم ہو کہ قریب کے اسٹیج پر ماں بیٹی نہیں دو مرغیاں لڑ رہی ہیں +

سدارنگ

بس تو ڈراپ اُٹھا دو۔ جگہ جگہ پر میں ونس مور کرتا رہونگا +

راج کنور۔ اری چل چل۔ کسی بھاگوان کے بھاگ چرا لائی تھی۔ جو میری کوکھ سے جنم لیا + ——

[جگل داخل ہوتا ہے]

کھال سے باہر ہوتی جاتی ہے +

کام لتا

دیکھ بڑھیا تو بھیگی ہوئی جوتی کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ منہ بند کر نہیں تو سر کا ایک ایک بال نوچ کر کنجی بندریا بنا دونگی +

راج کنور۔ اوہو۔ ہاتھی کی مستک پر مینڈکی ناچیگی! مجھے بڑھیا نہ سمجھنا۔ ایسا گھونسا جڑونگی کہ منہ دکھائی دیگا لیکن منہ پر ناک نہ دکھائی دیگی +

سدارنگ

جانے دو بائی جی۔ جانے دو۔ پولیس آگئی تو دونوں کا دفعہ چونتیس میں چالان کر دیگی +

کام لتا

بس تم چونچ بند رکھو۔ کوئل اور مینا کی لڑائی میں کوّے کو بولنے کی ضرورت نہیں +

جگل

آج یہ نئی بات کیسی ؟ کام لتا آگ کیوں ہو رہی ہو ؟ کیا ہوا ؟

کام لتا

مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ جس کا روپیوں سے گھر بھر دیا۔ اسی نمک حرام بڑھیا سے پوچھو +

جگل

یہ تو آپے میں نہیں ہیں۔ ماں تم ہی بتاؤ ؟

راج کنور

میں کیا بتاؤں۔ جو تمہارے کوٹ کا بٹن بن کر رہنا چاہتی ہے۔ وہی بتائے گی +

کام لتا

(علیحدہ) جیتی رہو ماں خوب پارٹ کر رہی ہو +

جگل

سمجھ میں نہیں آتا۔ گرو جی! یہ کیا جھگڑا ہے ؟

سدارنگ

بابو جی میں کیا بتاؤں۔ جہاں مردنگ بج رہے ہوں۔ وہاں ڈفلی کی آواز کون سنتا ہے !

راج کنور۔ سدارنگ جی۔ تم نے کتھک کے گھر میں جنم لیا تو کیا۔ کنتو آدمی دھرماتما ہو۔ گلے کی کنٹھی چھو کر کہو۔ کس کا دوش ہے ؟

کام لتا

دسمبر ۱۹۲۶ء

دوش کی بچی۔ اپنی ماں سے پوچھ۔ ماما سے کیا پوچھ رہی ہے۔ حرام کا کھا کھا کر پھولتی جاتی ہے۔ اری ارتھی بھاری ہو جائیگی۔ جلدی مر مر (گلا دباتی ہے)

سدا رنگ

ارے رے رے یہ کیا کرتی ہو۔ یہ تو ہماری روٹی کا سہارا ہیں۔ مر گئیں تو ہمیں پیٹ پالنے کے لئے سارنگی بیچکر حجام کا استرا خریدنا پڑیگا +

راج کنور

ارے تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ تجھے مانگی بھیک نہ ملے (جنگل سے مخاطب ہوکر) کیوں جی بیٹی کے ہاتھ سے ماں کا گلا گھٹوا کر کلیجہ ٹھنڈا ہوا؟ میں کبھی نہ مانوں گی تم نے ضرور اس پر جادو کیا ہے +

جنگل

یہ کیا! مدراس کا بادل کلکتے پر کیوں برسنے لگا +

سدا رنگ

(علیحدہ) کھوپڑی سے سمجھ بہالے جانے کو +

کام لتا

دیکھو جی۔ میرا شریر رنڈی کے رکت مانس سے بنا ہے۔ مگر میرا دل رنڈی کا دل نہیں ہے۔ بڑھیا نے تو کئی دفعہ پھونک مار کر بجھانا چاہا۔ لیکن اس پاپ کے مندر میں ابھی تک دھرم کا دیا جل رہا ہے +

جنگل

مجھے یہ تو بتاؤ ہوا کیا؟

کام لتا

تم نے کرم چند کا پڑیئے کا نام تو سنا ہوگا اس کے سالے بھاگ چند کو چھ دفعہ دیوالہ نکالنے کے بعد سٹے میں پھر پچاس لاکھ روپے مل گئے ہیں۔ کل اُس کا آدمی آکر کہنے لگا۔ کہ جنگل بابو کی نوکری چھوڑ دو۔ تو بھاگ چند سیٹھ پانچ ہزار پیشگی اور دو ہزار کا مہینہ دینے کو تیار ہیں۔ بس پانچ ہزار کا نام سنتے ہی بڑھیا پکے ہوئے پھوٹ کی طرح کھل گئی۔ لیکن میں نے صاف کہدیا۔ کہ ہم بے وفا نہیں ہیں۔ جس بابو کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ اس کا مسان تک ساتھ دیتے ہیں +

سدا رنگ

(دل میں) سچ ہے۔ بائی جی ایسی وفادار ہیں کہ بابو کا پیسہ ہی نہیں۔ بابو کی جان تک لے کر چھوڑتی ہیں +

راج کنور

جب تو نے کہہ ہی دیا تو میں کیوں چھپاؤں بابو صاحب ملتا ہوا دھن کوئی نہیں چھوڑتا۔ رنڈی تو نیلام کا مال ہے۔ جو بڑھکر بولی بولیگا وہی خرید سکے گا +

کام لتا

دیکھو پریتم۔ مجھے اس رنڈی کے دھندے سے گھرنا آگئی ہے۔ اب میں تمہاری چرن سیوا کرکے اپنے پاپی جیون کا پراشچت کرنا چاہتی ہوں کیا تم مجھے چار موٹے کپڑے اور دو مٹھی اَن نہیں دے سکتے؟ جنگل مجھے اس پاپ کے نرک سے نکال کر اپنے گھر لے چلو۔ ایک بھٹکتی ہوئی ناری کو دھرم کا رستہ بتاؤ۔ دیکھو نہیں نہ کہنا۔ اگر تم نے مجھے شرن نہ دی۔ تو میں آج ہی سنیاس لے کر بندرابن چلی جاؤنگی +

جنگل

کام لتا۔ میں اور ہر پرکار سے تمہاری رکشا کرنے کو تیار ہوں۔ کنتو کہئے بھائی۔ بیوی کے ہوتے ہوئے تمہیں گھر لے جانیکا ادھن نہیں کر سکتا

کام لتا

تب میں پاپ سے بچنے کے لئے کوئیں میں جاکر پھاند پڑتی ہوں۔ اُستاد جی ارتھی اور چتا تیار کرو۔ میں ڈوبنے جاتی ہوں +

سدا رنگ

ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ بابو جی مرنے سے روکئے۔ ایسی خوبصورت عورت گھڑی گھڑی پیدا نہیں ہوتی +

راج کنور

مرتی ہے تو مرنے دو۔ بابو جی سوچتے کیا ہو؟ جانا چاہتی ہے تو لے جاؤ نا۔ بہتوں کو دیکھ چکی۔ اب تمہیں بھی دیکھونگی۔ کہ کتنے دن اسے سکھ سے رکھتے ہو۔ (کام لتا سے مخاطب ہوکر) او۔ بھاگنی! سنتی ہے۔ یہی جو آج تیرے پیروں کے نیچے نوٹ بچھاتے ہیں۔ کل تیرے بدن کے زیور تک بیچ کر کھا جائیں گے +

کام لتا

میں زیور کی بھوکی نہیں۔ ان کے پریم کی بھوکی ہوں۔ تو ضرور کل انہیں بدنام کرے گی۔ کہ زیور کے لالچ سے میری لڑکی کو لے گئے ہیں جب حرام کا دھندا چھوڑا تب حرام کی کمائی کا زیور بھی نہیں چاہئے۔ یہ لے۔ اٹھالے اپنا زیور (زیور اتار کر پھینکتی ہے)

سدا رنگ

(علیحدہ) شاباش۔ رنڈی وہی ہے جو اپنے گھر کی جھاڑو بھی باہر نہ جانے دے +

راج کنور

ناک والی بن کر زیور تو دے چلیں۔ اب یہ سات سو کی ساڑھی سنبھال کر رکھنا۔ بابو کے گھر سے نکالے جانے کے بعد اسی کو گرہ رکھ کر کچھ دن بھیک مانگنے سے بچ جاؤگی +



شیریں فرہاد













یک رخ تمام

کام لتا۔

بھیک مانگے تو اور تیری ہونے والی نوچی ٹھیر جا۔ میں تیری خریدی ہوئی جوتی بھی تیرے ہی منہ پر مارتی ہوں۔ [اندر جاتی ہے]

جگل

اُستاد جی۔ تم کچھ بولتے نہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

سدا رنگ

حضور یہ ماں بیٹی کا ناٹک ہو رہا ہے۔ دو ڈراپ ہو چکے ہیں۔ تیسرا ڈراپ شروع ہونے والا ہے۔ آپ ٹکٹ لے کر آئے ہیں اور میں بلا ٹکٹ کے دیکھ رہا ہوں +

[کام لتا سفید ساڑھی پہن کر آتی ہے]

کام لتا

میرا دینے والا جیتا رہے۔ مجھے کیا پرواہ ہے (راجکنور سے) زیور پا چکی لے اپنے سات سو کی ساڑھی بھی رکھ چھوڑ۔ دیکھنا ایسا نہ کہنا۔ کہ مجھے لوٹ لے گئی ہے۔ میں اس دھوتی کے سوا تیرے گھر کا ایک تنکا بھی لے کر نہیں جاتی +

راج کنور

ارے ہمارے لئے تو تو مر چکی۔ بابو کے یہاں جا۔ یا نرگ میں جا۔ آؤ سدا رنگ جی +

(جاتی ہے)

سدا رنگ

چلو بائی جی۔ میں تو سمجھتا تھا۔ کہ دو ایک سین اور دیکھونگا۔ یہاں تو ڈراپ سین ہی گر گیا۔ (جاتا ہے)

جگل

کام لتا۔ یہ کیا کیا؟ پھر سوچ لو۔ ایک ہی پرش کو دیوتا مان کر اس کی سیوا اور بھگتی میں اپنا سارا جیون بتانا۔ یہ ناری کی تپسیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ لالسا کا راکشش کسی دن تمہاری تپسیا بھنگ کر دے +

کام لتا

ناتھ مجھ پر وشواس کرو۔ جیسے سانپ اپنی کینچلی اُتار دیتا ہے۔ ویسے ہی میں اپنا ویشیا پن اس گھر میں چھوڑ کر تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔ دیکھ لینا اپنے آپکو ایسا بدل ڈالونگی۔ کہ جو لوگ آج مجھے رنڈی کہتے ہیں۔ وہی کل مجھے مہاستی کے نام سے پکارینگے

سورج اور پھول

پھول تب تک معصوم ہے جب تک کھلتا نہیں۔ کلی چاہے کتنی بُری ہو پھر بھی معصوم ہے۔ [illegible] ہے کتنی چھوٹی ہو اور کھل پڑے تو معصوم نہیں رہتی +

کلی تب تک بند رہتی ہے۔ جبتک سورج کی گرمی [illegible] اُسے گرمی لگتی ہے تو کھلنا شروع کرتی ہے۔ سورج کی [illegible] وہ بڑھتی رہتی ہے مگر کھلتی نہیں +

شب پھولوں کو موتیوں کے زیور پہناتی ہے۔ وہ خود بھی تاروں سے جڑی ہوتی ہے۔ اُس وقت پھول بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر سورج یہ پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ خود حسین نہیں۔ اس لئے پھولوں کا حسن بھی مٹا دیتا ہے

دسمبر ۱۹۲۷ء

کرم حسین

ڈرامے کا ایک سین

(از حضرت احسن لکھنوی)

[قاہر کی بی بی ایک خالہ عورت ہے جس کی ترغیب سے قاہر نے بہت بُرے بُرے کام کئے۔ یہانتک کہ اسی شیطان خصلت عورت کی ترغیب سے اپنے حقیقی بھائی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا اور وہ قدرت خدا سے محفوظ رہا۔ اب یہ سین میدان جنگ کا ہے۔ قاہر پے در پے شکست کھانے سے قریب قریب پاگل ہوگیا ہے۔ اور یہ سمجھکر کہ یہ تمام مصیبتیں اُس پر اُس کی زوجہ کی وجہ سے وارد ہوئی ہیں۔ حالت جنون میں اس عورت کو قتل کر دیتا ہے]

[جنگل، قاہر شرزہ کا کٹا ہوا سر ہاتھ میں لئے نکلتا ہے]

قاہر۔ (سر سے مخاطب ہوکر) بول اب بول محتاج کھوپڑی تیرا تاج کہاں ہے۔ فتنہ پردازی کا وہ جوہر تیرے دماغ کے کون سے خانے میں ہے۔ (ہنستا ہے) واہمہ مدرکہ منجملہ عقل۔ ہوش۔ غرور سب اس مکان کے کرایہ دار تھے جو ویران مکان کی دو کھڑکیاں کھلی چھوڑ کر بھاگ گئے (غصہ سے) ملعونہ شیطانہ مکار لومڑی کی طرح شیر کو بہکا کر شکاری کی زد پر لانے والی۔ تیری زبان کے جادو بھرے لفظ چھین کر منہ پر موت کا قفل لگا دیا گیا ہے جا اور چڑیل بنکر شیر خوار بچوں کو خواب میں ڈرایا کر ؎

دہن میں وہ زباں چپ ہے کہ جو قینچی سی چلتی تھی
وہ چشم پُر فسوں بے نور ہے جو زہر اُگلتی تھی
وہ شمع حسن گل ہے جس سے شمع بزم جلتی تھی
وہ شعلہ سرد ہے جس سے فنا کی لو نکلتی تھی
بھرا تھا جس میں راز فلسفہ ساری خدائی کا
بنا ہے وہ سر مغرور اب کاسہ گدائی کا

[عصلان گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے۔ قاہر عصلان کو دیکھکر کٹا ہوا سر چھپا لیتا ہے]

عصلان۔ موت اور شکست کے سوا کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔ اسلامی سرفروش حیرت انگیز کرشمہ دکھا رہے ہیں۔ کوئی زبردست طاقت اُن کی شریک ہے۔ مرتے مرتے بھی ایک ایک بہادر دس دس کو موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔ اُف ؎

عجب جری تھے کہ جرأت دکھا دکھا کے مرے
نکھر نکھر کے لہو میں نہا نہا کے مرے
وغا میں زخم کی لذت اُٹھا اُٹھا کے مرے
کہ مرتے مرتے بھی چوٹیں لگا لگا کے مرے
بدن پہ زخم کا نقش و نگار باقی ہے
چمن تو مٹ گیا لیکن بہار باقی ہے

قاہر۔ جہنم۔ خوبصورت جلد میں لہریں مارنے والا خون اب حسن کا دعوے نہیں کر سکتا ؎

دفعتہ سلسلۂ تار نفس ٹوٹ گیا طائر روح بھی آزاد قفس ٹوٹ گیا

عصلان۔ (غور سے دیکھکر) کون۔ خداوند قاہر۔ اوہ حضور یہ کیا حال ہے خون اتنا خون شاید آپ جنگ میں بہت زخمی ہوگئے ہیں۔ آئیے کسی محفوظ مقام پر میں آپ کو بھی پہنچا دوں +

قاہر۔ (رونی آواز سے) عصلان وہ کھلونا ٹوٹ گیا جس سے میں دل بہلایا کرتا تھا +

عصلان۔ یعنی +

قاہر۔ یعنی۔ لایعنی۔ فانی۔ کہانی۔ بلائے آسمانی خنجر کی زبانی در موت کی کہانی تین بار فقط پانی پانی پانی +

میں جو قائل ہوگیا تھا شوخی تقریر کا تھا مری تدبیر میں کچھ شائبہ تقدیر کا
دیکھتا ہوں رنگ لیکن منہ سے کہہ سکتا نہیں آنکھ آئینہ کی رکھتا ہوں دہن تصویر کا

عصلان۔ یہ کیا۔ یہ کیسی بے ربط تقریر۔ خداوند آپ کے دماغ کو اس ناگوار انقلاب کے اثر نے مجروح کر دیا ہے۔ ذرا ہمت کیجئے +

قاہر۔ ہمت کے بچے۔ تاروں بھری رات تھی۔ خوبصورت چاند آسمان کے نیلے خیمہ سے جھانک رہا تھا۔ مگر قاتل کی چھری مقتول کے سینہ میں کئی انچ گہری اُتر چکی تھی ؎

سرد فولاد کا اک گرم اثر ہاتھ میں تھا
دم نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ سر ہاتھ میں تھا

عصلان (خود سے) بیشک پاگل ہوگیا۔ بہادر قاہر فوج کی کمان ہاتھ میں لے کر بزدل نہ بنو۔ ابھی تک فتح کی اُمید باقی ہے۔ آؤ میرے ساتھ اکیلا اور حملہ کرو

قاہر۔ (بات کاٹ کر) دوزخ کے داروغہ تو کہاں تھا جب موت کی چیخ فریاد کرتی ہوئی پہاڑی گھاٹیوں کے اندر غائب ہوگئی +

عصلان۔ پاگل بالکل پاگل۔ ناقابلِ علاج دیوانہ۔ افسوس +

قاہر۔ عصلان میں قاتل نہیں ہوں +

عصلان۔ قاتل۔ کون قاتل کہتا ہے +

قاہر۔ ناپاک کتے تو نے ابھی کہا خونی +

عصلان۔ کتا۔ وفاداری کا صلا کتا +

قاہر۔ تو پھر میدان جنگ میں لاشوں کے رنگین بستر پر مجھے نیند کیوں نہ آئی۔ میں لیٹا۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ میں سویا۔ اوہ نہیں نہیں یہ کچھ نہیں میرے پاس کوئی کٹا ہوا سر نہیں ہے (آسمان کی طرف دیکھ کر) ہٹ جاؤ اور کمدہ قاہر ایک اضطراب سے دُنیا کا جغرافیہ دریافت کر رہا ہے (سر سے مخاطب ہوکر) بتا کون سی نئی دنیا میں راحت تلاش کی ہے۔ مجھے بتا +

عصلان۔ ستم۔ غضب۔ کیا ملکا سر۔ اس کو کس نے مارا؟

قاہر۔ اس قوت دار ہاتھ نے +

عصلان۔ کیا کیا +

قاہر۔ خون +

عصلان۔ جنون +

قاہر۔ قتل +

عصلان۔ کس لئے +

قاہر۔ یہ تو میں خود نہیں جانتا +

عصلان۔ ناداں جس چراغ کی روشنی میں تو اپنی قسمت کی تاریک منزل طے کر رہا تھا۔ اس کو پھونک کر بجھا دیا +

قاہر۔ خیر اندیش وزیر سلطنت سُن +

شبِ تاریک میں حاجت نہیں روشن چراغوں کی
قضا کو ڈھونڈتا ہوں روشنی میں دل کے داغوں کی

عصلان۔ ناقد شناس قاہر دیکھ مقتولہ کی زبان زبانِ حال سے تیری بیوفائی کی شکایت کر رہی ہے +

اشارے ابروؤں کے شکوۂ بیداد کرتے ہیں
لبِ نازک ابھی تک ظلم کی فریاد کرتے ہیں
تری ہستی دہانِ گور کو کڑوا نوالا ہے
دُعا ہے پالنے والے کو جس نے تو وہ کالا ہے

قاہر۔ بیہودہ بک بک نہ کر جو ہر شمشیر کی بھوکی مچھلیاں اور بھی لہو پینے کا تقاضہ کر رہی ہیں۔ بچ اور بھاگ +

عصلان۔ اُف +

قاہر۔ تُف +

عصلان۔ ناداں اک مرقعۂ مہر و وفا تھی یہ +

قاہر۔ پردے میں دوستی کے پیامِ قضا تھی یہ +

عصلان۔ ثمرۂ ترے لئے باعثِ فخر و ناز تھی +

قاہر۔ عورت کے بھیس میں فطرتِ شیطانی کا راز تھی +

عصلان۔ اک نخلِ آرزو تھی +

قاہر۔ مکار و حیا جو تھی +

عصلان۔ سلطنت کا چراغ تھی +

قاہر۔ بدسرشت و بد دماغ تھی +

عصلان۔ حُسن کی تصویر تھی +

قاہر۔ گردشِ تقدیر تھی +

عصلان۔ غریب بے قصور سلطانہ +

قاہر۔ شریر مغرور شیطانہ +

عصلان۔ اُسی کی ہمت نے تجھے مرد بنا کر تاج کا وارث بنا دیا ہے

شررہ کے دم کے ساتھ تراسب غرور تھا
چہرے پہ رعب و داب تھا آنکھوں میں نور تھا
پھیلا رہی ہے زہر ہوا انقلاب کی
کم بخت اپنے ہاتھ سے مٹی خراب کی

قاہر۔ بے ادب وزیر میں کون ہوں +

عصلان۔ اب کوئی نہیں کچھ نہیں +

وہ شمع تو ہے نور کا جس میں اثر نہیں
وہ دل ہے تو کہ جس میں وفا کا گزر نہیں
وہ نخل ہے کہ جس کو اُمیدِ ثمر نہیں

وہ طائرِ نحیف ہے تو جس کے پر نہیں
مانندِ حسرتِ دلِ ناکام کچھ نہیں
تنویرِ آفتابِ لبِ بام کچھ نہیں

قاہر۔ اوکورنگ قاہر کا اقبال تیری حمایت کا محتاج نہیں۔ اُس تنِ بے سر کو ایک امینِ تنہائی کی ضرورت ہے۔ جا اُسی کے پاس جا +
(پنجہ مار دیتا ہے)

عصلان۔ اوہ دغا بزدل دغا +
قاہر۔ چپ +
عصلان۔ جبر جبر +
قاہر۔ قہر قہر +
عصلان۔ آہ خاتمہ ملکہ کے ساتھ میرا اور میرے ساتھ بابل تیرا خاتمہ +
قاہر۔ خس کم جہان پاک جنگلی درندوں کی خوراک +

احسن لکھنوی

مسافر کا گیت

جب صبا تیری نرگسی اور بنفشی پوشاکوں کو ملہاتی ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بادلوں میں لپٹی ہوئی آسمانی دیوی، مائلِ پرواز ہو +

جب تو صحنِ چمن میں سے گزرتی ہے۔ تو انار کی کلیاں تیری خوشبو سے مہک اُٹھتی ہیں۔ جب تو یاسمن کے پھول چنتی ہے۔ تو وہ مسرت سے تیرے ہاتھوں میں لرزنے لگتے ہیں +

سونے کی پازیبیں تیرے پاؤں میں جھنک رہی ہیں۔ اور نیلم کے نگینے تیرے کُرتے کے گھیرے میں جھلملا رہے ہیں۔ زمرّد کے ایک پرند نے تیرے بالوں میں اپنا آشیاں بنا رکھا ہے۔ تیرے رُخساروں کے گلاب تیرے گوشواروں کے بڑے بڑے آبدار موتیوں میں لرز رہے ہیں +

جب تو میری طرف دیکھتی ہے۔ تو مجھے ایسا نظر آتا ہے۔ جیسے دریا ..... موجیں مارتا ہوا بہا آرہا ہو +

جب کوئی اسپ سوار، شام کے وقت تجھے دیکھ لیتا ہے۔ تو وہ سمجھتا ہے۔ کہ سپیدۂ صبح نمودار ہوگیا۔ اور وہ اپنے رہوار کو تندی سے جھنک کر کھڑا کر دیتا ہے +

دسمبر ۱۹۲۶ء

غلام عباس

بھیشم

بھیشم اور امبا کی آخری مُلاقات

(از جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی اے۔ اسسٹنٹ سکرٹری پنجاب کونسل)

ہستناپور کے مہاراج شانتنو کے ولیعہد راجکمار دیوبرت کی قربانیاں مشہور خلائق ہیں۔ یہی وہ مایۂ ناز بزرگ ہے جو بعد میں اپنی قربانیوں اور خدا کاریوں کے باعث بھیشم کے ممتاز لقب سے ملقب ہوا۔ یہی بھارت ماتا کا وہ سپوت ہے جس نے باپ کی خوشنودئ مزاج کی خاطر تخت و تاج کو چھوڑ دیا۔ شادی کی تمام مکلفات کو خاکر کے اپنی عمر بھر کی اُمنگوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور اولاد کی خوشیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا +

اس منظر میں راجکمار اپنی منسوبہ محبوبہ امبا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہے۔ محبت ایک خوفناک عہد کے تہیب چنگل میں ایک بے بس چڑیا کی طرح دم توڑ رہی ہے اور احساس فرض جسمانی خواہشوں پر فتح پاکر انسان کو وہ شے بنا رہا ہے جس کی پرستش اس نے اشرف المخلوقات کا درجہ پایا ہے +

ایڈیٹر]

منظر

راجکماری امبا کی بارہ دری

کیفیت

باغ میں امبا اپنی سہیلیوں کے ساتھ مصروف سیر ہے۔ سہیلیاں رقص و سرود سے راجکماری کا دل بہلا رہی ہیں۔ امبا ظاہراً خوش لیکن دراصل اُداس ہے +

امبا۔ وہی دھرتی ہے وہی آکاش ہے۔ پر تو آج میری غم سے رنگی ہوئی آنکھوں کو دنیا کی ہر وستو اُداس لگ رہی ہے +

ایک سہیلی۔ سکھی اُداس ہوں تمہارے دُشمن۔ ادھر آؤ ذرا ندی کے درپن میں تو جھانکو کیسا سہانا سماں ہے +

امبا۔ یہی سماں تھا ——

دوسری سہیلی۔ ذرا ان پھولوں کو تو دیکھو کس طرح پتوں کی آڑ میں چھپ چھپ کر تمہیں گھور رہے ہیں +

امبا۔ یہی پھول تھے ——

تیسری سہیلی۔ راجکماری یہ آج اس تھاتھے کا کیا کارن ہے۔ ہم تو اس سے کی بات کر رہے +

دوسری سہیلی۔ اری چُپ۔ راجکماری کو کسی بیتے ہوئے سمے کی یاد ستا رہی ہے +

راجکماری۔ ہاں اس سمے کی سمرتی میری آنکھوں کے سامنے اس طرح آرہی ہے جس طرح دکھ کے سمے کسی پردیسی کے من میں اپنے دیس کی یاد آتی ہو +

تیسری سہیلی۔ پیاری کیوں خرماتی ہو۔ کہدو ناکہ اب راجکمار کی جدائی کی ہمیت نہیں سہی جاتی +

پہلی سہیلی۔ (تیسری سہیلی سے) اری تو باز نہیں آتی +

راجکماری۔ جاؤ سکھیو اس سمے مجھے تمہاری چھیڑ چھاڑ نہیں بھاتی +

دوسری سہیلی۔ ہم چلی گئیں تو تمہارا جی اور گھبرائیگا +

تیسری سہیلی۔ اجی ہمارے بغیر باغ کی سیر میں تمہیں خاک لطف آئیگا +

—— گانا ——

[دیوبرت اس نغمہ و رقص کے دوران میں داخل ہوتا ہے اور امبا کو دیکھ کر ذرا فاصلے ہی پر رُک جاتا ہے]

دیوبرت۔ (رقص کے اختتام پر اپنے آپ سے) دیکھ لے۔ دیکھ لے۔ او دھرم سنیاسی اپنے جیون کی سُندرتا اپنے سُکھ کی آشا کو آخری بار دیکھ لے۔ اور پھر اسے وسمرتی کے اتھاہ ساگر میں بہا دے ٭

امبا۔ (اپنے آپ سے راجکمار دیوبرت کو یاد کرتے ہوئے) اے ساری دھرتی کے سندرتا کے سارانش اپنی وسمے پورن درشٹی کی ایک ہی جھلک دکھا کر کہاں چھپ گئے ہو ٭

دیوبرت [آہستہ آہستہ امبا کی طرف بڑھتا ہے مگر کچھ دور چل کر رُک جاتا ہے] (اپنے آپ سے) میرے پاؤں کیوں لڑکھڑا رہے ہیں۔ میری آنکھیں کیوں صاف صاف نہیں دیکھ سکتیں۔ دیوبرت! بھیشم! کیا تیرے تیاگ کا مہابرت اس اگنی پریکشا کے پہلے ہی شعلے سے بھسم ہو جائیگا۔ نہیں! نہیں!! (فوراً آگے بڑھ کر) دیوی!

امبا۔ (بیتابی سے) کون؟ دیوبرت؟ آؤ۔ آؤ۔ دیوبرت میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی ٭

[سہیلیاں آپس میں اشارے کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں]

دیوبرت (اپنے آپ سے) مجھے ہی یاد کر رہی تھی!

امبا۔ دیوبرت کیا تم سچ مچ آ گئے۔ آہ۔ میرا دل میری آنکھوں پر اعتبار نہیں کرتا ٭

دیوبرت۔ (علیحدہ) ابھی تھوڑی دیر میں تمہاری آنکھیں تمہارے دل پر اعتبار نہ کرینگی۔ دیوی۔ آج تمہارے پریم کا بھکاری تم سے ایک بھکشا مانگنے آیا ہے ٭

امبا۔ سوامی۔ میں اب تمہیں کیا بھکشا دے سکتی ہوں۔ اب میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ جو کچھ تھا تمہارے چرنوں میں ارپن کر چکی ہوں ؎

روپ۔ جوبن۔ سُکھ۔ جوانی۔ زندگانی کا مزا
میں نے سب کچھ تیرے چرنوں پر نچھاور کر دیا
تو بھکاری بن کے آیا تھا سوامی ہو گیا
دے کے اپنا آپ میں نے تجھ کو اپنا کر لیا
اب تو تو مالک ہے میں داسی تری سرکار کی
تو ہے داتا میں بھکارن ہوں ترے دربار کی

دیوبرت۔ (زمین میں آنکھیں گاڑ کر) پرنتو اب سب کچھ بھلا دو ٭

امبا۔ پران ایشور میں نے جس سمے تمہیں دیکھا تھا اُسی سمے سب کچھ بھلا دیا تھا ——

دیوبرت۔ (منہ پھیر کر) آہ۔ میں وی وش ہو جاؤنگا ٭

امبا۔ کیول تمہاری یاد باقی تھی۔ اب تمہیں اپنے مکٹ دیکھ کر اسے بھی بھلا دونگی

دیوبرت۔ آہ بڑا ہی کٹھور تیاگ ہے ٭

امبا۔ کیسا تیاگ؟ دیوبرت تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں کچھ نہیں سمجھی ٭

دیوبرت۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے پریم کا رنگ محل بننے سے پہلے بگڑ گیا ہے۔ تمہارے سُکھ کا چمن کھلنے سے پہلے اُجڑ گیا ہے ٭

امبا۔ پریتم۔ پریتم!

دیوبرت۔ پریتم نہیں بھیشم! —— دیوی اب اُس پریم سنیاسی دیوبرت کو بھول جاؤ۔ جو ایک دن تمہیں دیکھ کر سب کچھ بھول گیا تھا۔ آج اُس کی جگہ دھرم سنیاسی بھیشم کو دیکھو جس کا دھرم سوارتھ تیاگ ہے۔ جس کا برت سنیاس ہے ٭

امبا۔ کیسا برت؟

دیوبرت۔ سوارتھ کے تیاگ کا۔ سکھ کے بلی دان کا ٭

امبا۔ یہ کس لئے؟

دیوبرت۔ اپنے پتا کی پرسنتا کے لئے ٭

امبا۔ پتا کی پرسنتا کے لئے؟ کیا تمہارا پتا اپنی پرسنتا کے لئے تمہاری پرسنتا برباد کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ اپنے سکھ کی بستی تمہارے سُکھ کے کھنڈر پر آباد کرنا چاہتا ہے؟

دیوبرت۔ ایک حرف نہیں دیوی۔ میں اپنے پتا کے خلاف تم سے بھی کچھ نہیں سُن سکتا ٭

امبا۔ ٹھہرو۔ پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ اب تم مجھ سے پریم نہیں کرتے ٭

دیوبرت۔ پریم نہیں کرتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ پریم کرتا ہوں۔ بہت کرتا ہوں۔ اپنے پرانوں سے بڑھ کر کرتا ہوں۔ پرنتو اپنے کرتویہ سے بڑھ کر نہیں کر سکتا

امبا۔ (روتے ہوئے) دیوبرت۔ میرے پریتم۔ میرے سوامی۔ میری کامناؤں کے محل کو یوں پل کے پل میں نہ گرا دو۔ ایک عورت کی جیون ناؤ کو یوں آن کی آن میں دکھ سنکٹ کے اتھاہ ساگر میں نہ ڈبا دو ٭

دیوبرت (اُسے روتا دیکھ کر) بہاؤ۔ بہاؤ۔ اپنے نیتروں کے نیر میں میری

اشانتی کو بہاؤ۔ پیتے ہوئے سمے کی سمرتی کو بہاؤ۔ اس لوک اور پرلوک دونوں کو بہا دو۔ پرنتو میرے کر تویکو بچالو۔ (دوزانو ہوکر دعا کرتا ہے) ہے پرماتمن۔ ان آنسوؤں کے طوفان میں سب کچھ بہہ جائے۔ مگر میری پرتگیا ہمالہ کی اونچی چوٹیوں کی طرح سربلند کھڑی رہے +

امبا۔ (دامن پکڑکر) دیوبرت +

دیوبرت۔ دیوبرت! بھیشم بن اپنے آپ کو سنبھال +

امبا۔ پرتم کیا تمہاری آنکھوں کو میری روتی ہوئی آنکھوں پر۔ کیا تمہارے دل کو میرے تڑپتے ہوئے دل پر رحم نہیں آتا۔ دیکھو میرے سوامی میری طرف دیکھو۔ کل تم مجھ سے میرا پریم بھیک مانگنے آئے تھے۔ میں نے تمہیں نرودش نہیں کیا تھا۔ آج میں تم سے تمہاری دیا بھیک مانگتی ہوں مجھے نامراد نہ پھراؤ +

دیوبرت۔ آہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آرہا ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ کرتویہ کرتویہ مجھے راہ دکھا! (جانا چاہتا ہے)

امبا۔ (دامن پکڑکر) میرے سوامی!

دیوبرت۔ کشما۔ کشما۔ دیوی!

امبا۔ میرے ہردے۔ میرے پتی!

دیوبرت۔ میری بہن!

امبا۔ ہائے۔ (بیہوش ہوکر گر پڑتی ہے۔ دیوبرت آستین سے آنکھیں چھپا لیتا ہے)

زندگی

اگرچہ تمہیں تمہاری زندگی میں کیسی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ تم مردانہ ہمت اور شجاعت سے اس کا مقابلہ کرو۔ اور اپنی زندگی سے بیزار مت ہو۔ اور اسے بُرا بھلا مت کہو +

تمہاری زندگی ایسی بُری نہیں ہے۔ جیسے کہ تم اُسے سمجھ رہے ہو۔ درحقیقت تمہاری زندگی اُس وقت بُری ہے جب دولت تمہیں احساسِ فرض سے غافل بنادے +

زندگی سے محبت کرو۔ اگرچہ تمہاری زندگی غربت کی زندگی ہی کیوں نہ ہو؟

تمہیں مسرت و شادمانی کے چند گھنٹے ایک چھوٹی سی غریبانہ جھونپڑی میں بھی میسّر ہوسکتے ہیں +

یہ لو سورج اُفقِ مغرب میں غروب ہو رہا ہے۔ اس کی آخری سنہری کرنیں اُسی طرح غریب کی جھونپڑی پر پڑ رہی ہیں جس طرح امیر کے محل پر +

برف تمہاری جھونپڑی کے سامنے موسمِ گرما میں ٹھیک اُسی طرح پگھلتی ہے جس طرح ایک دولتمند کے محل کے سامنے +

اگر تمہاری طبیعت میں قناعت اور حوصلہ ہے۔ تو تم معمولی سی جھونپڑی میں بھی ویسی ہی خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرسکتے ہو۔ جیسے ایک امیر اپنے عالی شان محل میں +

(ترجمہ) (راجہ) رشید احمد ایڈورڈز کالج پشاور

دسمبر ۱۹۲۶ء

اکبر

انارکلی کا ایک منظر

(مشہور ڈرامہ نگار جناب سید امتیاز علی صاحب تاج۔ بی اے کے قلم سے)

سین: — قلعۂ لاہور میں سفید پتھر سے بنا ہوا ایک بلند مگر نہایت سادہ اور دل کشا ایوان۔ جس کو دیکھنے سے دماغ پر ایک فرحت افزا خاموشی اور خنکی کا سا اثر ہوتا ہے +

شہنشاہ اکبر ایک مسند پر آنکھیں بند کئے اور پیشانی پر ہاتھ رکھے چپ چاپ لیٹا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ سخت ذہنی محنت کے بعد اس کا دماغ تھک گیا ہے۔ اور وہ اب بالکل خالی الذہن ہو کر اپنے مضمحل اعصاب کو آرام پہنچانا چاہتا ہے + رانی پاس بیٹھی ہے۔ سامنے کنیزیں رقص کر رہی ہیں۔ رانی تھوڑی ہاتھ پر رکھے کچھ سوچ رہی ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک لوچ ہے + اکبر ایک دو مرتبہ آنکھیں کھول کر باندیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ گویا ان کا رقص اس کو تکلیف دے رہا ہے + آخر وہ اپنا ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اور کنیزیں جہاں ہیں وہیں ساکت ہو جاتی ہیں۔ رانی خاموشی سے چونک کر اکبر کو دیکھتی ہے +

رانی ——— مہاراج؟

اکبر — [منہ موڑتے ہوئے کنیزوں سے] جاؤ +

[کنیزیں رخصت ہو جاتی ہیں]

رانی — کیوں مہاراج؟

اکبر — [آنکھیں بند کئے ہوئے] راحت نہیں۔ ان کے رقص کے قدم میرے تھکے ہوئے دماغ کو صدمہ پہنچاتے ہیں +

رانی — پھر اتنی محنت کیوں کیا کرتے ہیں مہاراج؟

اکبر — [نیم وا آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے] شہنشاہ ہوں رانی +

رانی ——— اور پھر بھی؟

اکبر — [پُر معنی انداز میں ۔ ۔ ۔ ۔] کس کا قیاس جرأت کر سکتا ہے۔ کیا چاہتا ہوں +

رانی — سیوک جو تعمیل ارشاد کو موجود ہیں +

اکبر — [حقارت کے ایک خفیف سے تبسم سے] سیوکوں نے کتنے بادشاہوں کو اکبر اعظم بنا دیا +

رانی — نورتن اتنا بے حقیقت ہے؟

اکبر — [سکون سے] اگر اس کو اکبر کے خواب ہدایت نہ دیں +

رانی — خواب!

اکبر — [خواب آلود نگاہوں سے سامنے کہیں دور تکتے ہوئے] میری فوجیں۔ میری سیاست۔ میرے نورتن سب میرے خوابوں کے پیچھے آوارہ ہیں۔ کون میری طرح ناممکن کے خواب دیکھ سکتا ہے؟ کون میری طرح اپنے خوابوں کو حقیقت سمجھ سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری عظمت میرے خواب ہیں رانی +

رانی — آپ کی عظمت!

اکبر — اور ابھی تک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستان ایک مسکین کتے کی طرح میرے تلوے

چاٹ رہا ہے۔۔۔ مگر ابھی تک میری زندگی کا سب سے بڑا خواب اَن دیکھا پڑا ہے۔ اور میں اسے جنم دینے کا عزم اپنے میں نہیں پاتا۔

رانی۔ خواب کا جنم؟ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج؟

اکبر۔ انسان کے جنم سے بہت زیادہ عزم چاہتا ہے رانی ——— اور میں بہت تھک گیا ہوں۔ اور اکیلا ہوں۔۔۔ اگر سلیم کاش اگر سلیم ———

رانی۔ [اکبر کا منہ تکتے ہوئے] سلیم؟

اکبر۔ ——— اپنے اجداد سے مختلف نہ ہوتا۔ تو رانی۔۔۔ مغل۔۔۔۔

رانی۔ مغل کیا؟

اکبر۔ [آہستہ سے] لیکن ابھی کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے [کسیقدر بیتاب ہوکر] مغلوں میں کوئی خواب دیکھنے والا نہ تھا۔ انہیں اکبر مل گیا۔ اگر اکبر کے جانشینوں میں تیمور کی طوفانی روح۔ بابر کی حیرت انگیز معلومات اور ہمایوں کا آہنی استقلال ہوا۔۔۔ (آہستہ سے) لیکن ابھی کون جانتا ہے سلیم۔۔۔ (کڑک کر) ہا! زمین سر پٹخ پٹخ کر رہ جائے اور قرن اور صدیاں اس کے سینے سے مغل علم کو نہ اُکھاڑ سکیں۔

رانی۔ [مناسب جواب کی کوشش میں] سلیم آپ کا موزوں جانشین ہوگا۔

اکبر۔ (گرم ہوکر) اگر اس کا یقین ہو جاتا۔ تو میں اپنے دماغ کا آخری ذرہ تک خواب میں تبدیل کر دیتا۔ لیکن میری تمام اُمیدوں سے وہ اتنا بے اعتنا ہے۔ اتنا بے نیاز ہے۔ کہ میں۔۔۔ (سوچتے ہوئے) لیکن ابھی کیا معلوم۔۔۔

رانی۔ ابھی بچہ ہی تو ہے۔

اکبر۔ [فہمائش آمیز متانت سے] ہماری محبت دیوانی نہیں۔ کہ اُس کا سن و سال بھول جائے۔ اور ہم چاہتے ہیں۔ تم بھی اُسے یقین دلاؤ۔ کہ فی الحال وہ ایک احمق نوجوان کے سوا اور کچھ نہیں۔

رانی۔ مگر وہ اپنے ہم عمروں سے کچھ بہت مختلف تو نہیں ہے۔

اکبر۔ [برافروختہ ہوکر] یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو؟ اکبر سے؟ جو اس عمر میں ایک سلطنت کا بوجھ اپنے کم سن کندھوں پر اُٹھا چکا تھا جس نے دنیا کی بے باک نظروں کو جھکنا سکھا دیا تھا۔ جو اس عمر میں مفتوح ہند کو متحد کرنے کے دشوار مسائل میں منہمک رہتا تھا۔ ہاں جو اس عمر میں خواب تک دیکھتا تھا (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) تم ماں ہو۔ صرف ماں۔

(جانا چاہتا ہے)

رانی۔ آپ بہت تھک چکے ہیں۔ ابھی آرام فرمائیے۔

اکبر۔ کوئی رقص لاؤ۔ کوئی موسیقی۔ نرم۔ نازک۔ خوش آیند (بیٹھ جاتا ہے) انارکلی کہاں ہے؟ اُس کو بلاؤ۔ وہ تھکے ہوئے دماغ کو ٹھنڈک پہنچانا جانتی ہے۔

رانی۔ انارکلی بیمار ہے مہاراج۔ اور اُس کی ماں چاہتی ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو اُسے تھوڑے عرصے کو تبدیل آب و ہوا کے لئے کہیں بھیجدیا جائے۔

اکبر۔ [نیم دراز ہوتے ہوئے] حکیم نے اُس کو دیکھا؟

رانی۔ کچھ تشخیص نہ کر سکا۔ لیکن خود انارکلی سمجھتی ہے۔ آب و ہوا کی تبدیلی اُسکے لئے مفید ہوگی۔

اکبر۔ (بے پروائی سے) تم کو اعتراض نہیں تو اُس اجازت ہے۔

رانی۔ لیکن حرم سرا کے جشن میں تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔ اور انارکلی کے بنا جشن سونا رہ جائیگا۔

اکبر۔ (کروٹ لیتے ہوئے) پھر مت جانے دو۔

رانی۔ دباؤ ڈالنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اکبر۔ زبردستی کیوں ظاہر ہو جشن تک اُس کو علاج کے بہانے سے ٹھیرا لیا جائے۔ اور جشن میں شامل کرنے کے بعد رخصت دیدی جائے۔

رانی۔ لیکن وہ جشن کی تیاریاں کیسے کر سکیگی؟

اکبر۔ صرف رقص و سرود۔۔۔۔ انتظام کسی دوسرے کے سپرد ہو۔

رانی۔ دلارام!

اکبر۔ ہاں کہاں ہے وہ اُس کو بلاؤ۔ اُس کا گیت میرے دماغ کو تازگی بخشے گا۔

[رانی تالی بجاتی ہے۔ ایک کنیز حاضر ہوکر دست بستہ کھڑی ہو جاتی ہے]

رانی۔ دلارام!

[کنیز رخصت ہو جاتی ہے]

جشن کے متعلق کوئی ہدایت؟

اکبر۔ (کسیقدر چڑکر) میرا نورتن کو ہدایات دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

رانی۔ جشن میں شطرنج کھیلیں گے آپ؟

اکبر۔ کون کھیلیگا ہم سے؟

رانی۔ میں سلیم سے کہونگی۔

اکبر۔ اور اگر وہ جیت گیا۔ تو ہم کو خوشی ہو گی +

[دلارام حاضر ہو کر مجرا بجالاتی ہے]

رانی۔ دلارام۔ حرمسرا کے جشن کا اہتمام انارکلی کی بجائے تجھ کو کرنا ہو گا +

دلارام۔ بسر و چشم +

رانی۔ اور انارکلی صرف رقص و سرود ہی کے لئے شریک ہو گی +

دلارام۔ بہت بہتر +

رانی۔ تو جانتی ہے جشن کے لئے کیا کچھ کرنا ہو گا؟

دلارام۔ حضور۔ میں پہلے کئی جشنوں کا اہتمام کر چکی ہوں +

رانی۔ اور دیکھ صحابی سلیم سے شطرنج کھیلیں گے +

دلارام۔ (کسی قدر چونک کر) صاحب عالم سے!

رانی۔ ہاں!

[دلارام کا دماغ انارکلی اور سلیم کے خفیہ تعلقات سے اس قدر بھرا ہوا ہے۔ کہ وہ یہ سن کر ایک سوچ میں کھو جاتی ہے]

رانی۔ جشن شیش محل میں ہو گا۔ اور روشنی ——— تو سن رہی ہے؟

دلارام۔ (چونک کر) شہزادہ سلیم!

رانی۔ پگلی! گیا شہزادہ سلیم؟

[اکبر آنکھ کھول کر دلارام کی طرف دیکھتا ہے]

دلارام۔ صاحب عالم ہیں سرکار +

اکبر۔ نہیں وہ شریک ہو گا +

رانی۔ سنا جشن شیش محل میں ہو گا۔ اور روشنی ———

اکبر۔ اب بس۔ چلئے کوئی گیت۔ سیدھا سادا اور میٹھا۔ مگر آواز دھیمی اور نرم گرم اور زخمی دماغ کو ایک ٹھنڈا مرہم چاہئے۔ رقص ہلکا پھلکا گھنگھرو کا شور نہ ہو۔ بہت چکر نہ ہوں۔ پاؤں آہستہ آہستہ زمین پر پڑیں۔ جیسے پھول برس رہے ہیں۔ برف کے گالے زمین پر اتر رہے ہیں۔ لیکن خمار نہ ہو۔ نیند نہ آئے۔ ہمیں پھر مصروف ہونا ہے +

[دلارام رقص شروع کرتی ہے۔ مگر رقص کے دوران میں بھی وہ سوچ میں ہے۔ اور ذہنی مصروفیت کے باعث اس کے رقص میں نقص نظر آ رہے ہیں۔ اکبر اٹھ کھڑا ہوتا ہے]

اکبر۔ کچھ نہیں۔ کسی کو نہیں آتا۔ کوئی نہیں جانتا۔ اور انارکلی ذلیل ہے +

[اکبر پیچھے پیچھے چلی جاتی ہے۔ دلارام سوچ میں جیسے گم سی کھڑی رہ جاتی ہے]

دلارام۔ انارکلی ہو گی ..... سلیم ہو گا ..... اور اکبر بھی .... کاش اگر اکبر دیکھ سکتا ..... کاش اگر میں اکبر کو اس کی آنکھوں سے دکھا سکتی۔ آہ! ..... یہ ضرور ہو گا۔ اور جشن ہی کے روز ..... دو تارے ..... وہی دو تارے ..... اور کون جانے؟ .....

[آہستہ سے زمین پر لیٹ جاتی ہے اور سر جھکا کر ایک گہری سوچ میں کھو جاتی ہے]

سید امتیاز علی تاج۔

موریس لیول

مشہور ادیب اور افسانہ نگار سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے نے میوریس لیول کے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ حصہ اول میں چودہ افسانے ہیں۔ موریس لیول یورپ کے مشہور ترین افسانہ نگار ہیں ہے۔ اور تاج صاحب نے اسے اردو میں ترجمہ کر کے علم ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے +

اس مجموعہ کی قیمت تقریباً عہر ہو گی۔ دار الاشاعت پنجاب ریلوے روڈ لاہور سے طلب کیجئے

کاٹھ کی دو پتلیاں

ایک دلچسپ مکالمہ

[شیشم پر لکڑی کی دو پتلیاں باتیں کر رہی ہیں]

رلدو۔ (اونچی آواز سے) سوہنی۔ سوہنی!! عورت تو کہاں مر رہے؟

سوہنی۔ میں سو رہی ہوں +

رلدو۔ کیوں؟

سوہنی۔ مجھے نیند آ رہی ہے +

رلدو۔ جب تمہیں بُلایا جاتا ہے۔ تو تم کیوں جواب نہیں دیتیں؟

سوہنی۔ میں جب چاہونگی جواب دونگی +

رلدو۔ کھانا کیوں تیار نہیں +

سوہنی۔ مجھے بھوک نہیں +

رلدو۔ لیکن مجھے تو بھوک ہے +

سوہنی۔ مجھے اس سے کیا غرض +

رلدو۔ گستاخ عورت!

سوہنی۔ کمبخت!

رلدو۔ بدزبان!

سوہنی۔ لوطے سی ناک والا +

رلدو۔ میں کہتا ہوں تمہارا سر پھرا ہے جو ایسی گستاخی کر رہی ہو؟

سوہنی۔ کیا تمہاری چندیا کھجلاتی ہے کہ تم مجھ سے ایسی باتیں کر رہے ہو؟

رلدو۔ میں تمہارا سر توڑ دونگا +

سوہنی۔ تم جو ایک گھٹیا قسم کی لکڑی سے بنائے گئے ہو +

رلدو۔ کیڑے تمہاری جڑوں کو کھا رہے تھے +

سوہنی۔ اور تمہارے پتوں میں تمہارے سر سے بھی بُرے بُرے چھید تھے +

سوہنی۔ اور تمہاری شاخیں مردہ بازوؤں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں +

رلدو۔ تمہاری لکڑی ایسی بوسیدہ تھی کہ لکھنے ہی تمہارے جگر تک ایک ہی وار میں گھس گئی +

سوہنی۔ مگر تم تو اتنے بوسیدہ اور پرانے ہو کہ ابھی آگ کی نذر کر دیئے جاؤ گے +

رلدو۔ مجھے آگ کی نذر کر دیا جائیگا؟ ایکبار پھر کہو۔ اور دیکھو مزا!!

سوہنی۔ بڈھا کھوسٹ +

رلدو۔ (گردن سے پکڑ کر) ماروں تجھے؟

سوہنی۔ مدد!! مدد!! پولیس پولیس!!

[چیخ کی آواز سے دونوں جاگ اُٹھتے ہیں]

سوہنی۔ اوہو۔ میں بھیانک خواب دیکھ رہی تھی +

رلدو۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میں خون اور گوشت کا پتلا ہوں +

سوہنی۔ ہم نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں +

رلدو۔ اور ایک دوسرے کا تمسخر اُڑایا +

سوہنی۔ آؤ اس انسانی خواب کو بھول جائیں +

رلدو۔ ضرور۔ دیکھو رات کیسی خوشگوار ہے!

سوہنی۔ رلدو۔ کیا تمہیں اب نیند نہیں آئیگی؟

رلدو۔ مشکل سے +

(خاموشی)

رلدو۔ تم سوچ رہی ہو؟

سوہنی۔ میں سوچ رہی ہوں۔ اور تم؟

رلدو۔ اور میں بھی سوچ رہا ہوں +

سوہنی۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟

رلدو۔ بہت کچھ۔ اور تم؟

سوہنی۔ بہت کچھ +

(خاموشی)

سوہنی۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟

رلدو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور تم؟

سوہنی۔ میں تمہاری متوالی ہوں ——

رلدو۔ میری اچھی سوہنی!

سوہنی۔ میرے پیارے رلدو!

رلدو۔ رات خوشگوار ہے +

سوہنی۔ رات شبنم نرم نرم کائی کے ہے جو ہمارے اردگرد اُگی ہوئی ہے +

رلدو۔ خوبصورت۔ سبز سبز کائی!

سوہنی۔ ہم ایک تھے۔ رلدو۔ اُس وقت ہم ایک تھے +

رلدو۔ ایک۔ ایک دوسرے سے لپٹے گریبستہ +

سوہنی۔ کلہاڑی بڑی مشکل سے ہمیں جُدا کر سکی +

رلدو۔ خوفناک کلہاڑی جس کا دانت بہت تیز تھا +

سوہنی۔ اور اُس وقت تم تھے۔ نہ میں تھی +

رلدو۔ اور اُس وقت ہمارا نام بھی ایک ہی تھا +

سوہنی۔ کیسا خوبصورت نام!

رلدو۔ "درخت" ہم درخت تھے +

سوہنی۔ اور ہمارا پیڑ بہت ہی بلند تھا +

رلدو۔ ہمارا آخری پتہ دنیا کے انتہائی کونے کو چھو رہا تھا +

سوہنی۔ ہم بہت گہرے پھیلے ہوئے تھے +

رلدو۔ ہماری جڑ کا آخری سرا پاتال کے پار تھا +

سوہنی۔ ہم میں سے نرم رو دریا بہتا تھا +

رلدو۔ شیریں اور سرد ——

سوہنی۔ وہ دریا جو زمین کے قلب سے دنیا کی سطح پر چڑھ دوڑا تھا +

رلدو۔ اور پھر زمین کی گود میں گم ہو گیا تھا +

(خاموشی)

رلدو۔ سوہنی!

سوہنی۔ رلدو!

رلدو۔ کیا تمہیں موسم بہار یاد ہے؟

سوہنی۔ خوب یاد ہے!

رلدو۔ کیا تمہیں وہ چھوٹی چھوٹی کلیاں یاد ہیں جو ننھے ننھے ہاتھوں کی طرح گھلتی تھیں؟

سوہنی۔ ہاں +

رلدو۔ ایسے چھوٹے ہاتھوں کی مثل جن میں ننھی ننھی رگیں اُبھری ہوئی ہوں +

سوہنی۔ یہ کیسی محبت بھری باتیں ہیں؟

رلدو۔ یہ عہد کہن کا راگ ہے!

سوہنی۔ رلدو۔ اور چاند۔ چاند۔ کیا تمہیں یاد ہے؟

رلدو۔ ہاں۔ وہ ہر وقت کچھ چاہتا تھا +

سوہنی۔ وہ شاید اُن پتوں کو تلاش کرتا رہتا تھا جو مدت گذری ہمارے درخت سے بچھڑ چکے تھے +

رلدو۔ اور بلند ستارے؟

سوہنی۔ مجھے خوب یاد ہیں +

رلدو۔ اور زمانہ ہوا۔ جو ہماری شاخوں میں کانپا کرتی تھی +

سوہنی۔ (مسکراتے ہوئے) بے شک +

رلدو۔ اور سورج؟

سوہنی۔ آفتاب۔ اوہو۔ گرم گرم۔ اور معطر سا۔ جو ہمیں چوم لیا کرتا تھا +

رلدو۔ اُس کا نرم نرم ہاتھ ہمیں دُلارا کرتا تھا +

سوہنی۔ اور وہ سفید سفید دامن جس پر ہمارے پتوں کا سایہ سویا کرتا تھا +

رلدو۔ سوہنی۔ ہمیں نیند تو نہیں آ رہی؟

سوہنی۔ نیند؟ نہیں تو۔ کیا تمہیں بارش کا سماں یاد ہے؟

رلدو۔ بارش۔ جو ہم زمین کے بڑے پیالے سے پی لیتے تھے +

سوہنی۔ اور جو ہمیں۔ وہ پہلی تاروں کے کوڑے مار کر کہا کرتی تھی۔ "اُگو۔ اور خوب بلند اُگو" +

(خاموشی)

سوہنی۔ زمستان۔ رلدو کیا تمہیں موسم سرما یاد ہے؟

رلدو۔ یاد ہے +

سوہنی۔ یا سی تیز و تند ہوائیں +

رلدو۔ گرد و غبار جو سورج کا منہ ڈھانپ لیتے تھے

سوہنی۔ نیند راگ ——

رلدو۔ برف کی سی سفید خاموشی ——

سوہنی۔ گہری نیند۔ گہری! ——

رلدو۔ جس میں ہم موسم بہار کے خواب دیکھا کرتے تھے

(خاموشی)

سوہنی۔ آہ کیا ہم پھر کبھی ایک ہو سکینگے!

رلدو۔ میں نے خواب دیکھا تھا کہ ہم گلاب کا ایک پھول بن جائینگے +

سوہنی۔ خوب۔ خوب!!

رلدو۔ جس کی سُرخ سُرخ پتیاں ہونگی ——

سوہنی۔ اچھا؟

رلدو۔ جو ایک دھیمی رفتار سے چلنے والی ندی کے کنارے اُگا ہوگا +

سوہنی۔ اچھی بات!

رلدو۔ پرندے ننھے ستاروں کی مانند ہمارے اردگرد اُڑینگے۔ جو چھوٹے چھوٹے راگ گائینگے۔ پھول اپنی پتیاں بکھیر دینگے۔ کیڑے کوڑے رینگنے مکڑی خاموشی سے اپنا جالا تنے گی۔ لمبے پتلے سائے ہمارے سامنے ناچینگے۔ اور ہوا۔ اپنی گالوں کو دھونکنی کی مانند پھلا کر ہماری شاخوں کو چھوئیگی۔ سوہنی۔ جنگل کے خدا کی خواہیں ہمیشہ سچ نکلا کرتی ہیں۔ سوہنی۔ سوہنی۔ تم سو گئیں؟

(ختم شد)

(بال ایلنج) ایڈیٹر

منظومات

بادۂ شیراز ..... از جناب مولانا اظہر علی صاحب آزاد ایم آر اے ایس

خطاب بہ یکے از شعراء معاصرین ..... از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے

طرز یگانہ ..... حضرت میرزا یاس یگانہ لکھنوی

پہلا آمنا سامنا ..... از جناب مولانا عظمت اللہ خاں صاحب بی اے مرحوم کمشنر امتحانات سرکار عالی

غزل ..... عالیجناب نواب حیدر یار جنگ بہادر (مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی)

زمزمۂ تغزل ..... لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی

خمکدۂ ریاض ..... لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مدظلہ

تجلیات جوش ..... مجتہد العصر حضرت جوش ملیح آبادی

خمخانۂ عرفان ..... لسان القوم مولانا صفی لکھنوی

انسان کی تازہ کاریاں ..... مولانا وحید الدین صاحب سلیم رکن اردو یونیورسٹی حیدرآباد دکن

غزل ..... از جناب مولانا رضا علی صاحب وحشت کلکتہ

نیرنگ خیال ..... حضرت فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی

فسانۂ گل و بلبل ..... از جناب عبد الخالق صاحب خلیق دہلوی

غزل ..... از حضرت عبد الباری آسی المدنی

حسن تغزل ..... از جناب شیخ عبد اللطیف صاحب تپش بی۔ اے

پیغام عمل ..... از جناب انعام عظیم صاحب برنی ایم۔ اے

غزل ..... از سید عابد علی صاحب عابد بی اے ایل ایل بی

حیات ..... از جناب اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی

شعر اور ترانہ ..... از جناب روشن دین صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل

مطرب کہن سال ..... از جناب مولانا تمکین صاحب کاظمی

غزل ..... حضرت شوکت تھانوی

غزل ..... جناب محمد کبیر خاں صاحب رسا

بادۂ شیراز

(از مولانا امداد علی صاحب آزاد)

نمود شعلۂ برق تو خارِ صحرا را — حباب آمدہ فانوس بزمِ دریا را
پیام داد صبا کشتگانِ شیدا را — کہ گشت نرگسِ مستش مسیح عیسےٰ را
چہ گفت و گو چہ سکوت و چہ شوخی و چہ حیا — کہ خالِ روئے او نیست چشمِ بینا را
رواں داشت فلک تو بیا ہم برزن — جبینِ خوبِ من و سجدۂ مصلےٰ را
گماں مبر کہ بمیرم گرم نہ آب دہی — نہ آں منم کہ بجویم کنارِ دریا را
قضا بہ آبِ بقا پرورید دشت و جبل — چنار ہائے سہی قد بلند بالا را

زملک و مال کمالِ جمال آزاد است
کہ خالِ عارضِ لیلےٰ بس ست لیلےٰ را

آزاد

نغمۂ شیراز

(از لسان الہند علامہ عزیز لکھنوی)

مطربا برخیز بزم آراستہ شد صف بصف — مہوشاں ساغر بدست و می گساراں دل بکف
حلقہ حلقہ غنچہ زن دستہ دستہ نوبتے — جرگہ جرگہ پردہ آرا نغمہ سنجاں صف بصف
عود بر عود و بریشم بر بریشم نے بہ نے — چنگ بر چنگ و جلاجل بر جلاجل دف بدف
جوش زد فصلِ بہاراں ناحیہ در ناحیہ — رشک جنت گلشنے کو بود نے آب و علف

ابر نیسانے بسانِ دستِ منعم در فشاں
صورتِ گوہر بہ بندد قطرۂ اندر صدف

عزیز

خطاب بہ یکے از شعراء معاصرین

از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے

یہ بہار یہ قصیدہ فتحی کے نبع میں لکھا گیا ہے۔ اردو میں سودا اور ذوق نے بھی اسی زمین میں سخنوری کی ہے

یہ جوشِ مستیٔ خامہ کا ہے دمِ تحریر
بزنگِ قافلۂ مینا ہیں نغمہ ہائے صریر

نسیمِ باغ میں ایسا ہے کیفِ عالم گیر
کہ شاخِ گل کو سمجھتے ہیں دستِ ساغر گیر

نشاطِ موسمِ ابر بہار مت پوچھو
کہ جوشِ رنگ سے دنیا ہے عالمِ تصویر

چمن ہے میکدہ، ساقی صبا ہے، گل ساغر
اُٹھا ہے سر پہ لئے خمکدہ جوا بر مطیر

زبسکہ بادِ صبا بھی ہے تاک پروردہ
ہیں مستِ بادۂ انگور سب صغیر و کبیر

ہر ایک گوشۂ گلشن نشاط خانہ ہے
ہر ایک برگِ چمن ہے بہار کی تصویر

صبا کی تیز روی سے بلند طبلِ جدال
صبا کی تند روی سے شجر ز فرشِ حریر

نشاط و رنج ہیں ذہنی، بہار میں یکساں
ہے رقصِ شاخِ گل و اضطرابِ مرغِ اسیر

جہان بھر میں ہے وہ جوشِ انبساط کہ ہے
کلیدِ قفلِ دل و شرحِ خاطرِ دلگیر

مگر نہیں ہے ترے حال میں کوئی تغییر
بنا ہے تو وہی حزن و ملال کی تصویر

ترا شعار وہی ہے سکوتِ سودائی
جنوں نوازفزوں تر ہے تو دمِ تقریر

دلیلِ رنگِ طبیعت ہیں خونفشاں آنکھیں
ہے تیرا چاکِ گریباں جنون کی تفسیر

ترے کلام کے صدقے سکوتِ قدرت کا
ترے سکوت پہ قربان نغمۂ بم و زیر

وہ باکمال نہیں ہیں جو علم کا زیور
سمجھتے ہیں رہ و رسمِ عوام کی زنجیر

مرے خیال میں جو ہو عوام میں مقبول
ضرور ہے کہ حقیقت میں ہو وہ مردِ حقیر

کوئی نہ کوئی ہے خامی عیاں ہو یا پنہاں
کہ احمقوں میں جو ہوتی ہے باعثِ تشہیر

خواص کے لئے شہرت نہیں کوئی معیار
نہیں دلیلِ فضیلت شمارِ جمِ غفیر

ترے کمال کا مجھکو ثبوت کافی ہے
نہیں عوام کی نظروں میں جو تری توقیر

بزیرِ سایۂ گل عندلیب مرد و فشرد
مگر ز اہلِ چمن ہچکس نہ گشت خبیر

تاثیر

مرقومہ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۶ء

طرزِ یگانہ

حضرت میرزا واجد حسین صاحب یگانہ لکھنوی

نظارہ پہ کیا گزری آشوبِ تماشا سے ؟ ہوش آتے ہی پروانے کھوئے گئے دُنیا سے
دیوانے ہوں شرمندہ کیوں چشمِ تمنّا سے ؟ اللہ رے خود بینی باز آ گئے لیلےٰ سے
دل اپنا جلاتا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا اَور آگ لگاتے ہو کیوں تہمتِ بے جا سے؟
دن بھر تو یہ پروانے جیتے تھے نہ مرتے تھے کیا کیا نہ اُٹھے فتنے اک شعلۂ تنہا سے؟
کیوں نکہتِ آوارہ جامے سے نہ ہو باہر کس دن کو وفا کرتی پیراہنِ رُسوا سے؟
حیراں ہیں نظر والے۔ بیتاب ہیں دل والے کچھ رنگِ تماشا سے۔ کچھ بوئے تمنا سے
ذرّہ بھی ہے اک عالم انوارِ الٰہی کا ادنیٰ ہی سہی لیکن نسبت تو ہے اعلیٰ سے
کیوں دل کا کنول آخر لہراتا ہے رہ رہ کر؟ جھونکا کوئی آپہنچا کیا عالمِ بالا سے؟
اے رہزنِ بے پروا مشکل مری آساں کر کیوں آنکھ چُراتا ہے گم گشتۂ تنہا سے
تنہا چلا جاتا ہے یہ زور ہے دھارے کا ٹکرا کے پلٹ آئیں موجیں لبِ دریا سے
کیا اپنے تئیں دیکھیں کیا ہو گئے اور کیا تھے؟ رفتارِ نظر عاجز رفتارِ تماشا سے
جو دم ہے غنیمت ہے کیا جانئے کیا کل ہو اک دَور کی نسبت ہے امروز کو فردا سے

دُنیا کی ہوا کھا کر کیا دُند مچائی تھی !
بیٹھے ہو یگانہ اب کیوں بزم میں تنہا سے ؟

شاہ گنج لکھنو

یگانہ

پہلا آمنا سامنا

(از جناب مولانا محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے مدگار ناظم تعلیمات و کشمیر استمانت سکروالی)

"ایمرسن" کہتا ہے "جب ہم عقد کرتے ہیں۔ تو پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جان حسن و جمال سے ہمکنار ہو رہی ہے" اسی جذبہ کو مولانا عظمت اللہ خاں نے واضح کیا ہے۔ اور اس بات کا مطالعہ کیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان جب پہلی دفعہ ایک اجنبی لڑکی سے بحیثیت اجنبی لیکن شادی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے اوپر لے کر آمنے سامنے ہوتا ہے۔ تو اس وقت کس طرح قفل خاموشی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ مطالعہ کی کھڑکی سے اپنی اور طرف ثانی کی روحیں ایک دوسرے سے روشناس ہوں +

ہمارے ہاں کی ننانوے فی صد شادیاں اب بھی اجنبی دو لحاظ دل سن کی ہوتی ہیں۔ مولانا نے ان پر لطف حالات میں ایک انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان کا مطالعہ کرنا چاہا ہے +

"ارسطو" کہتا ہے "شاعری کو وزن کی نہیں بلکہ موسیقی کی ضرورت ہے" مولانا بھی اسی پر عمل کرتے ہیں۔ مگر ترنم پیدا کرنے کے لئے آپ بحر کی ایجاد بھی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس نظم کی بحر آپ ہی کی ایجاد ہے۔ جس کے ارکان یہ ہیں:-

فَ عَ لُن | فَاعِ لُ | فَاعِ لن
ر ر ـــ | ر ر ـــ | ر ـــ
م ری نے | نو میں س | ما ؤ تم

نرجیسی مصرعہ بندوں کے مصرعوں سے دُگنا ہے۔ بیچ میں ہے،

میری نینوں میں سماؤ تم " میرے من میں بسو آؤ تم

اگر نظم کے سے پڑھی جائے تو نہایت سُریلی چیز معلوم ہوتی ہے۔ انگریزی عروض سے دلچسپی رکھنے والے محسوس کریں گے کہ یہ نظم اردو میں انگریزی رنگ ڈھنگ کا ایک کامیاب تجربہ ہے +

نہ صرف اس نظم میں نفسیات کا مطالعہ کیا گیا ہے بلکہ شاعری بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک "چینی ادیب" کا قول ہے:-

" شعر کا کام جذبات کا بیان ہے نہ کہ خواہشوں کا، اور شعر آرزوؤں کا شیریں راگ ہے۔ خواہشوں کا کرخت شور نہیں" +

تمکین کاظمی

۱ نہیں منہ یوں نہ چھپاؤ تم
میں ہوں دُولھا نہ لجاؤ تم
مجھے صورت تو دکھاؤ تم
ذرا گھونگھٹ یہ ہٹاؤ تم
مری نینوں میں سماؤ تم مرے من میں بسو آؤ تم

۲ بڑی اس دن کی تھی آرزو
کہ ہوں اس رنگ سے روبرو
تو ہو دل کھول کے گفتگو
اجی بس شرم اُٹھاؤ تم
مری نینوں میں سماؤ تم مرے من میں بسو آؤ تم

۳ یہ ہے اک پھول سا ہاتھ نرم
لگی مہندی پہ ہے گرم گرم
بھلا اب مجھ سے کہاں کی شرم
ذرا آنکھیں تو ملاؤ تم

مری نیندوں میں سماؤ تم مرے تن میں بسو آؤ تم

۴ بہت آمادہ ہے اس بار جی
نہیں اب میں کروں گدگدی
ذرا آئے جو تمہیں ہنسی
مجھے ہنس ہنس کے ہنساؤ تم
مری نیندوں میں سماؤ تم مرے من میں بسو آؤ تم

۵ دیا جب ہاتھ میں ہاتھ ہے
تو یہ اک عمر کا ساتھ ہے
خوشی نت چاہ کے ہاتھ ہے
ذرا دل سے دل لگاؤ تم
مری نیندوں میں سماؤ تم مرے من میں بسو آؤ تم

۶ ذرا سوچو وہ ہے جھل کب
دو دلوں میں رہے فصل جب
یہی ہاں بات ہے اصل اب
کہ مجھے دل میں بساؤ تم
مری نیندوں میں سماؤ تم مرے من میں بسو آؤ تم

۷ نہیں اب دور نہ یوں رہو
مرے بس آؤ گلے لگو
مجھے دل دے کے مری بنو
مجھے یوں اپنا بناؤ تم
مری نیندوں میں سماؤ تم مرے من میں بسو آؤ تم

حیدرآباد دکن — محمد عظمت اللہ خاں مرحوم

تجلیاتِ جوش

(مجتہد العصر حضرت جوش ملیح آبادی)

جا رہا ہوں حسن سے آنکھیں ملانے کے لئے — زندگی کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے

مدعائے جستجوئے دوست ہے کامل سکوں — جاگتا رہتا ہوں گہری نیند آنے کے لئے

آہ تجھ سے کیا بتاؤں، کتنے سینے ہیں فگار — زندگی میں دو گھڑی آرام پانے کے لئے

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے — آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لئے

اس قسم کے توڑنے والے حوادث، الاماں — میں نے کھائی ہے جو تیرے ناز اٹھانے کے لئے

اللہ اللہ تیرے سنگِ آستاں کا مرتبہ — رفعتیں مجبور ہیں سر جھکانے کے لئے

ہونٹ جب کانپے تو آنکھیں ڈبڈبا آئیں مری — داستاں کا آخری ٹکڑا سنانے کے لئے

غرقِ عشرت ہو کے جینے سے کہیں بہتر ہے جوشؔ
درسِ عبرت بن کے مر جانا زمانے کے لئے

جوشؔ

غزل

(عالی جناب نواب حیدر یار جنگ بہادر (مولانا سید علی حیدر) نظم طباطبائی لکھنوی)

کیا کاروانِ ہستی گزرا رواروی میں
فردا کو میں نے دیکھا گرد و غبار دی میں

تھے محو لالہ و گل کس کیفِ بے خودی میں
زخمِ جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں

یارانِ بزمِ عشرت ڈھونڈھوں کہاں ہیں تم کو
تاروں کی چھاؤں میں یا پچھلے کی چاندنی میں

ہر عقدہ میں جہاں کے پوشیدہ ہے کشاکش
ہر موجِ خندۂ گل پنہاں کلی کلی میں

ہم کس شمار میں تھے پرسش جو ہم سے ہوتی
یہ امتیاز پایا آشوبِ آگہی میں

رفتارِ سایہ کو ہے پست و بلند یکساں
ٹھوکر کبھی نہ کھائی راہِ فروتنی میں

وجد آگیا فلک کو غش آگیا زمیں کو
دو طرح کے اثر تھے اک صوتِ سرمدی میں

محشر کی آفتوں کا دھڑکا نہیں رہا اب
سو حشر میں نے دیکھے دو دن کی زندگی میں

تو ایک ظلِ ہستی پھر کیسی خود پرستی
سائے کی پرورش ہے دامانِ بیخودی میں

حائل بس اک نفس ہے محشر میں اور ہم میں
پردہ حباب کا ہے فردا میں اور دی میں

اے نظم چھیڑ کر ہم تجھ کو ہوئے پشیماں
کیا جانتے تھے ظالم رو دے گا دل لگی میں

نظم

دسمبر ۱۹۲۶ء

زمزمۂ تغزّل

(از لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی)

سکوں ہر درد کو ملتا ہے میرے قلبِ مضطر میں
قرار اس بیقراری پر ہے موجوں کو سمندر میں

معاذ اللہ عکسِ روئے ساقی آتشِ تر میں
شعاعیں جام بر کف آفتاب اُبھرا ہے ساغر میں

مرا کفر اک وسیلہ تھا حصولِ کامیابی کا
مرے زنّار کے چلّے بندھے محراب و منبر میں

نگہ صد میکدہ در دست و ساقی مستِ خودداری
یہ منظر دیکھتا ہوں جب تو کیا رکھا ہے ساغر میں

ازل میں شعلہ اک نکلا تھا ہنگامِ جبیں سائی
وہی چنگاریاں ہیں آج تک محفوظ پتھر میں

یہ کیسی کروٹیں بدلی تھیں یارب مرنے والے نے
تڑپتی ہیں ابھی تک بجلیاں ہر چینِ بستر میں

مفصّل زندگی پر مختصر سا تبصرہ سمجھو
دمِ آخر رُکا ہے ایک آنسو دیدۂ تر میں

وہ چالیں چل حریفوں کو نہ تجھ سے بدگمانی ہو
بساطِ دہر اے غافل اُلٹ جائے گی دم بھر میں

ہم اُس منزل کے رہرو ہیں جہاں مٹنا نہیں ممکن
اُبل آتا ہے چشمہ زندگی کا ایک ٹھوکر میں

تباہی کا وہ حصّہ جو ہوا تقسیم دُنیا پر
اُسے بھی لکھ دیا ہوتا ہمارے ہی مقدّر میں

لہو دل کا کیا ہے بس اسی اُمید پر ہم نے
نگاہِ تشنۂ خوں ڈوب جا لبریز ساغر میں

مری عقدہ کشائی میں دم اُس کا بھی اُلجھتا ہے
یہ کیسے پیچ یارب پڑ گئے میرے مقدّر میں

قطعہ

غزل اک دائرہ تھا عشق کے ماتم نشینوں کا
مگر پا کوبیٔ احباب سے ہے اب وہ چکّر میں

بتاؤں آپ کو کیوں کر جو فرقِ امتیازی ہے
شکستِ دل کی آواز اور صدائے رُوح پرور میں

جسے کہتے ہیں دردِ جانگزا وہ دل کا حصّہ ہے
شرر رقصاں ملیں گے صرف مجمر اور پتھر میں

عزیز اشعار میرے رقص کاغذ پر کریں کیوں کر
یہاں تو بس وہی سودائے دردِ عشق ہے سر میں

عزیز

خمکدۂ ریاض

(لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مدظلہٗ)

تقریباً تیس برس گزرے ہونگے۔ داغ مرحوم حیدرآباد میں تشریف فرما تھے اُنھوں نے اس زمین میں غزل ارشاد فرمائی جس کا مطلع یہ ہے ؎ مجھ قدیار ہو گئے ہم سولی پہ چڑھے تو سو گئے ہم +

اور اس کے بعد قبلہ موصوف سے محترم مرحوم نے فرمایش کی اور بہت اصرار کیا۔ مجبوراً ممدوح نے بھی طبع آزمائی فرمائی کیونکہ ممدوح اور حضرت داغ نیز میرے والد حضرت وسیم میں نہایت گہرے اور دوستانہ تعلقات تھے۔ حضرت ریاض نے غزل تو کہی اور نہایت معرکۃ الآرا غزل فرمائی۔ لیکن۔ لیکن اس خیال سے کہ خلاف ادب ہے حضرت داغ سے پوشیدہ رکھی۔ اور طبع ہوتا تو درکنار کسی کو آج تک سُنائی تک نہیں۔ یہ آپکی خوش قسمتی ہے کہ ریاض سے انتخاب کرتے وقت اس غزل پر ممدوح کی نظر پڑ گئی۔ اور اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی یاد آ گیا + شمیم خیرآبادی)

پایا جو تجھے تو کھو گئے ہم — بیدار ہوئے تو سو گئے ہم
دل میں لئے غیر کو گئے ہم — ایک آئے عدم سے دو گئے ہم
کیوں محفل ناز میں کیا یاد — سو بار تو دل کو رو گئے ہم
محشر میں لگی بجھانے اے شیخ — سیدھے تسنیم کو گئے ہم
بھر کر دم نزع اِک دم سرد — جنت کی ہوا میں سو گئے ہم
وہ سمجھیں کہ زخم و داغ دل ہیں — لے کر نئے پھول دو گئے ہم
کوثر کا تھا ذکر حوض مے پر — ہم کہہ کے گرے کہ لو گئے ہم
اب جادہ نوردِ عشق جو ہو — اس راہ میں کانٹے بو گئے ہم
اللہ بچائے دخترِ رز سے — یہ آئی کہ مست ہو گئے ہم
اب کشمکشِ حساب کیسی — کچھ حشر میں آ کے کھو گئے ہم
سو کعبہ دیں تھے جلوہ افروز — خمخانے میں آج جو گئے ہم
میخانے میں جب کبھی ہم آئے — رُو کر داڑھی بھگو گئے ہم

اِس حج میں وہ بُت بھی ساتھ ہوگا
یہ سچ ہے ریاض تو گئے ہم

ریاض

مُطربِ کہن سال

(از جناب سید تمکین صاحب تمکین کاظمی)

دل کی لگی بجھا دے اک راگ پھر سنا دے
پھر دردِ دل بڑھا دے مدہوش پھر بنا دے
او مطربِ کہن سال!

پھر سازِ غم اُٹھانا اک تان اور لگانا
اک بار تلملانا نغمہ وہی سُنانا
او مطربِ کہن سال!

پھر آنکھ بند کر کر تاروں پہ اُنگلی دھر کر
رُک رُک کر اور ٹھہر کر نغموں میں بجلی بھر کر
او مطربِ کہن سال!

دل پھُنک گیا ہے میرا مطرب ہے یا سپیرا
ظالم یہ ساز تیرا شب کو کرے سویرا
او مطربِ کہن سال!

ہے کتنا رقت آمیز ہے کتنا فرحت انگیز
کس درجہ ہے جنوں خیز کتنا سکون آمیز
او مطربِ کہن سال!

مجھ کو خبر نہیں ہے اب کون دل نشیں ہے
اُف راگ یہ نہیں ہے دریائے آتشیں ہے
او مطربِ کہن سال!

نغمہ ازل کا گانا سازِ ابد بجانا
خالق سے لَو لگانا دُنیا سے مُنہ پھرانا
او مطربِ کہن سال!

مدہوش ہو گیا ہوں دنیا سے کھو گیا ہوں
ہاں محوِ کیفیت ہوں یا مست ہو گیا ہوں
او مطربِ کہن سال!

ایسا غضب نہ کرنا ہرگز نہ یوں ٹھہرنا
واللہ میرا مرنا تو دیکھ لے گا ورنہ
او مطربِ کہن سال!

تمکین

خمخانۂ عرفان

(از حضرت لسان القوم مولانا صفی لکھنوی)

کیا عقدہ نہ اب تک حل یہ میری فکرِ کامل نے
ستم میں نے کئے ہیں دل پہ یا مجھ پہ کئے دل نے

قدم رکھتے ہوئے اُس حد کے اندر دل لرزتا ہے
لہو سے اپنے جتنی دور خط کھینچا ہے بسمل نے

ہلالِ ابروِ دلبر سے کج بحثی نہ کرنا تھی
مہِ نو تجھ کو زک دی ہے اسی مدِ مقابل نے

جنازہ جب کسی شوریدہ سر کا قبر میں اترا
میں یہ سمجھا لیا آغوش میں دریا کو ساحل نے

وہی آشفتہ سامانی وہی خاطر پریشانی
اُڑایا قیس تیرے دل کا خاکہ گردِ محمل نے

مصائب اک طرف اور اک طرف بارِ گنہ سر پر
یہ کیا کم ہے سبک دوشی مجھے دی تیغِ قاتل نے

ترس کھا کر زمانہ بھی مدد کو اب ہے آمادہ
بڑی آسانیاں کر دی ہیں پیدا میری مشکل نے

کفِ وحدت میں حسنِ انتظامِ بزمِ کثرت ہے
کیا ہے جمع پروانوں کو اپنے شمعِ محفل نے

وہ آتے بھی تو عرضِ مدعا کا دم نہ تھا مجھ میں
سہارا دے دیا لیکن مرے ٹوٹے ہوئے دل نے

فرشتے اور وہ سجدہ کریں آدم کے پُتلے کو
جھکایا نوریوں کے سر کو بھی اس پیکرِ گل نے

ہنسے گل سبزۂ خوابیدۂ گلشن نے کروٹ لی
صفی چونکا دیا دنیا کو فریادِ عنادل نے

صفی

انسان کی تازہ کاریاں

مولانا وحید الدین صاحب سلیم رکن آردو یونیورسٹی حیدرآباد دکن

(۱)

پیدا ہوا ہے جب سے جہاں ۔ ہے اُسی طرح
انجم کا یہ نظام رواں ہے اُسی طرح

کھلتے ہیں پھول جھڑتے ہیں مرجھا کے بار بار
نیرنگیٔ بہار و خزاں ہے اُسی طرح

آتا ہے ابر اور برستا ہے جا بجا
رقصاں فلک پہ برقِ تپاں ہے اُسی طرح

ساحل خموش عالمِ حیرت میں اب بھی ہے
طوفانِ بحر گرمِ فغاں ہے اُسی طرح

شہباز اُسی طرح ہے کبوتر کی گھات میں
آہو شکارِ شیرِ ژیاں ہے اُسی طرح

چشمہ شگافِ کوہ سے اب بھی ہے موجزن
پتھر کے دل میں آگ نہاں ہے اُسی طرح

مائل ہے اب بھی سیلِ رواں جانبِ نشیب
اُڑتا ہوا یہ اب بھی دھواں ہے اُسی طرح

ہر شے دمِ اپنے شیوۂ پیشیں کا بھرتی ہے
جو کام کر چکی ہے، وہی اب بھی کرتی ہے

(۲)

انسان کی سرشت مگر بے قرار ہے
اک حال پر ثبات اُسے ناگوار ہے

جدت پسندی اُس کی طبیعت کا ہے شعار
ہر دم خیالِ نو سے دل اُسکا دوچار ہے

وسعت کو بحر و بر کی وہ پامال کر چکا
محکوم اُس کی قوتِ برق و بخار ہے

اُس کا خیال عرش سے آگے نکل گیا
اُس کی نظر نجومِ درخشاں سے پار ہے

بزموں میں اُس کی شانِ جمالی ہے جلوہ گر
رزموں میں اُس کی شانِ جلال آشکار ہے

دل اُس کا دیکھیے، تو کہو تازہ فکر اُسے
ہاتھ اُس کا دیکھیے تو سدا تازہ کار ہے

مرضی سے اپنی چاہے جس شے کو دے بدل
قدرت کی طاقتوں پہ اُسے اختیار ہے

جب سے جو اُسکی دھن ہے نئی، آن ہے نئی
جب دیکھو، اُسکا جلوہ نیا، شان ہے نئی

سلیم

غزل

از جناب مولانا رضا علی صاحب وحشت، لکھنؤ

جھوم رہا ہوں بیٹھ کروادیٔ کوہسار میں
جاؤں چمن کی سیر کو ہوش کہاں بہار میں

ہوگئی زندگی عذاب کیسی کشاکش آپڑی
شوقِ سبک خرام میں عقلِ گراں وقار میں

کچھ نہیں آسرا مگر پھر بھی اُمیدوار ہے
کس نے یہ رُوح پھونکدی تیرے اُمیدوار میں

خاک میں مل کے پاگیا گنجِ مرادِ عاشقی
گشتہ بجستجوئے چین سے ہے مزار میں

خوابِ شباب خوب تھا کھل گئی ناحق اپنی آنکھ
دشمنِ عیش ہوگیا ہم خزاں بہار میں

دل ہے تکلف آشنا لطف ہے جب کہ دیکھئے
بادۂ لعل فام کو ساغرِ زرنگار میں

مستیٔ ذوقِ شعر سے بزم کی بزم ہے خراب
کوئی تو بات ہے ضرور وحشتِ سحر کار میں

وحشت

نیرنگِ خیال

(حضرت فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی)

کتنا پیارا لفظ ہے نیرنگ اے باغِ خیال
تجھ سے لبریز مے ہر رنگ چاناغِ خیال

ہر تماشا حیرت افزا ہر کرشمہ دیدہ زیب
جو مرقع ہے ترا وہ دشمنِ صبر و شکیب

جوہر روشنگرِ آئینۂ گیتی نمای
ای پشیمانی فزای دانش و فرہنگ درای

دانۂ مرغِ نظر ہے دامِ چشم و گوش ہے
چاہ خس پوشِ ہوس۔ سیلابِ عقل و ہوش ہے

تیری ہستی کیا ہے مکر و حیلہ و سحر و فسوں
پھر تماشا تو یہ ہے ہوش و خرد ہیں سب زبوں

سب کو منظورِ نظر ہے ہمت افزائی تری
ہے سزاوارِ تماشا بزم آرائی تری

آزاد

دسمبر ۱۹۳۸ء

"فسانۂ گُل و بُلبل"

(از جناب عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی)

بہاروں سے بنا ہے باغ صدر شکِ پری خانہ — کچھ ایسی کیفیت ہے دل ہوا جاتا ہے دیوانہ
نسیمِ صبح کی اللہ رے رفتارِ مستانہ — گلوں کا بادۂ شبنم سے ہے لبریز پیمانہ
شمیمِ روح پرور اُڑ رہی ہے مُشکبُو ہو کر
کنول دل کے کھلاتی ہے نسیمِ آرزو ہو کر

گُلِ خوش رنگ اپنی تازگی پر ناز کرتا ہے — غرورِ حُسن سے انداز پر انداز کرتا ہے
نئے غمزے نرالی شوخیاں غمّاز کرتا ہے — زمانہ ساز۔ اُلٹا بُلبلوں سے ساز کرتا ہے
لُبھانے کا طریقہ گل کی یہ چالاکیاں دیکھو
رُکاوٹ ہی ذرا دل میں نہیں بیباکیاں دیکھو

غضب ہونٹوں ہی ہونٹوں میں ادا سے مُسکراتا ہے — تبسم ہائے پنہاں سے کبھی بجلی گراتا ہے
بلا کے ڈھنگ آتے ہیں غضب دل کو لُبھاتا ہے — کبھی جلوہ دکھاتا ہے کبھی رُخ کو چھپاتا ہے
عجب حالت ہے بُلبل کی اِدھر جوشِ محبت میں
زباں تالو سے دم بھر کو نہیں لگتی ہے چاہت میں

رُجھانے کے لئے معشوق کو نغمے سُناتی ہے — کبھی ٹپہ کبھی ٹھمری کبھی دُھرپت اُڑاتی ہے
خوشی سے پھول کر پھولی نہ جامے میں سماتی ہے — وصالِ گل سے پروانے کو ہنس ہنس کر جلاتی ہے
کہ واصل ہونا معشوقوں سے ہم سے سیکھ پروانے
فراقِ شمع میں کب تک جلے گا یونہی دیوانے

اگر ہے عشقِ صادق عاشقی کی شان پیدا کر — دلِ پُرغم میں حسرت آرزو ارمان پیدا کر
نگاہوں میں مزاجِ یار کی پہچان پیدا کر — اگر منزل کٹھن ہے راستہ آسان پیدا کر
لگی میں جان کے کھونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا
کہ یوں جلنے سے کوئی عاشقِ کامل نہیں ہوتا

کہا بُلبل سے پروانے نے سُن اک بات کہتا ہوں — فدا ہے گل پہ تو میں شمع پر سو جاں سے شیدا ہوں
کبھی دیکھا مجھے تو نے ذرا بھی لب ہلاتا ہوں — کلیجہ دیکھ میرا کس قدر میں ضبط کرتا ہوں
ہمارا عشق صادق ہے کہ جاں پر کھیل جاتے ہیں
اُسی کی آگ میں جلتے ہیں جس سے لو لگاتے ہیں

قفس میں کس لئے گھٹ گھٹ کے جاں اپنی گنوائیں ہم — ہمارا عشق تیرا سا نہیں ٹسوئے بہائیں ہم

ہمیں تو شرم آتی ہے کہ یوں باتیں بنائیں ہم
کسی کی سُن نہیں سکتے تو کیوں اپنی سنائیں ہم
زباں سے اُف نہیں کرتے ہمیں مرنا گوارا ہے
مگر جو کچھ نہ کرنا تھا وہ اب کرنا گوارا ہے

گل و بلبل کی بھی سُننا ذرا اسرار کی باتیں
محبت سے مزے سے ہو رہی ہیں پیار کی باتیں
کبھی تعریف موسم کی کبھی گلزار کی باتیں
گلے میں ہاتھ ڈالے یار سے ہیں یار کی باتیں
مگر اب تفرقہ پڑ جائے گا وہ دن بھی آتے ہیں
کوئی رم جانا ہے صیاد و گلچیں منہ دکھاتے ہیں

اِدھر چن چن کے گلچیں لے گیا پھولوں کو دامن میں
اُدھر صیاد نے بلبل پہ ڈالا دام گلشن میں
بہار اگلے برس اب آئیگی جیتوں کو ساون میں
خلیقِ زار دل بیٹھے بٹھائے پڑ گیا ہے کیسی اُلجھن میں
قفس میں مر گئی بلبل ہوئی پھولوں کی پامالی
بس ان کی رہ گئی ہے داستاں ہی داستاں خالی

خلیق

غزل

(از:- جناب شوکت تھانوی)

افسردہ خاطری میں نکلیں جو کچھ صدائیں
شورِ شکستِ دل سے پُر ہو گئیں فضائیں
برہم کنِ جہاں ہیں کافر تری ادائیں
دُنیا نہ بچ سکی تو دل کس طرح بچائیں
معمورِ عشق کر دیں دُنیا کی سب فضائیں
اُلفت کے ساز چھیڑیں نغمے خوشی کے گائیں
توبہ کروں گا واعظ لیکن ذرا یں سُن لوں
کچھ مجھ سے کہہ رہی ہیں اُمڈی ہوئی گھٹائیں
فصلِ بہار سے کیا نادانیوں کو مطلب
چھیڑیں نہ اب قفس میں آ کر مجھے ہوائیں
یہ داغ میرے دل کے اور آسماں کے تارے
سوتی ہوئی فضائیں جاگو کوئی جگائیں
تا چند ضبطِ نالہ مجبور ہو گئے ہیں
بس اب یہی ہے جی میں مٹ جائیں یا مٹائیں
ہم ہیں وفا کے پورے تم ہو جفا کے کامل
تم ہم کو آزماؤ ہم تم کو آزمائیں
خوشبو جنوں کا شوکت پیغام دے رہی ہے
کیا جانے کس چمن سے گزری ہیں یہ ہوائیں

شوکت

غزل

(از جناب مصور، در وحضرت عبدالباری آسی الدنی)

دنیا میں کوئی غم کے علاوہ خوشی نہیں — وہ بھی ہمیں نصیب کبھی ہے کبھی نہیں
وہ آرزو کبھی دلِ مضطر نے کی نہیں — سو بار جس پہ خوبیٔ قسمت ہنسی نہیں
احساسِ درد ہو تو کریں درد کا علاج — لیکن یہاں تو درد کی پہچان ہی نہیں
کیوں اے وفورِ جذبۂ طاقت رُبائے دل — کیا واقعی میں قابلِ فریاد بھی نہیں
تحقیقِ جوشِ خندۂ گل بار ہا ہوئی — مخجلت کی ہے ہنسی یہ خوشی کی ہنسی نہیں
برسوں حریمِ ناز نے دھوکے دیئے مجھے — اب دیکھتا جو ہوں تو یہاں کوئی بھی نہیں
غم بھی بقدرِ جوشِ وفا ہے شبِ فراق — جو مجھ پہ ہے وہ شمع پہ افسردگی نہیں
لے آئی اُس قفس میں چمن کو نگاہِ شوق — جس میں جگہ امیدِ رہائی کی بھی نہیں
دھوکا نہ کھاؤ چارہ گرو واقعات سے — پہلو میں دل نہیں ہے تو کیا درد بھی نہیں
تربت پہ چند روز رہیں گل فشانیاں — کچھ دن گذر گئے تو وہ دو پھول بھی نہیں
تعیّنِ حدِ صبر کروں کس اُمید پر — تکلیف ایک حال پہ ٹھہری ہوئی نہیں
بزمِ طرب کے رنگِ تغافل کو دیکھ کر — اُس سمت دیکھتا ہوں جہاں کوئی بھی نہیں
دنیائے تیرگی ہے شبِ غم کے ساتھ ساتھ — تارے نکل رہے ہیں مگر روشنی نہیں
اے بدگماں شدائدِ دُنیا پہ صبر کر — فطرت کو تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں

اک شمع بے فروغ ہے آسی وہ داغِ دل
دُنیا میں جو کہ باعثِ آشفتگی نہیں — آسی

حُسنِ تغزّل

از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش بی۔اے

ملتے ہی کسی سے کھو گئے ہم — جاگے جو نصیب سو گئے ہم
ساقی سے بندھا وفا کا پیماں — جب نشہ میں چور ہو گئے ہم
اے آبلہ پائی محبت! — کانٹے ترے حق میں بو گئے ہم
لیں اُن کی بلائیں بھی تو اغیار — للہ اب ایسے ہو گئے ہم
آکر تری بزم میں بلا کیا؟ — کچھ اپنی گرہ سے کھو گئے ہم
اب اُن کی خدائی دیکھنی ہے — سنتے ہیں خودی سے تو گئے ہم
ہنسنا ہے تو ہنس لے شمع ہستی — رونا ترا خوب رو گئے ہم
پانی سے ہوا ہوئے تھے پہلے — پھر آگ سے خاک ہو گئے ہم
پھر آپ میں آرہا ہے کوئی — پھر ہنس کے کہو کہ تو گئے ہم

کام آئیں تپش یہ سرد آہیں
ٹھنڈی تھیں ہوا میں سو گئے ہم

تپش

پیغامِ عمل

از جناب انعام عظیم صاحب برنی ایم اے

کس قدر کیف آفریں تھا رات حُسنِ ماہتاب! — پیرِ زالِ دہر پر بھی چھا گیا رنگِ شباب
محفلِ قدرت پہ طاری ہو گیا پیہم سکوت — طائروں نے بند کر دی جہد باری کی کتاب
یوں یکایک ہو گیا ہنگامۂ ہستی خموش — ٹوٹ جائیں جس طرح یک لخت ستارِ رباب

بزمِ ہستی میں دلِ محزوں تھا یا مسرور تھا
اس فضائے پُرسکوں کے سحر سے مسحور تھا

آخرِ شب چار سو طوفان محشر خیز ہے — وہ فضائے پُرسکوں اب شور سے لبریز ہے
ہو گیا ہے درہم و برہم نظامِ کائنات — ذرّے ذرّے سے عیاں سعیِ جنوں آمیز ہے
سب عناصر دے رہے ہیں اپنی طاقت کا ثبوت — کوئی طوفاں خیز ہے کوئی شرر انگیز ہے
دہر میں برپا ہے اک ہنگامۂ سعیِ عمل — مسلمِ غافل مگر اب تک ترنم ریز ہے

یہ ترنم رفتہ رفتہ نالۂ و شیون نہ ہو — یہ سکوت اسکا کہیں ہنگامۂ دامن نہ ہو

برنی

دسمبر ۱۹۲۶ء

غزل

(از جناب سید عابد علی صاحب عابد بی اے ایل ایل بی وکیل)

ہر نقش کائنات ہے دنیا مرے لئے
تصویر نو بہار ہے صحرا مرے لئے

رنگینیٔ نگاہ سے شاداب ہے خیال
جاری ہے ایک حسن کا دریا مرے لئے

جنت کو اُن کے حسن سے پہچانتا ہوں میں
جنت ہے اُن کی صورتِ زیبا مرے لئے

رنگ آفرینِ کیف ہے یہ چیز ساقیا
کافی ہے زرنگاریٔ مینا مرے لئے

رنگینیٔ جمال کا پردا بھی کم نہیں
پردے کا اہتمام ہے کیسا مرے لئے

رگ رگ میں دوڑتی ہے لہو کی طرح شراب
سرمایۂ حیات ہے صہبا مرے لئے

پہنا عروسِ شام نے تاروں بھرا لباس
روشن ہوا چراغِ ثریا مرے لئے

بُت بھی مجھے پسند، خدا بھی مجھے عزیز
کعبہ مرے لئے ہے کلیسا مرے لئے

وہ سرزمینِ حسن وہ لاہور کی فضا
جس کا خیال ہے طرب افزا مرے لئے

سرمایۂ حیات ہے عابد وطن کی یاد
مٹی ہے جس کی عرشِ معلّٰی مرے لئے

عابد

حسیات

(از جناب اصغر حسین خانصاحب نظیر لدھیانوی)

اُس ستمگار سا دُنیا میں مسیحا بھی نہ ہو
جان سے جائے کوئی اور اُسے پروا بھی نہ ہو

یہ تو ممکن نہیں اے پردہ میں چھپنے والے
تیرا بندہ بھی ہوں اور کوئی تمنّا بھی نہ ہو

ایک عالم کو کیا ہو ترے خنجر نے ہلاک
کیا قیامت ہے کوئی تیرا شناسا بھی نہ ہو

دوست دشمن میں تفاوت انہیں منظور نہیں
مہرباں ہو کوئی دُنیا میں تو اتنا بھی نہ ہو

بزم میں ہجر کا قصہ بھی بیاں ہو جائے
اور اے جوشِ محبت کوئی رُسوا بھی نہ ہو

دل بیتاب وہاں شرمِ تمنا کیسی
لب کو جس بزم میں گویائی کا یارا بھی نہ ہو

غمگساری نہ سہی ظلم و عداوت ہی سہی
وائے تقدیر مرے حق میں گر ایسا بھی نہ ہو

آؤ اُلفت کدہ تعمیر کریں ہم جس میں
رنگِ کعبہ بھی نہ ہو طرزِ کلیسا بھی نہ ہو

اہلِ گلشن کو یہ صیاد کا فرماں ہے نظیر
کوئی ہنگامِ سحر زمزمہ پیرا بھی نہ ہو

نظیر

شعر اور ترانہ

(از جناب روشن دین صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

عہدِ قدیم میں اک۔ کہتے ہیں نغمہ گر تھا
جس کے گلو میں پنہاں تاثیر کا شرر تھا

اِک گیت اُس نے گایا شب کو لبِ سمندر
پانی تمام گویا شعلوں کا اک بھنور تھا

پتھر کے خانماں میں جاکر لگی چنگاری
بادِ صبا کا دامن اک چاک سر بسر تھا

مہتاب رہ گیا اک پتلا سکوں کا بن کر
تاروں کے آنسوؤں سے رومال شب کا تر تھا

ساکن ہوا اُفق پر بادل کا قافلہ بھی
آواز کی کشش میں کیا جانے کیا اثر تھا

کچھ دیر گیت گا کر خاموش ہو گیا وہ
اور آپ اپنی لَے کے دامن میں سو گیا وہ

ہر شے کو ہے تغیّر دستور ہے جہاں کا
ٹوٹا طلسم آخر مینائے نغمہ خواں کا

مفقود ہو گیا وہ اُس کی نوا کا جادو
ہاں شور دور تک تھا امواج کی فغاں کا

انجام دیکھ کر یہ افسردہ ہو گیا وہ
اُدھر الم سے اُس کے صبر و سکوں کا ٹانکا

پیدا ہوئی اک اُس کے دل میں نئی تمنا
جو یا ہوا نوا کی تاثیرِ جاوداں کا

اس دُھن میں چھان مارا ہستی کا کونا کونا
لیکن پتہ نہ پایا اس جنسِ بے نشاں کا

جب تھک کے ہار بیٹھا وہ نغمہ گر تو اِک دن
اُس نے جو اتفاقاً شاعر کے دل میں جھانکا

تاثیرِ جاوداں کو دیکھا وہاں مکیں ہے
ہے شعر وہ ترانہ جس کو فنا نہیں ہے

روشن دین

غزل

(از جناب خان محمد کبیر خاں صاحب تسلی اے علیگ)

ٹھہر اے شاہدِ معنی سنبھل کر رکھ قدم دل میں
کہیں ہل چل نہ پڑ جائے تمناؤں کی محفل میں

اُمیدیں حسرتیں ہنگامہ آرا ہیں مرے دل میں
لئے بیٹھا ہوں میں اک محشرِ خاموش محفل میں

چمن کا ہر گلِ نوخیز کہتا ہے اشاروں سے
مجھے بھی توڑ کر رکھ لے کوئی گلدستۂ دل میں

دمِ بسمل یہ سوئے آسماں اُٹھنے نہیں پاتیں
نگاہیں جذب ہو جاتی ہیں سب شمشیرِ قاتل میں

نظر ہاں وہ نظر کہتے ہیں جس کو موجِ بے تابی
نکل کر اُن کی آنکھوں سے سرایت کر گئی دل میں

زبانِ شمع سے سُنکر فسانہ اپنی ہستی کا
کوئی حسرت زدہ سر دھن رہا تھا رات محفل میں

خدا کا شکر مرگِ بیکسی کا رہ گیا پردہ
ہوئے غربت کے متوالے سپردِ خاک منزل میں

کبھی ڈوبنے والوں کی آفت تھی
ہزاروں چاک آتے ہیں نظر دامانِ ساحل میں

سجا کر میّتِ اُمید ناکامی کے پھولوں سے
کسی بیدرد نے رکھدی مرے ٹوٹے ہوئے دل میں

رہا دنیائے حسن و عشق کا افسانہ ہوا بدل
نہ وہ مجنوں ہے صحرا میں نہ وہ لیلیٰ ہے محمل میں

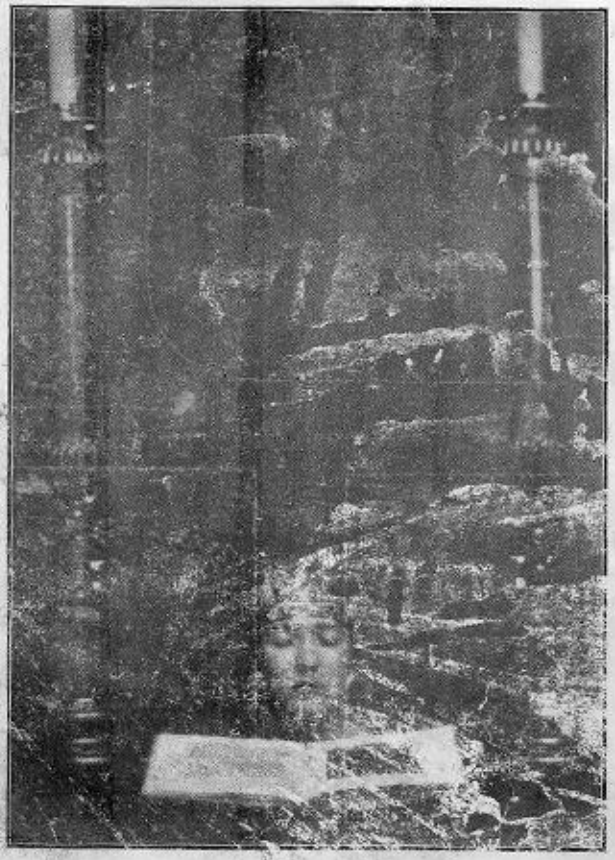

ایوان قصور

رمادین

دسمبر ۱۹۳۶ء



دعا



کل کا آدمی



قیدی

نغمۂ مسرّت

(جناب یلدرم نے ایک عزیز کی خانہ آبادی پر موزوں کیا)

[محترم شفیق جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے علیگ مستحق شکریہ ہیں جنہوں نے ایک "نغمۂ مسرت" سالنامہ کے لئے جناب یلدرم سے حاصل کر لیا۔ اس نظم کے تیسرے بند کے متعلق جناب قدوائی کی ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ اس "دیار مصوّر" "بلدۂ شعر و موسیقی" لاہور کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے"۔]

گل ریز ہے دشت و دمن — گل پاش ہے صحن چمن
ہر سو طرب جلوہ فگن — صوفی بھی ہے کیا شوخ و شن
آئی بہار اب پھر چمن — ہے بلبل و گل کا وطن
دیر و حرم سے نعرہ زن — آئے ہیں شیخ و برہمن

یاں جو ہے وہ گل پیرہن — رنگیں بیاں رنگیں سخن
ہاں مطربا! بربط بزن — ساقی! مرا از پا فگن
"زاہد سے کہہ دو یہ سخن — ہے فصل گل توبہ شکن
گر چاہے عیش جان و تن — میخواروں کا سیکھے چلن"

اس شہر کے پیر و جواں — ہیں خوش نما و خوش بیاں
یہ دل ربا وہ دل ستاں — دل باختہ دل دادہ آں
لیلیٰ طبع، مجنوں وشاں — مہر و وفا کے رازداں
دل دار بام و آستاں — دل باز ہر اک مرد و زن

اک دشمن ایمان و دیں — ثانی نہیں جس کا کہیں
چنگیز جس کا خوشہ چیں — مذہب ہے جس کا غیظ و کیں
ایسا شقی اک نازنیں — وحشت فزا قہر آفریں
خوں ریز جس کی آستیں — قاتل کی سی جس کی پھبن

خنداں و خوش آیا یہاں — مسرور تھا اور شاداں
رخ پہ مسرت تھی عیاں — لب پر خوشی کی داستاں
تیر و تبر، تیغ و سناں — رکھ کر ہوا سجدہ کناں
کرنے لگا وردِ زباں — شکرِ خدائے ذوالمنن

جب شادیاں ہوں ہر طرف — جب رنج و غم ہو بر طرف
خوشیاں کھڑی ہوں صف بصف — ہر شخص ہو جب زر بکف
ہے باعث عز و شرف — گر چھوڑ دوں اپنا شغف
لوں ہاتھ میں تیں چنگ و دف — کیا خوب ہے مطرب کا فن!

یہ سب تو اک افسانہ تھا — [illegible] کا کاشانہ تھا
رندانہ تھی طرز ادا — دل میں ہے حرف مدعا
گو سب نے سنائی واہ وا — ہے اب مگر وقت دعا
جو نزد خدا — مقصد نہیں شعر و سخن

کہتے ہیں سب گردوں نشیں — کہتے ہیں سب اہل زمیں
ہو آج تم الفت قریں — اے میرے نوشہ آفریں!
اے قیس بے طینت گزیں — اک لیلیٰ محمل نشیں
گھر [illegible] مکیں — با عفت و با علم و فن

یلدرم

خواجہ سرا

(ایک طبعزاد افسانہ)

(ایڈیٹر کے قلم سے)

مسئلہ تخلیق انسانی کے تمام نظریات پر ڈارون سے لے کر فلچر تک غور کیجئے۔ اُن میں آپ اشرف المخلوقات کی تیسری جنس نوعی کا ذکر تک نہ پائینگے اور یقیناً آج تک حکما اور محققین کی توجہ اس اہم ترین مسئلہ کی طرف کبھی منعطف نہیں ہوئی۔

خواجہ سرا! اشکالِ اعضا کی رو سے ایک مکمل انسان ہے۔ بلند قامت چوڑا سینہ۔ مردانہ وضع کی پنڈلیاں۔ مضبوط کلائیاں جن کے رگ و پٹھے جوانی اور مضبوطی کا نقش جما رہے ہوں۔ اس پر نسائی وضع کا چہرہ۔ سرگیں آنکھیں۔ عنابی ہونٹ۔ موتی جیسے چمکیلے دانت۔ ناز و انداز اور چال ڈھال میں مرد سے اتنا مختلف کہ عورت بھی اُس کی نقل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورت نے نسائیت اسی سے سیکھی تھی۔ جذبات کے لحاظ سے بھی کوئی سمّہ نہیں۔ اُس پر "جوانی دیوانی" کے ایام تو نہیں آتے البتہ بلوغت سے لے کر بڑھاپے تک "سدا جوانی" کا جذبہ ضرور کارفرما نظر آتا ہے۔ مگر ہر کس و ناکس اُسے انسانیت سے خالی سمجھتا ہے۔ مرد اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ عورت اُسے اپنی تذلیل سمجھتی ہے۔ کوئی زنانہ کہتا ہے۔ کوئی ہیجڑا پکارتا ہے۔ معاشرتی نظام میں اُس کی ہستی بمنزلہ صفر کے ہے۔ نہ وہ مرد ہے نہ عورت۔ پھر بتلایئے کہ وہ کیا ہے؟

تاریخ اور مسئلہ تخلیق کے متعلق جسقدر کتب مل سکتی ہیں اُن میں اس کا ذکر موجود نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمام اہل قلم نے اس محیر العقول ہستی سے اغماض کیا ہے۔ گذشتہ زمانے میں صرف ایک عرب مورخ نے کسی ایک عورت کے مرد بن جانے کا تذکرہ لکھا تھا۔ جسے آج سے دو سال قبل حکمائے حاضرہ ایک گپ تصور کرتے تھے۔ لیکن جب سے روس اور اطالیہ میں ایک ایک عورت کے مرد بن جانے کی مصدقہ اطلاعات اخبارات میں مشتہر ہوئی ہیں۔ وہ پرانی روایت بھی صحیح معلوم ہونے لگی ہے۔ کس قدر تعجب خیز ہے۔ کہ جو عورت برسوں "عورت" تھی۔ اب اپنی حیات کی بقیہ گھڑیاں ایک "میاں" کی زندگی کی طرح بسر کریگی۔ کیا ان واقعات سے ہم اُس کھوئی ہوئی کڑی کو حاصل نہیں کر چکے جو عورت اور مرد کے درمیان ایک ارتقائی حالت تھی؟ کیا عورت اور مرد کی درمیانی منزل ہیجڑا نہیں؟ شاید اس نظریہ تک پہنچنے اور اس کو مصدق کرنے میں حکمائے عالم کو کئی صدیاں درکار ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس چلتے پھرتے۔ اور محرک نیم مرد نیم عورت کی رگوں میں بھی خون رواں ہے۔ ایسا خون جس میں حرارت ہے۔ زندگی کی حرارت۔ اُس کے سینہ میں بھی دل ہے۔ جذبات اور اُمنگوں سے بھرا ہوا۔ اُسے بھی قدرت سے دماغ ملا ہے۔ جو سوچنے والا ہے۔ جس میں خیالات کے مدوجزر پیدا ہوتے ہیں۔ فردوس بھی قدرت کے ان عطیات سے محروم نہ تھا۔ دنیا محض اُسے اپنے زاویہ نگاہ سے مطالعہ کرتی۔ اُسے کھاتے پیتے چلتے پھرتے اور خدمت بجالاتے ہوئے دیکھتی۔ اور اُسے ایک محرک پُتلے سے زیادہ وقعت نہ دیتی تھی۔ لیکن وہ صرف ایک محرک پُتلا ہی نہ تھا۔ بلکہ جذبات و خیالات کے لحاظ سے بھی کسی دوسرے مرد یا عورت سے کم نہ تھا۔

چنانچہ ایک دن جبکہ نیلگوں آسمان پر نوری غازہ کی باریک سی تہہ چڑھ رہی تھی۔ اور کہیں کہیں کوئی ستارہ چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما کر اپنی آخری جھلملاہٹ سے رات کے اختتام کی خبر دے رہا تھا۔ شاہی محل کے پہرہ دار آخری بار تبدیل ہو چکے تھے۔ بازاروں اور گلیوں میں چلنے پھرنے والے اِکّے دُکّے آدمی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دینے لگی تھی۔ اس وقت کرمان شاہ کے شاہی محل سرا میں خواجہ سراؤں کا افسر فردوس بھی بیدار ہو چکا تھا۔ جب اُس نے آسمان پر صبح صادق کی علامات دیکھیں تو جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ دو تین جمائیاں اور تین چار انگڑائیاں لیں۔ پھر ہائے اللہ! ہائے اللہ کہہ کر اُنگلیاں چٹخائیں۔ کپڑے پہن۔ سر پر زرہ بفتی کلاہ رکھ اُس پر دوپٹہ ڈال ہاتھ میں سانٹھ لیکر چلا۔ تاکہ محل کے دوسرے ملازموں کو بیدار کر دے۔

کم و بیش پچاس ساٹھ خواجہ سرا ایک برآمدہ میں محوِ خواب تھے۔ اُن کے

خراٹوں کی آواز سے چڑیاں بھی بھاگ رہی تھیں۔ ایک ایک سانٹا رسید ہوتے ہی وہ اُٹھ کر بھاگے۔ ان میں بونے بھی تھے۔ لحیم و جسیم بھی۔ منحنی بھی اور تنومند بھی۔ اُن کے بیدار ہوتے ہی گویا تمام محل بیدار ہو گیا۔ بیگمات۔ شہزادے۔ شہزادیاں۔ سبھی جاگ اُٹھے۔ اور ہر شخص اپنے فرائض کی بجا آوری میں مشغول و مصروف نظر آنے لگا +

محلسرائے کے ملحقہ پائین باغ میں سحر خیزی کی برکات سے مستفید ہونے والی شہزادیاں اور شہزادے گھوم پھر رہے تھے۔ کوئی اس طرف مصروف گلگشت تھا کوئی اُس طرف۔ درجنوں حسین لونڈیاں اور غلام بچے جو ملک کے ہر حصہ سے منتخب کر کے جمع کئے گئے تھے باغ کی دلفریبیوں اور رعنائیوں میں چار چاند لگا رہے تھے۔ صاف ستھری روشیں خوشبودار پھول۔ نرگس اور گلاب کے تختے جاذب نظر تھے۔ زمردین سبزہ کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے مرمریں کرسیاں اور تخت نصب کئے گئے تھے۔ جو دور سے آسمانی سیارے معلوم ہوتے +

ناہید۔ علی قلی خاں حاکم کرمان شاہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ ایک تخت پر بیٹھی ہوئی نسیم صبح کے ہلکے ہلکے خوشگوار جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ محل کی خادمائیں۔ بہترین پھول فراہم کر کے لاتیں اور ناہید کے آگے تخت پر ڈال دیتی تھیں۔ ناہید اُن میں سے کوئی خوشرنگ، خوشبودار پھول اُٹھا لیتی تھوڑی دیر اُس کی بھینی بھینی خوشبو سے مشام جان کو معطر کرتی اور پھر اُسے ایک طرف رکھ دیتی۔ کبھی شبنم سے تر بتر پتیوں کو چھو کر اُن کی گدازیت اور طراوت سے دل بہلاتی تھی +

فردوس نے دور سے یہ سما دیکھا۔ وہ ہر روز یہ سما دیکھنے کا عادی تھا۔ یہی اُس کی زندگی تھی۔ اور اسے ہی وہ اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتا تھا۔ وہ جان و دل سے ناہید پر نثار تھا۔ اُس کی خوشی کو اپنی خوشی اور اُس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا تھا۔ فردوس نے لپک کر ناہید کی ہرنی کو پکڑ لیا۔ جو چھن چھن اور جھم جھم کرتی ہوئی باغ میں دوڑی پھرتی تھی۔ اُس کے پاؤں میں طلائی اور نقرئی گھونگرو پڑے ہوئے تھے گلے میں ایک جڑاؤ کنٹھی تھی۔ جو بہت بھلی معلوم ہوتی۔ فردوس نے اُس کے چاروں پاؤں حنا سے رنگین کئے ہوئے تھے۔ جب ہرنی جھوم جھوم کر چلتی تو دلہن معلوم ہوتی تھی +

فردوس ہرنی کو اُٹھائے ہوئے اُس کی لمبی لمبی اور بڑی بڑی آنکھوں پر بوسے دیتا ہوا ناہید کے سامنے پہنچا۔ قدمبوس ہو کر ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور ہرنی ناہید کی گود میں بٹھا دی +

خوبصورت ہرنی نے گردن اُٹھا کر اپنی مالکہ کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ اُس نے ناہید کی تمام توجہ کو جذب کر لیا۔ ناہید نے شفقت بھرا ہاتھ اُس پر پھیرا۔ اور پھولوں کے ہار اُس کے گلے میں ڈال کر اُسے زمین پر کھڑا کر دیا۔ اور فردوس سے اشارہ کیا کہ وہ اُسے بھگائے +

ہرنی دوڑی اور اُس کا جھوم جھوم کر چلنا کبھی جست کرنا کبھی تحرز انداز سے اِدھر اُدھر دیکھنا بہت ہی پُرلطف معلوم ہوتا تھا۔ ناہید نے پھر اُسے اُٹھا لیا اور بہت بہت پیار کیا +

مرمریں کرسی سے لگا ہوا فردوس بھی بیٹھا تھا۔ جو بار بار للچائی ہوئی نظروں سے ناہید اور ہرنی کو دیکھتا۔ اور پھر آہ سرد بھر کر نظریں نیچی کر لیتا +

آفتاب بلند ہونے لگا تھا۔ اُس کی سنہری کرنیں باغ کی ہر چیز پر پڑ کر اُنہیں روشن تر بنانے لگیں۔ ناہید کا چہرہ سنہری کرنوں سے آفتابی ہو رہا تھا۔ اور یہ وہ حالت تھی جب فردوس اپنے آپ کو ناقابل ضبط سمجھتا تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنے خیالات میں کھو گیا +

ناہید نے آہستگی سے کہا:۔ "فردوس" سو گئے!

فردوس نے آواز تو سُنی لیکن اُسے آنکھیں کھولنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ شہزادی نے مسکرا کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہاتھ جو نرمی اور گدازیت میں فردوس کی دنیا میں لاثانی تھا +

فردوس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ نیم باز آنکھوں سے ناہید کی طرف دیکھا اور کہا:۔ "شہزادی صاحبہ"

ناہید نے کہا، دیکھو اس ہرنی کی خوبصورت آنکھیں انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہیں +

آج خلاف معمول فردوس کی حالت بہت زیادہ حساس واقع ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ محبت کے شعلے۔ چنانچہ فردوس سے آنکھیں چار ہوتے ہی۔ ناہید مارے شرم کے پانی پانی ہو گئی لیکن معاً اُسے فردوس کے خواجہ سرا ہونے کا خیال آیا۔ اور اُس نے سکون اور دلجمعی سے کہا۔ "فردوس تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم مجھے کس طرح سے تک رہے ہو" +

فردوس نے آہ سرد بھر کر کہا "شہزادی صاحبہ ہرنی کی آنکھیں بہت خوبصورت

ہیں مگر آپکی آنکھوں سے زیادہ حسین نہیں۔ ہرنی کی زبان گونگی ہے۔ اور میری آنکھوں کی زبان بھی گونگی ہے۔ اس طرح آپ کی آنکھوں کی زبان بھی۔ لیکن آپکی زبان کو عنقریب گویا ہونا پڑیگا +

ناہید۔ کیسے۔ کیوں؟ فردوس تمہیں کیا ہوگیا ہے؟

فردوس۔ (گہرا سانس لیتے ہوئے) جب دولھا میاں عروسی جوڑا پہنے آپکی سواری لینے آئینگے۔ اور حجلۂ عروسی میں بیٹھ کر جب آپ سے وہ پیار بھری باتیں کرینگے تو یہ زبان گویا ہو جائیگی +

ناہید۔ (گھبرا کر) کون۔ کیسا دولھا میاں۔ فردوس آج تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟

فردوس۔ آپ کی جان کی قسم۔ یہ سب سچ ہے۔ اصفہان کے شہزادہ کا پیام آیا تھا جسے شاہ عالم منظور فرما چکے ہیں +

یہ سن کر ناہید پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا معلوم ہونے لگا۔ چکرا کر لڑکھڑائی مگر جلدی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ گم سم ہوگئی۔ آنکھیں بند ہوگئیں۔ نازک نازک ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ فردوس گھبرا کر اٹھا کہ آنچل سے ہوا دے۔ دیکھا کہ ناہید کی نرگس جیسی آنکھوں سے گلاب کی پتی جیسے رخساروں پر آنسو شبنم کے قطروں کی طرح لڑھک رہے تھے +

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب اس پر کوئی صدمہ گذرتا ہے تو وہ جب تک اپنا راز کسی رازدار کے سینہ میں دفن نہیں کر لیتا۔ اُسے سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے ناہید نے اپنے مضطرب جذبات کو فردوس کے پیہم اصرار کے حوالے کر دیا +

ناہید نے کہا:۔

چار سال قبل سہیل اور میں مُلّا جعفر کے پاس ہم مکتب تھے +

فردوس نے بات کاٹ کر کہا۔ کون سہیل؟

ناہید۔ تاتاری شہزادہ جو پدر بزرگوار کے ہاں بطور یرغمال رہتا ہے +

فردوس۔ جس کی حیثیت غلاموں سے بہتر نہیں +

ناہید۔ مگر جس کی رگوں میں شاہی خون موجزن ہے۔ اور جو ایک دن اپنے ملک کا بادشاہ بنیگا +

فردوس۔ چار سال قبل وہ آپ کا ہم مکتب تھا۔

ناہید۔ وہ اور میں ہم مکتب تھے۔ اکٹھے پڑھتے اور اکٹھے کھیلتے تھے۔ آفتاب کی گرمی اور ہوا کی خنکی محسوس کئے بغیر ہم تمام دن تنہائی میں گذار دیتے تھے۔ یہانتک کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ ایک دن میں دلہن اور وہ دولھا بنا ہوا میرے پاس بیٹھا تھا کہ مُلّا جی نے دور سے ہمیں دیکھ لیا پس اُسی دن سے سہیل مجھ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اور میں اب یا تو اُس کے خطوط پڑھ لیتی ہوں۔ یا جشن نوروز اور دیگر تقریبات پر اُسے ایک نظر دیکھ لیتی ہوں۔ آہ محبت کا وہ پیمان جو ہم نے بچپن میں باہم باندھا تھا وہ اب بھی میرے لئے ناقابلِ شکست ہے۔ میں کسی اصفہان کے شہزادہ کو نہیں جانتی۔ میں اپنی جان کھو دونگی مگر وہاں نہیں جاؤں گی +

(وہ بچوں کی طرح رونے لگی)

فردوس نے تسلیاں دیں۔ دلاسے دیئے۔ بلائیں لیں۔ ناہید کیساتھ بیٹھ کر رو بھی لیا۔ مگر ناہید کو کسی طرح بھی تسکین نہ ہوتی تھی +

ناہید نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا:۔

"خوبصورت ہرنی کو دیکھ کر، خوشرنگ پھولوں کو دیکھ کر، تنہائی کے اُن لمحوں میں جب سیاہی فضا میں پھیلکر تمام جہان کو تاریک بنا دیتی ہے میں آسمان پر ٹکٹکی لگائے اختر شماری کرتی رہتی ہوں۔ میں اُن راتوں میں بھی بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتی رہتی ہوں۔ جب چاند کی ہلکی ہلکی شعاعیں ہر چیز کو منوّر بنا رہی ہوتی ہیں۔ ہائے اب کیا ہوگا"

فردوس نے کہا۔ کیا میں ملکۂ عالم سے عرض کروں؟

ناہید۔ چپ۔ ایک حرف نہیں۔ کیا تم مجھے رسوا کرو گے۔ ملکہ عالم ابا جان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتیں۔ اُن کے سامنے کسے یارائے دم زدن ہے۔ کوئی بھی اُن کے حکم سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا۔ آخر وہ بادشاہ ہیں!

فردوس۔ ہاں صحیح ہے۔ شاہ عالم کے سامنے کون جرأت کر سکتا ہے؟ اس کے بعد دونوں اس معاملے پر غور و خوض کرتے رہے +

ناہید کی شادی کا انتظام بڑے پیمانہ پر جاری تھا اور ملکہ عالم خود اُس میں پوری پوری دلچسپی لے رہی تھیں۔ ناہید دن رات ایک کمرے میں پڑی رہتی۔ اُس کی تکلیف اور کرب کو اُس کے شرم و حیا پر محمول کیا جاتا۔ لیکن فردوس ناہید کو اس حال میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے بہت سی تجاویز اختراع کیں۔ کبھی وہ ناہید کی علالت کا قصہ چھیڑ دیتا۔ کبھی اصفہان کے شہزادہ کی برائیاں اور عیوب مشتہر کرتا۔ کبھی سہیل کے حسن و جمال اور علم و فضل

کے قصے پڑھتا لیکن یہ تمام تجویزیں سراسر ناکام رہیں +

کبھی وہ اُفتاں وخیزاں سُہیل کے پاس دوڑا جاتا۔ اُس سے مشورہ کرتا۔ لیکن اُسے شہزادہ اصفہان سے دست وگریبان ہونے پر آمادہ پاتا۔ کبھی زہر بھرے پیالے سے اپنی جان کا خاتمہ کر دینے کی دھمکیاں سنتا اس پر فردوس کو اُسکی منتیں اور خوشامدیں کرنی اور تسلیاں دینی پڑتی تھیں +

اس طرح فردوس کی کوششیں کوئی مفید نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔ برات آئی اور شاہانہ تزک واحتشام سے آئی۔ امرا اور رؤسا کا ایک جم غفیر ساتھ تھا۔ مہمانوں کا شاہی آداب کے مطابق استقبال کیا گیا۔ اُنہیں ایک وسیع ایوان میں پرتکلف دسترخوان پر بٹھایا گیا جس پر انواع واقسام کے لذیذ کھانے رکھے گئے تھے +

کھانے کے بعد رقص وسرود کا دور شروع ہوا۔ سب سے اوّل شعرائے کرمان شاہ نے قصائد پڑھے جن میں بادشاہ کرمان شاہ اور دولھا میاں کی تعریف کے راگ گائے تھے۔ اس کے بعد ہر باکمال اپنے اپنے نغمہ ورقص سے حاضرین کا دل بہلانے لگا۔ یکایک ہجوم میں سے خواجہ سرا نے آگے بڑھ کر علی قلی خاں کے دامن پر بوسہ دیا۔ اور رقص کی اجازت طلب کی +

علی قلی خاں۔ رقص! تم رقص کرو گے! فردوس!!

فردوس۔ آقائے نعمت آج میرا دل بھی چاہتا ہے کہ رقص کروں +

علی قلی خاں۔ اس سے پیشتر ہمیں تمہارے کمال کا کبھی علم نہیں ہوا +

فردوس۔ آج ہی ملاحظہ کیجئے گا! حضور!!

علی قلی خاں کے ارشاد پر فردوس پیچھے ہٹا +

حاضرین میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ فردوس رقص کریگا! فردوس رقص کریگا!! خواجہ سراؤں کا افسر!!! ایک ہلڑ مچ گیا۔ سامنے کے برآمدہ میں تین چار درجن خواجہ سرا بھی یہ تماشا دیکھنے کو اکٹھے ہو گئے +

فردوس سرمہ کاجل سے درست تھا۔ لبوں پر سُرخی جمی ہوئی تھی تیل پھلیل اسقدر لگایا ہوا تھا کہ عروس معلوم ہو رہا تھا۔ کاکلیں چھٹی ہوئی تھیں۔ سر پر زریں دوپٹہ لپٹا ہوا تھا جس میں دو رنگین طرّے ٹانک رکھے تھے۔ اُنگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں اور پاؤں میں سفید موتی تھے +

فردوس نے ہاتھوں کو نچا نچا کر اور پاؤں کو تھرکا تھرکا کر رقص شروع کیا۔ اُس کی کمر کے بل اور جسم کی لچک۔ اُس کا بتاوا محیّر العقول تھا۔ اُس کی حرکات سے زندگی اور جوش ظاہر ہوتا تھا۔ وہ مجلس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک رقص کرتا چلا جاتا اور واہ واہ ومرحبا کے نعروں سے تمام ایوان گونج اُٹھتا +

فردوس ایک خواجہ سرا تھا۔ ایک عضو معطّل۔ ایک ایسی ہستی جو نہ مرد تھی نہ عورت۔ تخلیق کا ایک ناکارہ ٹکڑا۔ آہ! اس کی ہستی کچھ نہ تھی۔ وہ غلام تھا۔ اور پھر غلاموں سے بھی بدتر۔ ہر شخص کے کنج دل میں اُس کے لئے ایک نفرت پنہاں تھی۔ ایک خاص جذبۂ تحقیر موجود تھا +

فردوس نے رقص کیا۔ اور کرتا رہا۔ اُس کا دماغ اور دل اور اُسکی روح تینوں زندہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی نگاہیں اُسے پا نہ سکی تھیں۔ وہ مستقل مزاج اور عظیم الشان مقاصد پیش نظر رکھتا تھا۔ وہ شرفا۔ شمشیر زنوں اور عابد اور سب سے زیادہ اپنے بادشاہ کے حضور میں حاضر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ وہ مہینوں سے کچھ سوچ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ فرش پر جھکتی جاتی تھیں۔ وہ اپنا ایک پاؤں زمین پر رکھے اور ایڑی کو اُٹھائے ہوئے رقص کرتا ہوا دولھا کے پاس جا پہنچا۔ قدمبوس ہوا۔ بلائیں میں۔ آلتی پالتی مار کر پاس بیٹھا۔ دولھا مارے شرم کے سمٹا جاتا تھا۔ فردوس نے دولھا کا پیش قبض میان سے کھینچ لیا۔ اُسے ہوا میں اُچھالا اور اُس کے زمین پر گرنے سے قبل اُسے ہوا ہی میں دبوچ لیا۔ وہ اُسے چمکاتا۔ کلائی کو بل دیتا رقص کرتا ہوا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چلا گیا۔ برہنہ خنجر کے ناچ میں حاضرین بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ نعرہ ہائے تحسین وآفرین بار بار بلند ہوتے تھے۔ خنجر کا ناچ ختم ہونے پر فردوس نے جھک کر تمام مہمانوں کو سلام کیا۔ پھر دولھا کی بلائیں لیں۔ اور آخر کار دو زانو ہو کر خنجر پیش کیا۔ اس کے بعد اُسے خود ہی لیکر اُٹھا اور خول میں واپس ڈال دینے کی بجائے دولھا کے سینہ میں دستہ تک پیوست کر دیا!

محفل طرب پر ایک ہلکی سی چیخ بجلی کی طرح تڑپی اور ایوان میں موت وکرب کی لے میں گونج اُٹھی۔ زمین خون سے لالۂ احمر بن گئی۔ شہزادہ مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ خون!۔ خون!! ظالم!!! پاجی!!!! کی آوازوں کیساتھ کئی تلواریں ہوا میں چمکیں۔ اور فردوس پر پڑیں۔ وہ گھایل ہو کر گر پڑا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں لیکن پیشانی پر ہلکی سی سُرخی جھلک رہی تھی +

تمام محل میں ہلڑ مچ گیا۔ بادشاہ کے داماد کا قتل ہر کس وناکس کی زبان پر تھا۔ علی قلی خاں کی حالت ناقابل برداشت تھی۔ وہ شرم وحیا کے مارے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ ایک ہمعصر حاکم کے فرزند کا قتل اور پھر اُس کی آنکھوں

کے سامنے۔ شاہ عالم تین روز تک محل کے خاص کمرے سے باہر نہ نکلے۔ اور رنج و غم سے اُن کے بال سفید ہو گئے۔ تمام شہر پر خوف و ہراس طاری رہا۔ شاہی آداب و قواعد کے مطابق مراسم ماتم و تعزیت مہینوں جاری رہے۔ اور بالآخر ایک روز ملکہ عالم نے شاہ عالم کے سامنے فردوس کا اقبالِ جرم۔ اُس کے حملہ کی وجہ اُس کی عدیم النظیر قربانی کا واقعہ اس خوبی سے پیش کیا۔ کہ ایک کی موت کے بعد دوسرے کی قربانی کا چرچا زبان زد خلائق ہو گیا۔ اب ہر شخص خواجہ سرا کی عدیم النظیر جرأت اور قربانی کا ذکر کر رہا تھا +

اصفہان کا شہزادہ اور فردوس مر گئے اور مرورِ زمانہ نے اُن کی موت پر ایک ہلکا سا پردہ ڈال دیا تو چھ ماہ بعد علی خاں نے مرنے والے فردوس کی قربانی کا لحاظ کرتے ہوئے سہیل اور زاہد کا عقد پڑھایا۔ اگرچہ اس میں کسی قسم کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا +

شبِ عروسی سے اگلے روز زاہد اور سہیل دونوں باغین باغ کے اُس حصّہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں فردوس کی قبر بنائی گئی تھی۔ دونوں نے اپنے عروسی جوڑے کے تمام پھول اُس کی قبر پر چڑھا دیئے۔ اور اپنی آنکھوں سے محبت بھرے آنسو بہاتے ہوئے اُس کے لئے دعائے مغفرت مانگی!!!

ایڈیٹر

نئی لذّت

(۱)

میں نے چار پانچ سال تک مونسٹوباغات کے قریب ہی ایک محلہ میں کچھ کمرے لے رکھے تھے۔ مگر میں وہاں ہفتہ میں چند مقررہ ایام ہی ہوتا تھا۔ یہ کوئی پبرس کے بڑے شاندار مکانوں میں سے نہ تھا۔ مگر بڑی محفوظ سی جگہ تھی۔ اور اس میں ایک خاص نفاست پائی جاتی تھی۔ ایک نمایاں عیب بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ گو میرے محلہ کا ایک سرا باغ تک پہنچتا تھا۔ مگر میں اُس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ باغ کے دروازے آدھی رات کے قریب بند ہو جاتے تھے۔ اور میں ہوا خوری کے لئے منحصر ہی اُس وقت ہوں +

ایک رات میں، وہاں دو چینی کی پتلیوں کو جو سفید میز پر دھری ہوئی تھیں خاموش بیٹھا گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں حیران تھا کیا کروں، وقت سیگرٹ پینے میں گزاروں یا غزل کہنے میں۔ ایک یہ بھی خیال تھا کہ سیگرٹ پیوں اور چھت کے نقش و نگار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہوں۔ تین راستے کھلے تھے سیگرٹ غزل، ٹکٹکی ہا۔۔۔ ایسے وقت پر سیگرٹ کا پاس ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے یہ دھوئیں کے لطیف اور سماوی بادلوں میں اس مادّی دُنیا کی تمام ذلیل چیزوں کو چھپا لیتا ہے۔ کمرے کی روشنی اور تاریکی دونوں میں کچھ کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔ چیزوں کے زاویوں میں سے آئیڈیسی کر خنگی نکال دیتا ہے۔ اور کسی خوشبودار ساحرانہ منتر سے انسان کی بیقرار روح کو سکون اور آرام بخشتا ہے۔ یہی سیگرٹ اپنے ساتھ ایک نئی دنیائے خیال بھی لاتا ہے +

اس رات میں لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر جی چاہتا تھا کہ یونہی ناکارے بیٹھ رہیں۔ قصہ مختصر یہ ان بہت سی فرصت کی راتوں میں سے ایک رات تھی جب شمع گل ہوتی ہے اور ع بیٹھے ہیں ہم تصوّرِ جاناں کئے ہوئے +

معاً گھنٹی کی غیر متوقع آواز نے مجھے ان کھلی آنکھ کی خوابوں سے چونکا دیا میں نے سر اُٹھایا۔ اور اپنے آپ کو یقین دلانا چاہا کہ آج جمعرات کو یہ جن کی کونسا تاریخ کو۔ اس وقت مجھے کسی کا انتظار نہیں۔ مگر گھنٹی دوبارہ بجی۔ اور اس حقیقت کے سامنے مجھے سر جھکانا پڑا۔ ناچار بستر سے اُٹھا اور دروازے کی زنجیر کھول دی +

دروازہ کھلا اور میں نے ایک عورت کو منتظر پایا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک ہی لبادہ پہنے ہوئے تھی جو ایک قبا کی طرح اُس کی گردن سے آویزاں تھا۔ میں اُسے گھور رہا تھا۔ سر کے بال سنہری تھے۔ اور جوان معلوم ہوتی تھی۔ زلفوں کے سایہ میں آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ پر کچھ شرارت سی جھلک رہی تھی۔ بوٹا سا قد۔ سُرخ لب۔ اور مرصّع دانت۔ معلوم ہوتا تھا کہ شبنم نے رو رو کر رات ہی رات میں میرے دروازہ پر ایک انار کا درخت اُگا دیا ہے۔ اُس نے اپنے پیارے سر کو شانے کا سہارا دے کر کہا "کیوں جی، تم چاہتے ہو کہ میں اندر آجاؤں؟"

میں جھجک کے پیچھے ہٹ گیا۔ اور ایسا دبکا کہ دیوار سے چپک گیا میں حیران تھا۔ اتنا حیران کہ اس حیرانی کو چھپا نہ سکتا تھا۔ آخر بات بھی حیرانی کی تھی۔ ایک

اجنبی عورت کا اور اس قسم کی اجنبی عورت کا رات کے ایسے وقت پردہ دار کمرہ کا کھٹکھٹانا اور چھوٹتے ہی بے تکلفی سے "تم اور تو" کرنے لگنا واقعی حیرتناک امر تھا +

میں اُس کے پیچھے پیچھے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ اور جھجکتے ہوئے کہا:۔

"پیاری خاتون مجھے معاف فرمانا۔ میں آپ کو پہچانا ضرور ہوں۔ مگر حافظہ کی بھول سے نام یاد نہیں آتا۔ تو سنتی ہے یا تو تو ہے؟"

وہ منہ سے کچھ نہ بولی اور مسکراتے ہوئے قبا کے بند کھول دیئے +

اس کا ملبوس سبز زمردی رنگ کا تھا۔ جس پر دھنک کے رنگوں کی آرائشیں تھیں۔ گریبان کی قوس گویا اُبھری ہوئی چھاتیوں کا قفس تھی جس سے یہ مضطرب قمریاں پرافشاں، پرافشاں باہر نکلنا چاہتی تھیں۔ ننگے گندمی بازو سے ایک ایک سنہری سانپ لپٹا ہوا تھا۔ جن کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہکتی تھیں۔ سفید طلائی کسی گردن کے اردگرد موتیوں کی دو لڑیاں تھیں۔ نہ جانے ان موتیوں کے نکالنے میں کتنی جانیں ہلاک ہوئی ہونگی!

"اگر تم مجھے پہچانتے ہو تو اس لئے کہ ہم ایک دوسرے کو کہیں خوابوں کی دنیا میں ملے ہیں یا تخیل کے کسی ملک میں دیکھا ہے۔ جہاں خواب آپ ہی اپنی تعبیر ہوتے ہیں۔ میں لاسیہ ہوں، فلسطیہ یونانی کی بیٹی! پچھلے اٹھارہ سو برس میں میں اپنے حجرہ میں آرام سے رہی ہوں۔ دیوتاؤں کے مرغزاروں میں جہاں وہ ابتک پھولوں کی کیاریوں میں دبیبیوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں!۔ لیکن ان دنوں حجروں میں بھی آسایش نہیں۔ مجھے پیرس میں اُٹھا لائے اور میرا سایہ یا میری روح پیچھے پیچھے تھی۔ مدت تک میں عجائب خانہ کی برفانی غاروں میں سوئی رہی۔ اور یونہی پڑی رہتی۔ اگر تمہارے ہی وطن کا ایک ماہر ضمیات لوئی مینارڈ جو ہمارے رسم ورواج اور منتر جنتر کا ماہر ہے۔ مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونک نہ دیتا۔ میں اب رات کی چند ساعتوں میں زندوں کی طرح چل پھر سکتی ہوں۔ اور تمہارے اس ذلیل شہر میں گھومتی رہتی ہوں"+

میں پکارا:۔ "اے قدیم دنیا کی پروردہ تو ان نئی نئی تبدیلیوں کو جو روز بروز دنیا پر بھوتوں کی طرح مسلط ہو رہی ہیں۔ نجانے کن نظروں سے دیکھتی ہوگی!"

"تبدیلیاں؟ میں بھی اور نہیں بھی! تمہارے مکانات تاریک ہیں۔ تمہارے لباس بدنما ہیں۔ اور تمہارا آسمان ہر وقت ماتمی رہتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ تمہاری زندگی عام طور پر زیادہ احمقانہ ہے۔ اور نئی نوع انسان ان پرانے ست جگ کے ایام سے کہیں زیادہ خوناک اور ناسطمئن ہیں۔ لیکن ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جس نے مجھے مبہوت کر رکھا ہے۔ یہ ہے کہ تمہاری بہت سی چیزیں وہی پرانی ہی ہیں، کیا ..... ان اٹھارہ سو سال میں تم سب نے کچھ اور نہیں بنایا، کیا واقعی نہیں بنایا۔ کوئی نئی چیز اختراع نہیں کی۔ کیا یہ سچ ہے؟۔ وہی مکانات اور گھلی ہوا اور گلیاں! کیا بس سب کچھ یہی ہے؟ کیا تم کوئی نئی لذت تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے؟ اگر نہیں تو اے دوست یہ بات کس قدر موجب آزار ہے"!

میری حیرت کا انداز ہی میرا جواب تھا +

وہ پھر مسکرائی، پیارے پیارے سرخ لبوں کے عکس آبادر دانتوں پر اس طرح لرزاں تھے، جیسے سیپ پر سورج کی کرنیں کھیل رہی ہوں! اُس نے اپنی بات کو اور واضح کر کے سمجھایا:۔ "دیکھو میرا لباس، یہ ابھی کفن ہے۔ لیکن اسے اچھی طرح دیکھو میں اُس پہلی زندگی میں ریشم اور اُون کا لباس پہنتی تھی یہاں دوبارہ آکر بھی مجھے وہی کچھ نظر آیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ چیزیں لوگوں کو یاد تک نہ ہونگی۔ میں سوچتی تھی کہ اتنے سالوں کے بعد انسان اس طرز کے لباس بنا چکا ہوگا کہ کرنوں اور ریشم کی بُنت کو بھی شرمائے۔ جس کے چھونے سے جواں سال کنواریوں کے نازک بدن اور گلاب کی پتیوں کی ملائمت بھول جائے۔ لیکن تم ابھی تک وہی تاگے وہی اُون وہی ریشم پہنتے ہو۔ لو دیکھو میری شنگرفی پاپوش جس پر نایاب ایرانی کتابوں کی جلدوں کا سا سنہری کام ہوا ہے۔ کیا تمہاری پاپوشیں بھی ایسی ہی نازک اور حسین ہوتی ہیں؟ یہی حال اس زمانے کے ہیرے جواہرات کا ہے۔ میں یہ سب کچھ دیکھ چکی ہوں۔ آج سے اٹھارہ سو سال پہلے"!

آخر کار میں بھی بولا:۔ "لاسیہ! تو ان ظاہری چیزوں کو بہت اہمیت دے رہی ہے۔ یہ تو دوشیزہ کے حسن کو چھپانے والی چیزیں ہیں۔ اُس کا پورا محسن اُسی صورت میں نظر آتا ہے جس صورت میں اُسے دیوتاؤں نے ڈھالا ہے"!

وہ مجھے تکنے لگی اور پھر آہستہ سے بولی:۔ "کیا تم جانتے ہو کہ اب عورتیں اُن کا ڈھانچہ، وہ نہیں رہا۔ جو میری زندگی کے ابتدائی ایام میں تھا"!

(۲)

میں ازحد حیران ہوا جب اُس نے اپنے آخری الفاظ کے ساتھ ہی اپنے جواہرات اور لباس کو نیچے سرکا دیا۔ وہ گردن سے لیکر پاؤں تک ایک دیوی کی سی شان و شوکت رکھتی تھی۔ وہ ایک لمبی گہری کرسی میں ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اور کہنے لگی:۔ "تم موجودہ زمانے کے لوگوں نے عورت کو کیوں اُس تکمیل تک

نہیں پہنچایا جتنا کہ تم نے پھولوں کو پہنچایا ہے؟" پھر ایک ملائم اور مترنم آواز میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آہ وہ دنیا کے شباب کے دن وہ لذتوں کی پہلی پہلی آمد کے دن کیسے تھے!..... میرے قبر میں سونے کے اٹھارہ سو سال کے دوران میں تم سب نے مل کر بھی کوئی نئی لذت دریافت کی ہے؟ مجھے دعوت دو کہ میں تمہارے ساتھ اس میں شریک بنوں ——"

میں نے عذر کیا "ہمیں ابھی اذروقت کی ضرورت ہے"۔

وہ تمسخر کے طور پر مسکرائی "تمہارا آرٹ اور علم دونوں ہم سے مستعار لئے ہوئے ہیں —تم ہمارے مردہ جسموں کو کھانے والے کیڑے ہو! تمہارے فلسفی ڈیکارٹ اور کانٹ ہمارے پارمندیز کا پس خوردہ کھانے والے ہیں۔ اقلیدس اور ارشمیدس۔ ارسطو اور افلاطون..... تم نے کوئی نئی دریافت نہیں کی۔ جو اُن کے خیال میں نہ آچکی ہو۔ امریکہ بھی تمہاری دریافت نہیں۔ اصلو نے کہا تھا کہ زمین گول ہے۔ اور اس طرح وہ راستہ بتایا جسے آخر کار کولمبس نے اختیار کیا۔ لیکن آہ! اگر تم نے صرف ایک ہی نئی لذت دریافت کی ہوتی بجز ایک نئی لذت!"

میں نے ایک آہ بھری۔ میں نہ اُس کے قوی دلائل کا جواب دے سکتا تھا اور نہ اُس کے بے پناہ حسن کو برداشت کر سکتا تھا۔ میں نے کہا "توبہ۔ کہا تم سیگرٹ پیو گی؟ غالباً ارسطو نے تمہیں یہ بھی سکھایا ہوگا کہ....."

لامیہ بولی "نہیں؛ تو کیا تم اسے ایک نئی لذت کے طور پر پیش کرتے ہو؟" وہ ایک سیگرٹ لینے پر رضامند ہوگئی۔ اور میں نے اُسے ان سفید اور سنہری رنگ کی نلکیوں سے خوشی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ سکھا دیا۔ اور وہاں ایک طویل خاموشی طاری ہوگئی۔ اُس نے ہاتھ میں میری سیگرٹ کی ڈبیا پکڑ رکھی تھی۔ اور وہ ایک ایسے جذبے کے ملغف میں مستغرق نظر آتی تھی۔ جس میں وہ کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی! اُس کے لئے ایک اور سیگرٹ جلایا گیا۔ جسے خوب ٹھہر ٹھہر کر پیا گیا۔ آخر کار لامیہ نے ایک نئی لذت پالی تھی!!

(از فرانسہ)

سراج الدین احمد نظامی

ہندوستان کی خصوصیات

ہندوستان کی دیہاتی آبادی کی مردم شماری ۲۰۴۶۷۴۲۸۶ ہے +

ہندوستان کی دیہاتی آبادی ۶۷۵۶۸۵ مواضعات پر مشتمل ہے۔ ہر موضع میں اوسطاً ۴۱۸ نفوس آباد ہیں +

کل ہندوستان کی نوّے فی صدی آبادی دیہاتی ہے +

کل آبادی کا ۷۲ فی صدی زراعت پیشہ ہیں +

۸۰ لاکھ زراعت پیشہ مالک زمین ہیں +

ہندوستان میں مشکر کی کاشت تمام دنیا کے نصف کے برابر اور پیداوار ½ کے برابر ہے +

ہندوستان کی فی ایکڑ پیداوار کا اوسط نواذن دیگر ممالک سے یہ ہے:- اٹلی کا ½۔ فرانس کا ⅔۔ مصر کا ½۔ جاپان کا ½ +

پنجاب کے زمیندار۔ ساہوکاروں کے اتنے مقروض ہیں کہ ہر سال کئی کروڑ روپیہ صرف سود ادا کرتے ہیں +

ہندوستانیوں کی آمدنی فی کس سالانہ ۳۰ روپیہ ہے جب کہ

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں فی کس ۱۱۱۶ برطانیہ عظمیٰ ۶۹۶ روپیہ۔ جرمنی ۴۶۸ روپیہ۔ فرانس ۵۴۶ روپیہ۔ اٹلی ۳۳۲ روپیہ ہے +

شبیر مارہروی

دسمبر ۱۹۲۷ء

"غمگین شہزادی"

(از مصنفہ حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی دہلوی)

ستمبر ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے۔ دہلی کے تیموریہ شہزادوں میں نہایت جوش پھیلا ہوا تھا۔ سیواجی کے جلوس اور اخباروں کے سیواجی نمبروں میں روشن آرا بیگم بنت شاہجہان بادشاہ کی نسبت یہ لکھا جارہا تھا اور کہا جارہا تھا کہ روشن آرا بہت اورنگ زیب بادشاہ سیواجی کے ساتھ بھاگ گئی تھی +

اگرچہ سالہا سال سے مرہٹہ کتابوں اور اخباروں اور ڈراموں میں یہ بہتان شایع ہو رہا تھا لیکن تیموریہ شہزادوں کو اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ اب تازہ اخبارات کے چرچوں کی اطلاع ان کو بھی ہوئی تو وہ سب مرد و عورت اپنے جد شاہجہان کی پاکباز بیٹی کی توہین سے بے قرار ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے ایک اپیل اپنی جماعت کی طرف سے گورنمنٹ اور اہل ملک کے نام اس بہتان کے خلاف تیار کی تھی +

اسی سلسلہ میں میرا گذر ایک شہزادی صاحبہ کے مکان میں ہوا۔ جو نابینا ہیں۔ اسّی برس کی عمر ہے۔ اور شاہ عالم بادشاہ کی پڑپوتی ہیں۔ انہوں نے اپنا نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے میں غمگین شہزادی کے نام سے ان کا قصہ لکھتا ہوں +

دہلی میں تیموریہ خاندان کے شہزادوں کی تعداد سوا سو کے قریب ہے۔ جن میں سے ایک حصہ کو گورنمنٹ سے پنشن ملتی ہے۔ ان نابینا شہزادی صاحبہ کی بھی دس روپے ماہوار پنشن ہے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ گھر میں اکیلی رہتی ہیں ایک بڑھیا عورت ان کی خدمت کے لئے ملازم ہے +

حسن نظامی

شہزادی کا موجودہ گھر

اس گھر کی کچی دیواریں ہیں۔ جن کا ایک حصہ اسی برسات میں گر گیا ہے۔ اور خراب ہو گیا ہے۔ دروازہ پر ٹاٹ کا ایک پھٹا ہوا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے آواز دی تو نوکر بڑھیا باہر آئی۔ اور شہزادی صاحبہ نے مجھے اندر بلا لیا۔ اس مکان کا صحن بہت چھوٹا ہے۔ دو چارپائیاں مشکل سے آتی ہونگی۔ دالان بھی اتنا مختصر ہے کہ دو چارپائیوں کی بھی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ دالان کے شمال میں ایک چھوٹی سی کوٹھری بھی ہے +

جب میں اندر گیا۔ شہزادی صاحبہ بوریہ پر بیٹھی تھیں۔ دالان میں ایک طرف چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اور اس کے سامنے ایک بوریہ بچھا ہوا تھا جس پر بیٹھی ہوئی شہزادی صاحبہ پان کٹی میں اپنا پان کوٹ رہی تھیں۔ بوریہ بہت پرانا تھا۔ اور جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ پیوند لگی ہوئی ایک سفید چادر بھی چارپائی پر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ چھوٹا تھا اور زرائیلا تھا۔ شہزادی صاحب کے سامنے مٹی کی ایک ہانڈی رکھی تھی جس میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ شہزادی صاحبہ اس سے انگالدان کا کام لیتی ہیں۔ ان کی دائیں طرف پٹاری رکھی تھی جو اگرچہ قلعی تھی لیکن اس پر پان کے دھبے نہیں تھے۔ دالان کی کڑیاں بہت بوسیدہ تھیں۔ گلہریوں اور چوہوں نے تختوں کو خراب کر رکھا تھا +

شہزادی صاحب کا حلیہ

شہزادی صاحبہ کا سر بالکل سفید ہے پلکیں اور بھویں بھی سفید ہو گئی ہیں۔ جوانی میں ان کا قد لمبا ہوگا۔ اس واسطے اب بہت جھک گئی ہیں۔ انگیا اس صاف تھا۔ لیکن ہر کپڑے میں کئی کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ ان کی آواز بہت

صاف اور مضبوط ہے۔ اور اُن کی بول چال نہایت میٹھی اور ستھرا اور خالص اُردو میں ہوتی ہے۔ وہ نہایت شگفتہ اور وقار کے ساتھ بات کرتی ہیں۔ اُنکے چہرہ پر چھریاں بہت زیادہ ہیں۔ اور جسم بھی بہت کمزور ہے +

بات چیت جب میں اُن کے سامنے گیا تو "آداب عرض ہے" کہا۔ بولیں "جیتے رہو۔ میاں جب سے آنکھیں خراب ہوئی ہیں درگاہ شریف میں حاضر نہیں ہو سکی۔ تم کو کبھی دیکھا نہیں لیکن مدت سے نام سنتی ہوں۔ اب بڑی بی نے نام لیا۔ کہ خواجہ صاحب آئے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں تو میں بہت خوش ہوئی کہ جن کا نام سنتی تھی۔ وہ خود میرے گھر میں آگئے۔ میرے بزرگوں کو تمہارے بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ اور میں بھی ہمیشہ ستر ہوں کے عرس میں جایا کرتی تھی۔ اب آنکھیں جاتی رہیں۔ ہاتھ پاؤں سے معذور ہوگئی بنا بریں۔ کیونکر آنا ہوا" میں نے کہا "آنے کی غرض ابھی عرض کرونگا مگر پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو اس مکان میں کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی۔ یہ تو بہت ہی چھوٹا مکان ہے۔ اور چھت میں جگہ جگہ سوراخ ہیں۔ مٹی جھڑتی ہوگی" بولیں "ارے میاں! تم نے بھلا فکر کیا۔ جب تقدیر نے نکالے اور محل چھوڑنے تو اب جو کچھ بھی میسر آجائے غنیمت ہے۔ ڈیڑھ روپیہ مہینہ کرایہ کا مکان اس سے اچھا اور کیا ہوگا۔ چھت سے مٹی جھڑتی ہے۔ اور کوئی رات ایسی نہیں آتی کہ دو چادر و قوہ پلنگ کی چادر صاف نہ کرنی پڑے۔ ایک وقت تھا کہ لال قلعہ کے اندر اپنے محل میں سوتی تھی۔ چھت میں کسی چڑیا نے گھونسلا بنا لیا تھا۔ اُس کے کچھ تنکے میرے بچھونے پر گر پڑے تو رات بھر نیند نہ آئی۔ بالا یہ وقت ہے کہ رات بھر مٹی جھڑتی ہے۔ اور اس تکلیف کو سہنا پڑتا ہے"

میں نے پوچھا "سرکار سے کچھ پنشن ملتی ہے؟" بولیں "جی ہاں۔ دس روپے مہینہ بہت سے مل رہا ہے" میں نے کہا "کچھ اور آمدنی بھی ہے" بولیں "جی ہاں۔ ایک مکان ہے جس کا کرایہ ساٹھ روپے مہینہ آتا ہے۔ پہلے یہ اُسی میں رہتی تھی۔ مگر جب سے آنکھیں گئیں۔ تو دس میں گذارہ نہ ہو سکا۔ اس واسطے مکان کرایہ پر دیدیا۔ اور میں خود کم کرایہ کے مکان میں آگئی۔ اب ہم دو آدمی ہیں۔ ایک یہ بڑی بی ہیں۔ ایک میں ہوں۔ مکان کا کرایہ اور کھانے کپڑے میں ہم دونوں کا گذارہ ستر روپے میں ہو جاتا ہے۔ پان چھالیا کا بھی خرچ ہے۔ نذر نیاز کا بھی خرچ ہے"

میں نے کہا "میرے آنے کی وجہ تو یہ ہے" اور اس کے بعد میں نے سیدانی اور اُن کی قوم کا سارا قصہ سنایا۔ "مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے حالات مجھے بتائیں۔ تاکہ میں اُن کو کتاب میں لکھوں۔ کیونکہ میں نے آپ کے خاندان کے بہت سے مردوں اور عورتوں کے حالات شائع کئے ہیں"

یہ بات سنتے ہی شہزادی صاحب نے پان کا کوٹا چھوڑ کر میری طرف رخ کیا۔ اور کہا "تو نا میاں! مجھکو یہ منظور نہیں۔ کہ میرا نام گھر گھر لگی ہو۔ کوچہ بکوچہ اُچھلتا پھرے"

میں نے کہا "میں آپ کا نام شائع نہیں کرونگا۔ صرف حالات شائع کرونگا" جواب دیا "وہ حالات ہی کیا ہیں۔ فقط دو باتیں ہیں۔ ہم بادشاہ تھے۔ اور ہم فقیر ہو گئے۔ اس سے زیادہ پوچھو تو یہ جواب ہے۔ کہ اب ہم مر بھی جائیں گے" مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ سیدانی کون تھا۔ اور ہندوؤں نے ایسی جھوٹی بات کیونکر لکھی۔ کیا وہ سب کے سب ایسے جاہل ہیں۔ کہ ان کو میٹی اور بہن کی بھی تمیز نہیں ہے۔ اور کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ روشن آرا بیگم حضرت شاہجہان کی بیٹی تھیں۔ حضرت اورنگ زیب کی بیٹی نہیں تھیں۔ بلکہ اُن کی بہن تھیں +

پہلے تو چھوٹوں کو موت آئی تھی۔ اب اُن کو بخار بھی نہیں آتا۔ اے سبحان اللہ کیا بات بنائی ہے کہ روشن آرا بیگم سیواجی کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔ یہ بات اُس وقت کہتے جب ہم اس ملک کے بادشاہ تھے تو زمانہ آتا۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ اب کہا جب ہم ختم ہو چکے۔ گھر کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ دیکھ لینا ایک نیک اور بے گناہ شہزادی پر جھوٹی تہمت لگانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ان پر خدا کی مار پڑیگی اور آسمانی قہر ٹوٹیگا"

شہزادی صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ وہ یہ باتیں کہکر چپکی ہو گئیں۔ اور بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ اُس کے بعد اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور اُنھوں نے رونے کی آواز میں کہا "یا اللہ ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی تھی۔ کہ تو نے تاج و تخت بھی چھنوایا۔ اور اب ایسی باتیں سننی پڑی ہیں +

اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "کیا سب ہندو مسلمانوں کی غیرت مردہ ہو گئی ہے۔ جو وہ اپنے پہلے بادشاہوں کی عورتوں کو ایسی باتیں سنواتے ہیں۔ اور کوئی اس کی روک تھام نہیں کرتا" میں نے کہا "اب سب نیک خیال ہندو مسلمانوں کو اس کی خبر ہو گئی ہے اور وہ ضرور کوشش کرینگے اور ان بہتانوں کی اشاعت رک جائیگی۔ آپ کے خاندان کی طرف سے بھی ایک محضر نامہ سرکار کے پاس جانے والا ہے۔ اور میں اسی واسطے آیا تھا۔ کہ آپ بھی اس محضر نامہ پر انگوٹھے کا نشان کر دیں" بولیں "یہ کام مردوں کا

ہے۔ میرے انگوٹھے کے نشان سے کیا ہوگا۔ میں نشان وشان نہیں کرتی۔"

سرگذشت

میں نے کہا "تو اپنے حالات بتا دیجئے۔ میں نام اور پتہ شائع نہیں کرونگا۔" مگر شہزادی صاحب کو اسقدر غصہ آگیا تھا۔ کہ وہ بہت دیر چپکی بیٹھی رہیں۔ اور پٹاری اپنے قریب سرکا کر میرے لئے ایک پان کا ٹکڑا بنایا اور ٹھنڈا سانس لے کر بولیں۔ "میاں! غدر میں میری عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ ہم قلعہ کے اندر رہتے تھے۔ بادشاہ سلامت ہمارے خاندان سے کچھ ناراض تھے۔ لیکن ہماری تنخواہ مہینہ کے مہینہ مل جاتی تھی۔ میرے تین بھائی تھے۔ اور بہن فقط میں ایک تھی۔ والد نے آخر عمر میں ایک شادی کر لی تھی۔ حالانکہ میری اماں بھی زندہ تھیں اور اس بڑھاپے کی شادی کی وجہ سے میری اماں اور سوکن میں بھی لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ اور ہم تینوں بہن بھائی بھی سوتیلی ماں سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ مگر مجھ سے سوتیلی ماں کو بہت محبت تھی۔ اور میں اپنی سگی اماں اور سوتیلی اماں کی لاڈلی بیٹی کہلاتی تھی +

ہمارے گھر میں کئی عورتیں اور کئی مرد خدمتگاری پر نوکر تھے۔ غدر سے چھ مہینہ پہلے میری سوتیلی اماں کو ہیضہ ہوا وہ مر گئیں۔ اور میرے دو بھائی بھی اسی زمانہ میں ہیضہ سے مر گئے۔ اور جب غدر ہوا ہے تو ہم صرف دو بہن بھائی اور ایک ابا حضرت اور ایک اماں حضرت موجود تھے +

بادشاہ سلامت قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے۔ اور بھی سب قلعہ کے رہنے والے باہر نکل گئے اور قلعہ خالی ہوگیا۔ مگر ہمارا مکان قلعہ کی عمارتوں سے ذرا الگ تھا اور بہت مضبوط تھا۔ اس واسطے ابا حضرت راضی نہیں ہوئے۔ اور انہوں نے کہا باہر جائینگے تو وہاں بھی مرینگے اور باہر کا مرنا بے غیرتی کا مرنا ہوگا۔ اس واسطے یہیں گھر میں رہو۔ جو خدا کو منظور ہوگا اسی گھر میں ہو جائیگا +

بادشاہ سلامت کے جانے کے دو دن بعد تک ہمارے گھر میں کوئی نہیں آیا۔ باہر کے نوکر اور گھر کی مامائیں سب بھاگ گئے تھے۔ ہم نے گھر کے دروازے بند کر لئے تھے۔ ڈیوڑھی میں تین چار دروازے تھے۔ اور موٹی موٹی کنڈیاں بھاری بھاری کواڑ ان میں لگے ہوئے تھے۔ تیسرے دن مکان کے باہر گھوڑوں کی ٹاپوں اور بہت سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آئیں۔ اور کسی نے دروازے توڑنے شروع کئے۔ میرے بھائی کی عمر سولہ برس کی تھی۔ ابا حضرت اور اماں حضرت نے فوراً وضو کیا۔ اور بھائی سے کہا میاں اٹھو تم بھی وضو کرو۔ کہ مرنے کا وقت آگیا۔ یہ بات سن کر میرا دل دہل گیا۔ اور میں اماں حضرت کو جا کر لپٹ گئی۔ وہ رونے لگیں اور مجھ کو پیار کیا۔ اور کہا گھبراؤ نہیں اللہ مددگار ہے۔ شاید وہ کوئی صورت جان بچنے کی نکال دے۔ اس کے بعد ان سب نے وضو کیا۔ اور میں نے بھی وضو کیا۔ اور ہم سب نے مصلے بچھا کر اور سجدہ میں سر جھکا کر اللہ میاں سے دعائیں مانگنی شروع کیں +

دروازے توڑنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ ہم سب سجدہ ہی میں تھے کہ دس بارہ گورے اور دس بارہ سکھ بندوقیں لئے ہوئے جن پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں گھر کے اندر آگئے۔ ابا حضرت اور بھائی سجدہ سے فوراً کھڑے ہوگئے اماں حضرت نے مجھکو گود میں لے کر چادر سے منہ چھپا لیا۔ ایک سکھ نے ابا حضرت سے پوچھا۔ تم کون ہو اور یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ ابا حضرت نے جواب دیا۔ یہ میرا گھر ہے اور میں اسی میں رہتا ہوں۔ شاہ عالم بادشاہ کی اولاد میں ہوں۔ اس سکھ نے انگریز افسر کو یہ بات سمجھائی۔ انگریز افسر نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کچھ کہا جس کو میں نہیں سمجھی۔ تو پھر اس سکھ نے ابا حضرت کو سمجھایا کہ صاحب کہتے ہیں بادشاہ بھاگ گئے اور سب لوگ بھاگ گئے۔ تم کیوں نہیں بھاگے۔ ابا حضرت نے کہا۔ بادشاہ ہم سے کچھ ناراض تھے۔ اس واسطے نہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے لئے۔ نہ ہم ان کے ساتھ گئے۔ اور ہم نے سپاہیوں کے بلوہ میں بھی کچھ حصہ نہیں لیا۔ اور ہمیں یقین تھا۔ کہ انگریز سرکار بے گناہ آدمیوں کو نہیں ستاتی۔ ہم بے گناہ تھے اس واسطے ہم نہیں بھاگے۔ انگریز افسر نے کہا تم کو پہاڑی پر چلنا ہوگا۔ ہم تحقیقات کرینگے۔ اگر تم بے گناہ معلوم ہوئے۔ تو تم کو جان کی امان ملیگی۔ ابا حضرت نے کہا۔ میرے ساتھ میری بیوی ہے اور ایک چھوٹی بچی ہے اور یہاں کوئی سواری نہیں ہے۔ اور ان عورتوں کو پیدل چلنے کی عادت نہیں ہے۔ انگریز افسر نے جواب دیا۔ اس لڑائی کے وقت ہم تمہارے لئے سواری کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اگر تم یہاں ٹھہرے رہوگے۔ تو ڈر ہے کہ دوسرے سپاہی یہاں آئینگے۔ اور بے خبری میں تم کو مار ڈالیں گے۔ اس واسطے تم کو جلدی یہاں سے روانہ ہو جانا ضروری ہے۔ ہم دو سپاہی تمہارے ساتھ کریں گے۔ اگر راستہ میں کوئی سواری مل جائیگی تو تمہاری عورت اور تمہاری لڑکی اس میں بیٹھ جائینگے۔ نہیں تو ان سب کو پیدل چلنا ہوگا +

مجبوراً ابا حضرت تیار ہوئے۔ اور انہوں نے کچھ قیمتی زیور اور جواہرات اپنے ساتھ لے کر باقی سارا سامان گھر میں چھوڑ دیا۔ اور فوج والوں کے ساتھ گھر کے باہر نکلے۔ اماں حضرت ہمیشہ بیمار رہتی تھیں۔ اور بہت کمزور تھیں۔

مجھ کو بھائی نے گود میں اُٹھا لیا۔ اور ابا حضرت نے اماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ہم نے اپنے بھرے پڑے گھر کو حسرت کے ساتھ ایک نظر اُٹھا کر دیکھا کہ پھر ہم کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا کہ ہم پھر کبھی وہاں نہیں گئے +

جب ہم گھر سے باہر نکلے تو وہ انگریز اور سکھ گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اور دو سکھ سواروں کو ہمارے ساتھ پہاڑی کی طرف بھیج دیا۔ اور وہ خود کسی اور طرف گھوڑے دوڑا کر چلے گئے +

قلعہ کے دروازہ تک تو وہ سکھ سوار آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ اور اُنہوں نے ابا حضرت اور اماں حضرت سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اماں حضرت سے چلا نہ جاتا تھا۔ اور وہ ہر دس قدم کے بعد بیٹھ جاتی تھیں۔ اور رعشہ سے اُنکا بدن کانپ رہا تھا جب اماں حضرت بیٹھ جاتیں تو وہ سکھ سوار بھی ٹھیر جاتے لیکن جب ہم قلعہ کے دروازہ کے باہر پہنچ گئے۔ تو اُن سواروں نے سخت کلامی شروع کی۔ اور کہا۔ اس طرح تو شام ہو جائیگی۔ تم جلدی جلدی کیوں نہیں چلتے۔ والد نے نرمی سے جواب دیا کہ بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ ایک بیمار اور کمزور عورت ہے۔ جو ساری عمر کبھی پیدل نہیں چلی۔ ہم شرارت اور سرکشی سے ایسا نہیں کرتے۔ عورت اور بچہ کی وجہ سے مجبور ہیں۔ سوار یہ سُنکر خاموش ہو گئے۔ مگر میرے بھائی کے منہ سے بے اختیار یہ بات نکلی کہ تم ہمارے ملک کے ہو تم کو رحم نہیں آتا۔ اس پر ایک سکھ سوار نے کہا۔ ہم کیا کریں۔ حاکم کا حکم ہے۔ بھائی نے کہا۔ حاکم نے یہ نہیں کہا کہ ہم پر ایسی سختی کرنا۔ سکھ سوار نے جواب دیا ہم نے سختی کونسی کی۔ لیکن اب سختی کرنی پڑیگی۔ تم لوگ جان کر چلنے میں دیر لگاتے ہو۔ یہ کہہ کر ایک سوار ہمارے پیچھے آگیا اور ایک آگے ہو گیا۔ اماں حضرت گھوڑے کو اپنے پیچھے دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اُن کو اختلاج کا مرض تھا۔ اور یکایک اختلاج کا دورہ شروع ہو گیا اور وہ نڈھال ہو کر گر پڑیں اور اُن کے مُنہ سے بے اختیار ہائے ہائے نکلنی شروع ہوئی۔ سکھ سوار یہ حالت چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ اور کچھ دیر کے بعد اُس نے ابا حضرت سے کہا میں پیدل چلتا ہوں۔ تم اس بیمار عورت کو لے کر گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ آخر ابا حضرت نے اماں حضرت کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلے۔ اور وہ بیچارہ سکھ سوار پیدل پہاڑی تک گیا۔ اور میں بھائی کی گود میں پہاڑی پر پہنچی +

پہاڑی پر انگریزوں کی فوج چاروں طرف ٹھیری ہوئی تھی ہم کو بھی ایک طرف خیمہ میں ٹھہرا دیا گیا۔ اور اُن سکھ سواروں نے فوجی لانگری سے روٹی لا کر دی اور وہ رات ہم نے اُسی خیمہ میں گذاری +

دوسرے دن صبح فوج کے جرنیل نے ہم سب کو اپنے سامنے بُلایا۔ دلّی کا کوئی مخبر اُس انگریز کے پاس کھڑا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ تم ان کو جانتے ہو۔ اُس مخبر نے کہا۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ یہ بادشاہ کے خاندان میں ہیں۔ اور جب لال قلعہ کے اندر انگریز مردوں اور عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔ تو اس شخص نے اُن کے قتل کرانے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ سُنکر جرنیل نے ابا حضرت کی طرف بہت غصہ کی نظر سے دیکھا۔ ابا حضرت نے جواب دیا کہ یہ شخص جھوٹ کہتا ہے پہلے میرے ہاں یہ نوکر تھا اور چوری کے الزام میں میں نے اس کو ایک دفعہ بہت پٹوایا تھا۔ اور نوکری سے موقوف کر دیا تھا۔ اس واسطے دشمنی سے یہ ایسا کہتا ہے۔ آپ اس سے اتنا پوچھئے کہ بہادر شاہ بادشاہ کتنے سال سے مجھ سے ناراض تھے۔ اور میرا سلام کتنے عرصہ سے بند تھا۔ مخبر نے جواب دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ان کے ہاں نوکر تھا۔ مگر یہ غلط ہے کہ مجھے چوری کے الزام میں انہوں نے پٹوایا تھا۔ میں نے خود ہی ان کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ یہ تنخواہ کم دیتے تھے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ بادشاہ ان سے ناراض تھے۔ لیکن جب غدر ہوا تو انہوں نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے اُن کے پاس جانا آنا شروع کیا۔ اور جس دن انگریز قتل کئے گئے ہیں۔ تو یہ اور ان کا لڑکا دونوں بہت کوشش کر رہے تھے۔ اور ان لوگوں سے حجت بازی کرتے تھے جو انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل کے خلاف رائے دے رہے تھے۔ کہ یہ بات اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس وقت ان دونوں نے یہ کہا۔ کہ سانپ کو مارنا اور اُس کے بچہ کو چھوڑ دینا عقلمندوں کا کام نہیں ہے۔ اور محض انہیں دونوں کے کہنے سے اُن بچوں اور عورتوں کو قتل کیا گیا۔ یہ سُنکر جرنیل غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ اور اُس نے پھر ابا حضرت کی کچھ بات نہ سنی۔ حالانکہ وہ برابر کہتے رہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ مگر جرنیل کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ اُس نے کوئی بات نہ سُنی۔ اور حکم دیا کہ ابھی ان دونوں کو گولی سے اُڑا دو اور پھر یہ کہا کہ اگرچہ ان دونوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کو قتل کرایا۔ مگر ہم ان پر رحم کرتے ہیں اور اس کی عورت اور بچہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ان دونوں کو چھاؤنی سے نکال دو۔ یہ جہاں چاہیں چلی جائیں +

قتل کا وقت

سپاہی گورے اور دیسی آگے بڑھے۔ اور اُنہوں نے بھائی اور ابا حضرت کے ہاتھ پکڑ کر کمر کے پیچھے باندھے ابا حضرت مجھ کو دیکھ کر رونے لگے۔ مگر بھائی چپکے کھڑے رہے۔ اماں حضرت

نے ایک چیخ ماری اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑیں۔ میں دوڑی کہ ابا حضرت کو چمٹ جاؤں۔ مگر ایک سپاہی نے مجھ کو زور سے دھکا دیا اور میں اماں حضرت کے اوپر گر پڑی۔ اور میں نے دیکھا کہ ابا حضرت اور بھائی کو سپاہی کھینچتے ہوئے دور لے گئے اور اُن کے سامنے پانچ چھ سپاہی بندوقیں لیکر کھڑے ہوئے اور اُن کے پاس جرنیل بھی کھڑا ہو گیا اور اُس نے کچھ زور زور سے باتیں کیں جن کو میں سمجھ نہیں سکی۔ اس کے بعد سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ اور سپاہیوں نے بندوقیں اپنی چھاتیوں پر رکھیں اور بندوقوں کا منہ ابا حضرت اور بھائی کی طرف کیا۔ اُس وقت ابا حضرت کی آواز آئی اور اُنہوں نے میرا نام لے کر پکارا اور کہا "لو بیٹی اللہ بیلی ہم دُنیا سے جاتے ہیں" اور بھائی کی آواز آئی "اماں! اماں!! مجھ سے تمہاری تنہائی دیکھی نہیں جاتی۔ سلام میں مرتا ہوں"۔

بندوقوں کی آواز آئی اور بہت سا دھواں نکلا۔ میں نے دیکھا بھائی اور ابا حضرت خاک میں لوٹ رہے ہیں۔ میں رو رہی تھی۔ اور میرا دل ڈر کے بیٹھا جاتا تھا۔ اماں کو ذرا ہوش آیا۔ اور میں نے اُن سے کہا۔ بھائی کو اور ابا کو مار ڈالا۔ دیکھو وہ خاک میں تڑپ رہے ہیں۔ اے ہے اماں جان اُن کے سینہ سے خون اُبل رہا ہے۔ اب میرے بھائی اور ابا مجھ سے بچھڑ گئے۔ اب وہ مجھ سے کبھی نہیں ملیں گے۔ ابا نے تو مجھے پکارا بھی تھا۔ اور بھائی نے تم کو پکارا تھا۔ اچھی اماں اب کیا ہوگا۔ کیا یہ ہم کو بھی مار ڈالیں گے۔ کیا یہ ہم کو قیدی بنا لینگے۔ اماں دونوں ہاتھوں کو ٹیک کر سہارے سے اُٹھیں۔ اور اُنہوں نے بھائی کی اور ابا حضرت کی لاشوں کو غور سے دیکھا۔ اُن کا تڑپنا بند ہو گیا تھا۔ اور بیتاب ہو کر کہا۔ میرا بیٹا! میرا لال!! میری سولہ برس کی محنت!!! میری زندگی کا آخری سہارا!!!! میرا دولھا مجھ سے چھن گیا۔ میں مٹ گئی۔ میرا اس دنیا میں کچھ نہیں رہا۔ میں دنیا میں آئی تھی۔ میں دنیا میں نہیں آئی تھی۔ یا اللہ یہ خواب ہے یا سچ مچ مجھ پر یہ مصیبت آئی ہے۔ میرا سرتاج بھی خاک میں مل گیا۔ وہ بھی جوان بیٹے کے پاس خون میں نہایا ہوا پڑا ہے۔ اے مخبر خدا تجھ کو غارت کرے۔ تو نے بالکل جھوٹ بولا۔ یہ دونوں تو غدر کی شروعات سے آخر تک گھر سے بھی نہیں نکلے۔ ارے تو نے کس دن کا بدلا لیا۔ مجھ بیمار دُکھیا پر بھی تجھکو رحم نہ آیا۔ تو نے اس معصوم بچی کا بھی خیال نہ کیا۔ اور ہمارے وارثوں کو بے خطا اور بے قصور خون میں ڈبو دیا۔

اماں یہ کہہ رہی تھیں کہ دیسی فوج کے سپاہی آئے۔ اور مجھ کو اور اماں کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور کھینچتے ہوئے لے چلے۔ ہم دونوں لاشوں کے پاس سے گذرے گولیاں سینوں پر اور چہروں پر لگی تھیں۔ خون نے سب کچھ چھپا دیا تھا۔ اور لاشیں چپ چاپ پڑی تھیں۔ سپاہی ہم کو کشاں کشاں لئے جا رہے تھے۔ نہ اماں چل سکتی تھیں۔ نہ میں چل سکتی تھی۔ مگر وہ رسیوں کی طرح ہمکو کھینچے لئے جا رہے تھے۔ پہاڑی کے پتھروں سے ہمارے پاؤں لہولہان ہو گئے تھے اور میں نہیں کہہ سکتی کہ دنیا میں جیسی تکلیف اُس وقت ہمیں تھی۔ ایسی تکلیف اور بھی کسی کو پیش آسکتی ہے۔

فوجی چھاؤنی سے باہر لاکر سپاہیوں نے ہم کو چھوڑ دیا۔ اماں بالکل بیہوش پڑی تھیں۔ اور میں اُن کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک گھسیارہ گھاس کی گٹھڑی لئے ہوئے وہاں سے گذرا اور میرے پاس آیا۔ اور اُس نے گٹھڑی سر سے اُتار کر اماں کو دیکھا اور کہا یہ عورت تو مر گئی۔ وہ ہندو تھا۔ مجھکو وہاں چھوڑ کر چھاؤنی میں گیا اور وہاں سے دو تین مسلمان گھسیاروں کو لایا۔ اور ان سب نے کہا کہ یہ عورت مر گئی۔ اُنہوں نے میرے اور اماں کے ہاتھوں سے اور گلے سے زیور اُتار لیا اور کہا کہ جب انکے مرد مارے گئے تو اُن کے پاس سے بہت سے جواہرات نکلے۔ اور وہ سب سرکاری خزانے میں گئے۔ مگر یہ ہمارا حق ہے۔ اسکے بعد اُنہوں نے گڑھا کھود کر اماں کو دبا دیا۔ اور دو آدمی مجھ کو اُٹھا کر اجمیری دروازہ کی طرف لائے۔ اور یہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اکیلی بیٹھی رو رہی تھی۔ کہ خانم کے بازار کے مسلمان سُنار اپنی عورتوں کو لئے ہوئے وہاں آئے۔ جو قطب صاحب جا رہے تھے۔ اور وہ مجھکو بھی اپنے ساتھ قطب صاحب لے لئے۔

اور جب شہر میں امن چین ہو گیا۔ اور وہ مسلمان سُنار دہلی میں واپس آئے تو مجھکو میرے رشتہ کے چند شہزادوں کے حوالہ کر دیا۔ اور میں انہیں کے پاس رہکر بڑی ہوئی۔ اور انہیں میں میری شادی ہوئی اور شادی کے بعد ہی میری پنشن ہو گئی۔ خدا نے مجھے کئی بچے دیئے مگر کوئی زندہ نہ رہا۔ یہانتک کہ شوہر کا بھی انتقال ہو گیا اور اب چار سال سے آنکھیں بھی جاتی رہیں۔

سُن لیا میاں۔ مجھ دُکھیا غمزدہ کی یہ کہانی ہے۔ میرے رونگ رونگ سے ہائے کی آوازیں آتی ہیں۔ میں نے اس دنیا میں بس دس برس کی عمر تک عیش دیکھا اور ستر برس مصیبتیں اُٹھائیں۔ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ آج مری کل دوسرا دن۔ یہ بڑی بی بیچاری مل گئی ہیں۔ بازار سے ضرورت کی چیزیں خرید لاتی ہیں اور رات دن پاس بیٹھی رہتی ہیں۔ اور ہم دونوں آخری عمر کے یہ غمگین دن مل جل کر بول چال کر جس طرح ہوتا ہے گذار رہے ہیں"۔

حسن نظامی

گری زر کا ایک چینی سے انتقام

(ایک افسانہ)

(از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے)

دوشیزۂ بہار کا آغازِ شباب تھا۔ مگر لندن کے ساحلی علاقہ میں اس راگ رنگ اور حدّتِ خون کے موسم کی خبر فقط کیلنڈر ہی دے سکتا تھا۔ لندن کے اُس پار مرغزاروں اور چمنستانوں کے جھرمٹوں میں مور و مگس مصروفِ نشاط تھے۔ مگر یہاں وہی قمار بازی اور آنے جانے والی کشتیوں کا انتظار رہتا ہے۔

لائم ہاؤس میں سدا ایک ہی موسم ہے۔ روز و شب کی تقسیم بھی نہیں ہوتی کشتیوں کو ہر وقت لہروں کے من کی موج پر آنا جانا پڑتا ہے۔ اور عقاب نظر جہازی ہر وقت اِدھر اُدھر منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہاں سال کے پُرشکوہ جلوس کی آمد آمد پر کوئی مظاہرہ نہیں ہوتا۔ مستانی بہار کانٹوں سے اُلجھ اُلجھ کر عریاں ہو رہی ہو یا سرمازدہ گرمانزہٹ کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہو۔ لائم ہاؤس میں بس یہی ہوتا ہے کہ اب جہازیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے اور اب کم ہو گئی ہے۔ گرما ایک لس لساہٹ کا دَور ہے اور سرما گہر کا موسم! خواہ ایسے لوگ بھی ہوں۔ جو کیلنڈر میں بہار کی نوید دیکھ کر یہاں سے نکل جانا چاہتے ہوں۔ چاہتے ہوں کہ لہلہاتا ہوا سبزہ اُن کا منہ چوم لے کہ اُن کی تھکی ماندہ روح سبز سائے کے اُلجھاؤ میں کھو جائے! ـــــ ایسے لوگ ضرور ہونگے۔ مگر بہت کم نظر آتے ہیں۔ بہتوں کے لئے لائم ہاؤس ہی کافی ہے۔

یہ بے معنی سے سبز کھیت اور پرندوں کے گیت اور کونپلوں سے لدے ہوئے درخت اچھی چیزیں ہیں۔ مگر تنگ نظر لوگوں کے لئے۔ کیا ہی فانی ہیں وہ چیزیں جنہیں انسان کا ہاتھ محبت بھری محنت سے بناتا ہے اور کسقدر اپنا بہت ہے ان گلیوں میں جہاں موت زندگی کا بھیس بدل کر پھر رہی ہوتی ہے۔

یہ پھولوں اور بیداری کا موسم چینی محلّے کے ایک نہایت دہشت خیز ڈرامے کا ماحول تھا۔

یہ تمام قصّہ گری زر ریلوے جمعدار اور اُس کی عورت کا ہے۔ کس طرح فنگسٹن چینی نے اسے اُڑا لیا اور گری زر نے انتقام لیا۔

یہ گری زر ایک یونہی سا آدمی تھا جو اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے نہایت کمزور تھا۔ جو قوی آدمی ہوتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے تو فقط اپنے آپ سے اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ اور گری زر اگر نہیں ڈرتا تھا تو اپنے آپ سے اور سب سے ڈرتا تھا۔ اس کے دل میں خدا کا خوف، شیطان کا خوف۔ دوسروں کی رائے اور قوی بازوؤں کا، زندگی اور موت کا۔ غرض ہر کسی کا خوف متمکن تھا۔ مگر وہ اپنے آپ سے نہیں ڈرتا تھا۔ کیونکہ وہ بدنصیب خوب جانتا تھا کہ وہ کیا ہے؟

وہ کوئی بُرا آدمی نہ تھا۔ اُس میں نہ بُرائی کی ہمت تھی اور نہ نیکی کی ملائمت غرض وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ تمباکو نہیں پیتا تھا۔ گالی نہیں دیتا تھا۔ شراب نہیں پیتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی کسی بالائی منزل میں کوئی کمرا کرایہ پر لیتا۔ اور تھوڑی سی افیون کھا کر بستر پر پڑ رہتا تھا۔ اور یوں ان مسرتوں میں سے جو زندگی بھر کسی کو عطا کرتی ہے۔ کچھ نہ کچھ یہ بھی چھین جھپٹ کر لیتا۔

یہ کیف زدہ احساسات روزمرّہ کی کھینچا تانی کے لئے بہت خوب ہیں۔ زندگی کے خلا پُر کرنے کے لئے چھاتی پر چڑھ کر بیٹھ جانے والی زحمتوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ یہ نشہ حریر و پرنیاں کا لباس بن کر ہر روز کے ہچکولوں سے بچا لیتا ہے۔ مگر جب زندگی کا وہ فیصلہ کن لمحہ آ پہنچتا ہے، وہ غمِ جاودانی کا لمحہ۔ جب تم محسوس کرتے ہو کہ تم پہلے سے دس گنا گہرے اور دس گنا لمبے ہو تو اس لمحہ میں یہ وفادار کتا تم پر پلٹ پڑتا ہے۔ اللہ! پھر وہ کس طرح اپنے دانت گاڑتا ہے۔ اور کیسے کاٹتا ہے۔ زخمی کرتا ہے۔ پھر کاٹتا ہے تمہیں جڑوں سے اُکھاڑ دیتا ہے۔ تمہارے رگ و ریشے میں گھس جاتا ہے اور تمہاری ہڈیوں تک کو چوس ڈالتا ہے۔ کس طرح بخ بخ کرتا ہوا تمہیں زخموں سے چور چور کر دیتا ہے۔ پہلے دانتوں سے تمہاری جلد کو کھجاتا ہے۔ پھر رگوں میں دانت پیوست کر کے جھنجھوڑتا ہے۔ تن بدن میں آگ لگا دیتا ہے۔ تمہاری زندگی کے ہر لمحے کو خون کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ اور تمہاری نیند کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

گری زر پر بھی یہی گزری۔ اُسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ ایک کمزور انسان کی اندوہناک اور تیز و تند محبت! اس کی زندگی اور محبت ہی اس کی موت تھی۔ ایسے انسان اگر محبت کی اس بلندی پر پہنچ جائیں تو ان کی یہی حالت ہوتی ہے!

اسے وہ کیف افیون سے بھی نہ ہوتا تھا جو اس عورت کے محض قرب کے احساس سے ہوتا۔ دنیا بھر کی چیزوں میں سے اُسے فقط اسی سے محبت تھی۔ اُس کا سُست خون اسی کے پاس ہونے سے اُچھلنے لگتا +

یہ بھی اُس کی تمناؤں کے مطابق جتنی بار وہ چاہتا تھا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ جب کبھی جہاں کہیں چاہتی چل دیتی۔ کبھی وہ دن بھر غائب رہتی اور صبح منہ اندھیرے لوٹتی۔ کبھی وہ آدھی رات کو بستر سے اُٹھ کر چل دیتی اور دوسری رات کو پھر آجاتی۔ گری زر کے دیدۂ بے خواب یہ سب کچھ دیکھتے۔ مگر وہ اپنے دل سے بھی یہ سوال نہ کرتا کہ اس کا کیا سبب تھا؟ ——

اور ایک دن یکایک گری زر اُسے بالکل کھو بیٹھا۔ وہ اُسے چھوڑ کر لائم ہوس کے ایک زرد رنگ چینی کے پاس چلی گئی اور جاتے ہوئے ایک ستم ظریفانہ الوداعی رقعہ بھی چھوڑ گئی۔ یہ وحشیانہ حملہ گری زر کی نس نس میں نشتر چبھو گیا۔ اس کے اندر ہی اندر ایک گھاؤ سا ہو گیا اور گھڑی دو گھڑی کے لئے وہ بالکل شل ہو کر رہ گیا +

محض ایک کپڑوں میں لپٹی ہوئی مایہ سی چیز۔ اور جب اُس کے احساس پھر بیدار ہوئے تو ایک حرارت تھی ایک تپ زدہ حدت تھی! ۔ اب اُس میں ایک انقلاب آچکا تھا۔ اب وہ ایک نیا آدمی تھا۔ ایک یکجہت آدمی۔ جس پر ایک تاریک خیال بھوتوں کی پرچھائیں کی طرح سوار تھا +

اس چینی کو مار ڈالنا چاہئے۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ مگر خوب جانتا تھا اس میں اتنی ہمت اتنی طاقت نہیں۔ کیا اُسے روزی اپنی چہیتی سے نفرت ہو گئی تھی؟ نہیں۔ وہ اُسے پہلے سے زیادہ بے معنی شدت سے چاہتا تھا۔ اُسے ایذا دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس کی ساری تندی چینی پر صرف ہو رہی تھی +

چینی کو مار ڈالنا چاہئے۔

چینی کو مار ڈالنا چاہئے۔

اُس کے ذہن میں ہر بار گھوم رہا تھا۔ مار ڈالو چینی کو۔ اُسے ایک بھٹکتا ہوا احساس ہو رہا تھا۔ کہ اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ اور وہ چینی کو ختم کرنا ہے۔ اُس کے سُست نو آموختہ ذہن میں درجنوں حیلے سنپولیوں کی طرح بل کھاتے ہوئے اُلٹ پلٹ رہے تھے۔ مگر اُس کے لئے یہ سب ناقابلِ عمل تھے۔ وہ اس بربری جہالت کے باوجود ایک ایسا صحیح وجدان رکھتا تھا جو کئی بار فی الفور ایسے دانشمندانہ نتائج نکال لیتا ہے۔ جن تک پڑھے لکھے ذہن قدم قدم چل کر پہنچتے ہیں! ——

ایک کرسی پر بیٹھ کر جس کا انجر پنجر ڈھیلا ہو چکا تھا۔ ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر اور نظر فرش پر جمائے وہ اتوار کی تمام شام سوچتا اور تجاویز بناتا رہا۔ کبھی فیصلہ کرتا کبھی متزلزل ہو جاتا۔ لیکن اُسی رات اُس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اور پانچ دنوں میں انجام تک پہنچا دیا +

روزی اور گری زر کے ملاپ سے ایک بچی پیدا ہوئی تھی۔ اُس نے اس پر کبھی کوئی توجہ نہ کی تھی۔ کیونکہ وہ طبعاً سمٹا سمٹا سا رہتا تھا۔ اور بچوں اور حیوانوں سے کبھی گھل مل نہیں سکتا۔ تینوں فارسوسائیٹرس کی ایک دم گھٹ گلی میں ایک گندے سے کمرے میں رہتے تھے۔ جہاں نہ کوئی دری تھی اور نہ سامانِ آرائش۔ اسی میں کھاتے۔ سوتے اور منہ ہاتھ دھوتے تھے۔ اُس رات اس چیتھڑے اُڑے ہوئے بستر پر بے خواب پڑے ہوئے اُس کی آنکھوں کے سامنے یکایک صاف طور پر وہ آلہ آگیا۔ جسے گویا قدرت نے خود اُس کے ہاتھوں میں انتقام لینے کے لئے دیا تھا۔ وہ خود اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا تھا۔ انتقام کے خیال ہی سے اُس کے اعضا گھنٹوں کانپتے رہتے تھے۔ وہ چینی سے نبرد آزمائی کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اور پھانسی کے رسّہ کے تصور سے ہی اُس کا بدن پسینہ پسینہ ہوا جاتا تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے کی لہریں سر سے پاؤں تک دوڑنے لگتی تھیں۔ لیکن.....

اس نئے خیال کے آتے ہی وہ خوشی سے تھرتھرانے لگا۔ ایسی خوشی جو ایک کاریگر کو کسی مشکل کام کے سلیقے سے سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ چند منٹوں میں تمام تجویز طے ہو گئی۔ بس بالکل سہل طریقہ تھا جس سے اُسے کسی قسم کا بھی ضرر نہ پہنچے گا۔ ملزم کو چند سال اس گھر سے بہتر گھر میں گذارنے ہوں گے۔ اور پھر حکام کی نگرانی میں رہائی ہو جائیگی۔ بس اتنی سی بات تھی —— اور نتیجہ!!

جس مواد پر جس مسالے پر اُس نے محنت صرف کرنی تھی اُس سے وہ بخوبی آگاہ تھا۔ جلدی سے ڈھل جانے والا۔ ہر ڈھلوان کی طرف بہہ جانے والا مسالا۔ اشارے پر چلنے والا۔ اور اس پر کام یوں کرنا کہ سلسلہ کی کوئی کڑی خود اُس تک نہ پہنچے۔ بالکل سہل کام تھا۔ مسالا ہی ایسا تھا۔ ایک ہیجانی گرم کار

لڑکی اور ایک بے پشت افیونی کا ثمر! — لیٹے لیٹے وہ اپنے سفید چہرے کی چٹکیاں لینے لگا۔ اور بالوں کو نوچنے لگا۔ اور قہقہہ کرنے لگا!! کمرے کے اُس کونے میں کھڑکی سے دور ننھی کلوری کی چٹائی تھی۔ گری زر بستر سے رینگ کر باہر نکلا۔ اور وحشیانہ انداز سے بدن کو اکڑا کر گرد و غبار سے اٹے ہوئے فرش پر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا ہوا سوئی ہوئی بچی کے پاس جا پہنچا۔ اور اسے اس معصوم حُسن پر پیار نہ آیا! —

اگر اُس نے یہی تجویز کسی اور سے سُنی ہوتی تو وہ ایسا بیزار ہوتا کہ مہینوں خوفناک خواب دیکھتا رہتا۔ لیکن اب وہ دیوانہ تھا۔ دانشمند دیوانہ! خوفناک چینی کو دو ایک دن ہی میں اکڑا ہوا بے حس و حرکت دیکھنے کا خیال ایسا شیریں تھا۔ اور سب تلخ جذبات خاک سیاہ ہو گئے تھے! — اُف۔ سوچو تو شاید اس وقت بھی جب لائم ہاؤس کے گرجہ نے چیخ کر ایک بجایا ہے۔ چینی کے لیموں رنگ ہاتھ روزی کے بدن پر ہوں۔ شاید اب وہ اُسے عریاں کر رہا ہو۔ اُس کی سفید گردن اور باہوں کے حُسن کو گیلے گیلے۔ لمبے لمبے ہونٹوں سے داغدار کر رہا ہو۔ اب تک گری زر کی مانند وہ بھی اس چمکدار جسم سے پوری طرح آگاہ ہو گیا ہوگا۔ اس چمکدار شفاف ملایم جسم سے جو گیارہ برس تک گری زر کا رہا تھا۔ اور اب بھی اُسی کا ہے۔ اُسی کا ہے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اُف اس تصور ہی سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ اگر وہ تنومند ہوتا۔ اگر وہ اس کرمی چینی کے گلے کو دونوں ہاتھوں میں گھونٹ لہروں کی طرح چلنے والے سانس کو قطرہ قطرہ کر کے بند کر سکتا۔ اگر! — مگر — اُس نے چینی کو لڑتے ہوئے دیکھا ہوا تھا۔ اُس کی چالاکی سے خوب آگاہ تھا۔ لیکن اب اس نئی تجویز کے سامنے کوئی چالاکی کسی کام نہ آئے گی! —

تو اُس نے کلوری کی پتلی سی رضائی کو اُس کے اوپر سے کھینچ کر دور پھینک دیا اور ابھی وہ جاگی بھی نہ تھی کہ اُس پر چھ سات چابلیں برس گئیں۔ تین بار حیرانی سے اُو اُو ہوئی اور پھر ایک درد کی چیخ رات کو چیرتی ہوئی نکل گئی! — بار بار اُس کی چیخوں اور ہاتھ پاؤں مارنے پر چابکیں پڑ رہی تھیں۔ درد و کرب سے بل کھانے والے بدن کے اردگرد چابک سانپ کی طرح لپٹی جاتی تھی اور پے بہ پے ڈنکوں نے آخر اُس کی چیخوں کو بند کر دیا۔ اور فریاد سسکیاں بن کر رہ گئی۔ اندھیرے میں اُسے ایک گلوبستہ آواز سنائی دی: — جانتی ہو یہ کس لئے ہے! اُس میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالنے کی سکت نہ تھی۔

یہ اس لئے کہ تمہاری ماں ایک زردک چینی سے نکل گئی ہے۔ اب تو تم نے جان لیا۔ چینا تیری ماں کو لے گیا ہے۔ اور اب تیری پرورش مجھے کرنی ہے۔ اب تو اس سبق سے دانا ہو جائے گی۔ اُس چینے کے سینے میں چاقو بھونکنا چاہئے۔ چاقو۔ ہاں۔ اب یہ ایں ایں بند کر دو اور سو جاؤ نہیں تو اور پڑیں گی۔

ناگہاں ہی وہ اس پر ٹوٹ پڑا تھا اور ناگہاں ہی پھر وہ بستر میں جا پڑا اور آپی آپ گنگناتا رہا۔ اور جب کلوری سسکیاں بھرتی ہوئی اور چیخوں کو منہ پر زور سے ہاتھ رکھ کر بند کرتی ہوئی سو رہی۔ تو اُس کا دل دہشت سے بھرپور تھا۔ اور اُس کے کانوں میں یہ آواز غرا رہی تھی! چینے کے سینے میں۔ چینے کے سینے میں چاقو بھونکنا چاہئے۔ چاقو! سینے کے چینے کے۔ . . . ؟

صبح اُس نے رات کے واقعات کا کوئی ذکر نہ کیا۔ مگر کام پر نہ گیا۔ اور پھر دفعتاً کلوری کو پاس بلایا اور دونوں گھٹنوں کے شکنجے میں لے لیا۔ اور دو تین منٹ تک یونہی کھڑا کر رکھا۔ اور اُسے خاموش بے حس و حرکت تکتا رہا۔ بچی بے سکت ٹانگوں کے سہارے سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔

پھر باپ کی پشت سے ایک ہاتھ لپک کر بیٹی کے گالوں پر آ جما۔ وہ لڑکھڑائی۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اور جب وہ پہلو کے بل گری زر پر آ گری تو ایک گتھی ہوئی چابک اُس کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ جانے لگی۔ وہ بے ہوش ہو ہو جاتی۔ اور وہ اُسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر کھڑا کرتا اور چابک برسنے لگتی۔ اور کلوری کو سسکیاں اور دبی ہوئی چیخوں میں سے گانے کی آواز سنائی دی۔ تھیٹر کی طرز تھی جسے لڑکے بازاروں میں گاتے پھرتے تھے!

"چینے کے سینے میں چینے کے سینے میں۔ چا آقو! چینے کے سینے میں چینے کے سینے میں چا آقو!"

مطرب کی آواز۔ التجاؤں چیخوں اور فریادوں کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ بڑھتی گھٹتی رہی۔ اور اُس کی خوشی وحشت ناک حدت تک جا پہنچی۔ اُس نے کلوری کے کپڑے اُتروا دیئے اور وہ کمرے میں اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے ننگے بدن پر چابکیں مارتا جاتا تھا اور گاتا جاتا تھا۔ اور گاتا جاتا تھا اور مارتا جاتا تھا۔

جب کلوری غش کھا کر گر پڑی اور اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور سانس نامعلوم سا ہو گیا اُس نے پانی کا جگ اُٹھایا اور سب کا سب اُس پر لنڈھا دیا ایک بے اختیار سسکی اور سانس کے جھٹکے بس زندگی کی یہی نشانیاں رہ گئی تھیں۔ وہ اب محض ایک لرزاں لرزاں سا لوتھڑا تھی۔ لیکن اُس نے اُس کی کلائی کو پکڑ کر زور سے مروڑا اور وہ اس درد کے نئے صدمہ سے ہشیار ہو گئی اور خون پھر "چینے کے سینے میں۔ چینے کے سینے میں چا آقو" کی لے میں چلنے لگا۔

اب وہ اسقدر نحیف ہو چکی تھی کہ اُس میں کسی قسم کی آواز نکالنے یا رہائی کی التجا کرنے کی سکت نہ تھی۔ اور جہاں پہلے دیوانہ وار چیخوں اور فریادوں سے قیامت بپا تھی۔ اب وہاں خوفناک خاموشی طاری تھی!

اُس نے اب اُسے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا اور کپڑے پہننے کا حکم دیا۔ اور کچھ دیر چابک کو اُس کے جوڑوں پر مار مار کر دل بہلاتا رہا اور وہی طرز گاتا رہا۔ پھر اُسے ایک کونے میں پھینک کر باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔

اُس نے ابتدا اچھی کی تھی! کلوری درد سے نڈھال۔ زخموں سے چور چور ہو کر کانپ رہی تھی۔ اُسے اس انقلاب کی کوئی وجہ معلوم نہ تھی۔ یا اُس کے ذہن میں وہ دہشتناک لے چکر لگا رہی تھی۔ خاردار شاخوں کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ وہی طرز جو کبھی خون کی رفتار کے ساتھ کبھی زخموں کی پے بہ پے جلن کے ساتھ اور کبھی باہر فیکٹری کے انجن کی دھڑکن کے ساتھ ایک ہی لے میں چلی جا رہی تھی!"

"چینے کے سینے۔ چینے کے سینے میں چا آ تو۔ چینے کے سینے میں چا آ تو!"

اس گھناؤنے کمرے میں چار دن تک کیا ہوتا رہا یہ ناقابلِ بیان ہے دن رات چیخیں اور التجائیں تھیں۔ اُسے ایک دن بھی آرام نہ ملا۔ وہ اُسے گھنٹہ بھر سونے دیتا۔ اور وہ پھر وہی آواز وہی مانوس گیت! سینے میں چاقو" اور پتلے پتلے ہاتھوں سے جو اُس کے گلابی بدن پر آفت برپا کر رہے تھے اُسے جگا دیتے!

لیموں کے رنگ کے گھنگھر اور نازک سبک حسن جو ماں کی یادگار تھے۔ گری زر کے دل میں چبھتے ضرور ہوں گے۔ مگر اس کا ارادہ ایک لمحہ بھر بھی متزلزل نہ ہوا۔ اور ایک دو دن میں لڑکی کٹھ پتلی کی طرح ہو گئی۔ جو اُس کے ہر اشارے ہر جنبش پر ناچتی تھی۔ جب اُس کا ارادہ آہستہ آہستہ خیالی حالت سے عملی صورت میں آنے لگا۔ تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ درندہ جو ہم سب میں پہلو نشین ہے زنجیریں توڑ کر باہر نکل آیا ہے اور اُسے ایذا رسانی کی لذت نے سرتاسر جکڑ لیا ہے۔ وہ جفاکاری کی اس دلدل میں دھنس دھنس جاتا۔ مگر اپنے راستے پر برابر چلا جاتا۔

ان "لذت گیریوں" اور "انتقام پذیرائیوں" میں جو وقفہ ملتا اُس کا عشق زدہ دل گم گشتہ روزی کی یاد میں اُس کے حسن۔ اُس کی گفتار اُس کے کردار کی یاد میں اُس کا یوں کہنا یوں کرنا یوں چلنا۔ یوں یوں اس طرح! ——— اس بہاؤ سے اُس کا دل چھلک چھلک جاتا۔ وہ راتوں کو جاگ اُٹھتا اور اُسے اپنے پہلو میں نہ پا کر اُس کی ہڈیاں تک اس عورت کی آرزومند ہوتیں۔ جو اُسے ایک زرد گوش چینے کے لئے اکیلا چھوڑ گئی تھی!! اور پھر وہ اپنی تجویز کو اور سوچتا اور اس سوچ سے وہ اسے اور کامیاب بنانے کا خیال کرتا۔ اور جب ظلم کا درندہ ایک بار پھر چھوٹ جاتا۔ تو وہ شعلوں کی طرح دوڑتا پھرتا یہانتک کہ اُسے لڑکی کی ناطاقتی سے خوف آنے لگتا۔ کہ کہیں تیر کو نشانے تک پہنچانیکی خواہش کمان ہی کو نہ توڑ دے۔

آخر چوتھے دن وہ منزلِ مقصود کے قریب آ گیا۔ کلوری کو کرسی پر بٹھا کر اتنا پیٹا گیا تھا کہ اب اُس کا جسم ایذا کی درد بھی محسوس نہ کرتا تھا۔ اور وہ بالکل خالی الذہن پڑی ہوئی تھی۔ گری زر نے وقت کا اندازہ خوب کیا تھا!

جفاکاری کی لذت میں سرمست ہونے کے باوجود کسی خون میں کھولنے والے زہر نے اُسے ٹھیک راستے پر لگایا تھا۔ اور جب اُس نے لڑکی کو یہ پوچھتے ہوئے سُنا:۔

"ابا تو پھر اُس چینے کے سینے میں کوئی چاقو کیوں نہیں چبھو دیتا"

اُس کے منہ سے بے اختیار ایک خوشی کی چیخ نکل گئی۔ لیکن اُس نے جلدی اپنے اوپر قابو پا لیا۔ اور سرسری طور سے کہنے لگا "کیونکہ سب ڈرتے ہیں"

"کیا چینے کسی سے مر نہیں سکتا؟"

مر کیوں نہیں سکتا! یوں ہی سے سہل تو ہے۔ کسی شام کو سب سوتے ہوتے ہیں چینا بھی۔ اندھیرے کمرے میں ہر کوئی مار سکتا۔ یوں! کوئی اسے مار ڈالے تو خوب ہو۔ تمہاری امی کو مجھ سے اور تم سے چھین کر لے گیا بدذات!"

"کوئی مارے تو کس طرح مارے؟"

"کس طرح" اُس نے اُسے فراک سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ چار دن کے درد و کرب نے اُسے نیم وحشی کر رکھا تھا۔ اور اُس کے چہرہ پر جو آنسوؤں سے سوجا ہوا تھا حیوانوں کی سی بے شعوری جھلک رہی تھی!۔

اُسے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ اُسے جھٹک کر کھینچنے والے ہاتھ ظالمانہ نہ تھے!۔

"اس طرح ——— مارنے والا چینے کے گھر جائے۔ وہ جو بھورے رنگ کا گلی کے کونے پر ہے۔ اور چپکے سے اندر داخل ہو جائے۔ کیونکہ اُسکا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اور پھر دبک کر پچھلے کمرے میں چلا جائے جہاں چینا سوتا ہے۔ اور جہاں ہر وقت اندھیرا رہتا ہے۔ اور پھر دبکتا ہوا بستر پر جا پہنچے اور چاقو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لے اور اوپر سے ملا کر گچ کر کے۔ چینے کے گلے میں گھونپ دے۔ یوں!" ———

اُس نے پورا بتاوا کر کے دکھایا۔ اور یہ دیکھ کر بڑا خوش ہوا کہ بچی یہ سب کچھ

بڑی توجہ سے دھیان لگاکر سن رہی تھی۔ جیسے کوئی سبق لے رہا ہو!

"مگر کوئی یہ کرتا کیوں نہیں اور ہمارے پاس اتی کو لے کیوں نہیں آتا؟"

"کیوں؟ ڈرتے ہیں اور کیا! اور پھر یہ کرنا نہیں چاہتے۔ اس لئے بھی! یہ قتل ہوگا۔ لوگوں کو قتل کرنا درست نہیں۔ قتل بڑا گناہ ہے"۔

"اتا تم نہیں چاہتے کہ چینا مر جائے۔ میں تو چاہتی ہوں"۔

"مر جائے تو مجھے چین آجائے۔ مگر یوں کہنا اچھی بات۔ لیکن میں چاہتا یہی ہوں کہ ایسا ہی ہو۔ مگر ——— ہوں۔ ان باتوں کو سوچا نہیں کرتے۔ اچھی بات نہیں۔ تم یہ سوچتی نہ پھرنا۔ اور اس کا کہیں ذکر نہ کرنا۔ نہیں تو ابھی جو تم ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ہوگا!"

دوسرے دن صبح کو اُس نے اُسے اپنی طرف بُلایا اور فراک نوچ کر پھر چاقو کی برسائی شروع کر دیں۔ اور اسے بستر سے باندھ کر اس طرح لٹکا دیا کہ اُس کے پاؤں دوہرے ہو کر زمین کو چھونے لگے۔ بار بار اُس کا بوجھل سر درد سے تھک تھک کر گر گر پڑتا۔ اور جب کبھی وہ اُسے اُٹھاتی اُسے سامنے کارنس پر ایک چاقو نظر آتا۔ جو پہلے وہاں نہیں تھا۔ ایک لمبا پتلا سا چاقو اور ایک سستی سی فولو پھینے کی شبیہ! اور جب وہ اس مسلسل ایذا سے چکرا رہی تھی تو اُس کے ننھے دماغ میں خیالات کینچوؤں کی طرح رینگنے لگے۔ اور وہ سنہری سر عجیب عجیب تجاویز سوچنے لگا۔

دوپہر کو وہ آیا اور اُسے رہا کر دیا۔ کپڑے پہن لینے دیئے اور کھانا بھی دیا۔ شام کے قریب وہ لیکا یک باہر نکل گیا اور دروازہ کھلا چھوڑ گیا۔ آدھ گھنٹہ کے قریب واپس آیا۔ اور کمرہ خالی تھا! اُس کا دل خوشی سے بھرپور تھا۔ اور وہ خوشی سے بھرپور تھا۔ اور وہ گانے لگا اور مزے میں آکر انگلیاں چٹخانے لگا!

سات بجے کے قریب اُسے باہر باہر ننھے ننھے پیروں کی داب سُنائی دی۔ اور پھر جُرابوں اور پریشان لباس کا ایک چھوٹا سا بگولہ اندر داخل ہو گیا۔ جو پھسلا اور گر پڑا۔ پھر اُٹھا اور اُس کے چہرے پر ایک خوفناک تبسم دیکھ کر پھر گر پڑا۔ لڑکی کا چہرہ پھڑک رہا تھا۔ اور اُس کا سانس کھنچ کھنچ کر آتا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ اُس کے سینے میں گڑے ہوئے تھے!! ———

اُو۔ کمکرو جت بنی کھڑی رہی کیونکہ اُسے ایک تازہ حملہ کا خوف تھا لیکن جب کچھ نہ ہوا تو وہ جلدی جلدی بولنے لگی:۔

ابا مجھے مت مارنا۔ چاکیس نہ مارنا۔ ابا جان میں ابھی کچھ کرنے گئی تھی بس بنے وہ کام کر دیا ہے۔ ابا وہی جس سے لوگ ڈرتے تھے۔ ابا تم خوش نہیں ہو؟ میں نے اُسے جا کر مار ڈالا ہے۔ میں نے اُس چینے کو مار ڈالا ہے۔ ابا میں نے اُسے ختم کر دیا ہے۔ اندھیرے میں گھپ اندھیرے میں! وہ بالکل مر گیا ہے۔ اندھیرا گھپ دیا تھا —— دونوں ہاتھوں میں لے کر۔ ابا اب نہ مجھے مارا کرو۔ میں نے سمجھا تھا کہ اب اتی واپس آجائیگی اور —— شاید ..... او۔ او —— ابا —— یوں مت دیکھو ..... ابا .....!"

اُس کا دل سینے سے باہر اُچھل رہا تھا۔ وہ قہقہوں سے ہونکنا چاہتا تھا۔ سر کے بل ناچنا چاہتا تھا۔ لیکن اصل حقیقت پر پردہ ڈال لیا اور بچی کو خوف سے اندر دھنستی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

تم نے کیا کر دیا؟ تم نے کسی کو مار ڈالا۔ کلوری تم نے چینی کو مار ڈالا۔ او میرے اللہ او!"

"ہاں میں نے"۔ بچی بڑی سادگی سے کہہ رہی تھی۔ اُس نے فراک میں سے ایک لمبا چاقو باہر نکال لیا۔ اور کہنے لگی۔ ہاں تو ابا میں نے خوب کیا؟ اُس نے ہماری اتی چھین لی تھی۔ اس چاقو سے!۔ میں اندر چلی گئی۔ اندھیرے میں اندر چلی گئی۔ دیکھنا۔ گیلا ہے چاقو! میں اندر چلی گئی اور آنکھیں بند کر کے اندر گھونپ دیا۔ یہ تو آدھا بھی اندر نہیں گیا!"——

"یا اللہ۔ یہ کیا ہو گیا!" اگری زر کی بناوٹ اصل سے بھی بہتر تھی۔ وہ بے جان ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اُس کی دُبلی پتلی انگشت سراسر ایک نشان استفہام بنی ہوئی تھی۔ یوں؟ —— پھر وہ لپک کر اُٹھا اور الفاظ کی آندھی میں گھبرا ہوا گلی میں جا پہنچا اور بیٹھی ہوئی آواز میں چلانے لگا!

او خدا۔ پولیس پولیس۔ کوئی پولیس کو بلا لائے۔ میری بچی نے خون کر دیا ہے۔ خون۔ کلوری نے چینی کو قتل کر دیا ہے۔ یا اللہ یا اللہ کوئی اندر آئے۔ فلوری کے پاس جائے اُس نے ایک چینی کو چاقو سے مار ڈالا ہے۔ اور اب اندر اُس چاقو سے کھیل رہی ہے۔ خون سے بھرے ہوئے چاقو سے! پولیس کہاں ہے پولیس"۔

ایک لمحہ میں تمام گلی جو اس وقت سنسان تھی زندگی سے تھرّانے لگی۔ ایک چھوٹا سا جھرمٹ اُس کے اردگرد ہو گیا۔ اوڈو خیانہ اشاروں سے بال پریشان چہرہ پیچ کھاتا ہوا۔ بار بار وہی ایک کہانی سُنا رہا تھا۔

پھر ایک سیٹی بجی اور آہستہ آہستہ پولیس بھی آگئی۔ کچھ اس چینی کے گھر میں داخل ہو گئے اور کچھ بچے کو پکڑ لائے۔ سارجنٹ نے گری زر پر کچھ سوالات کئے اور

ایسے باصواب جواب اور ایسی گھبراہٹ کا اظہار دیکھ کر اُس کی توجہ کسی اور زیادہ کارآمد رُخ کی طرف پھر گئی!—

ہاں چاقو اسی کا تھا۔ اسے کسی برمی جہازراں نے دیا تھا۔ ہاں اسے چینے سے نفرت ضرور تھی۔ کیوں کہ اُس نے اس کی بیوی کو اس بچی کی ماں کو اس سے چھین لیا تھا۔ اور غالباً اس نے کبھی یہ بھی کہا ہوگا کہ یہ چینا مر جائے۔ کہنا تو نہ چاہئے۔ مگر دردرسیدہ دل سے فریاد تو اُٹھتی ہے!— نہیں وہ آج کام پر نہیں گیا تھا۔ لیکن وہ دن بھر میرے پاس اُس قہوہ خانہ میں بیٹھا رہا تھا۔ اسے لوگوں نے نچلی منزل والوں نے ایک گھنٹہ ہوا آتے دیکھا تھا۔ ہاں وہ ان دنوں بچی کو کئی بار پیٹتا رہا تھا۔ مجبور تھا۔ بیوی اُس کی چینی لے گیا۔ بچی اب اُسی کے ذمہ تھی۔ وہ اُسے پوری طرح قابو میں نہ رکھ سکتا تھا۔ (اس موقعہ پر اُس نے ایک آنسو بھی نکال لیا) اگر اسے یہ خیال بھی ہوتا کہ یہ ناشدنی امر ہوگا تو وہ چاقو کو وہاں کبھی نہ رہنے دیتا۔ مگر یہ کسے خیال تھا کہ یہ بچی اُس کی اکلوتی بچی خون کر دیگی! اللہ سب کو بچائے۔ نہ جانے اس پر یہ دو صدمے پے در پے کس گناہ کی سزا میں ہوئے ہیں۔ بیوی جاتی رہی۔ پھر بچی نے کسی کو مار ڈالا۔ اُف اللہ!—

وہ سپاہیوں کی سہارا دینے والی باہوں پر گر پڑا +

فلوری اور اُسے تھانہ میں لے گئے۔ بچی اس عجوبہ بات پر کچھ حیران اور اور کچھ کچھ خوش بھی تھی۔ اور گری زر! اُس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا تھا!— روزی کو خراب کرنے والا ٹھکانے لگ چکا تھا۔ اُس کے بیانات لے لئے گئے۔ اور اُسے بچی ہی کے ساتھ عارضی حراست میں رکھ لیا گیا +

اتنی دیر میں وہ سپاہی بھی آ گئے جو تفتیش کے لئے چینی کے گھر گئے تھے اور اُنہوں اپنی زبانی رپورٹ پیش کی +

یکایک تھانہ کی خاموشی میں ایک چیخ گونج اُٹھی۔ ایک نوگرفتار درندے کی پکار اور گری زر میکلیگن دھم سے زمین پر آ گرا اور مکوں سے فرش کو کوٹنے لگا۔

سپاہی بیان لکھوا رہا تھا۔ ہاں۔ جناب ہاں ہم وہاں پہنچے اور لاش وہیں موجود تھی بستر میں۔ چاقو کا نشان گردن میں تھا۔ بائیں طرف۔ مگر یہ چینی کی لاش نہیں تھی۔ عورت کی لاش تھی۔ روزی میکلیگن کی۔ اس لڑکی کی ماں کی اور اس شخص کی بیوی کی!!

تاثیر ایم اے

یونیورسٹی قاہرہ یا جامع ازہر

تمام دنیا میں اس وقت جسقدر یونیورسٹیاں موجود ہیں ان سب میں بلحاظ قدامت کے الازہر کا نمبر اوّل ہے۔ اس کی بنا خلفائے خاندان اسماعیلیہ علویہ کے خلیفہ پنجم العزیز باللہ بن المعز لدین اللہ کے عہد میں سنہ ۳۶۵ھ میں رکھی گئی تھی جس زمانہ میں خاندان مذکور ملک مصر پر حکمران تھا۔ اس حساب سے دار العلوم ازہر کی عمر ۹۸۰ سال ہوئی۔ اس مدت کی تصدیق یورپین مورخین کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ جو دسویں صدی عیسوی میں اُس کا قائم ہونا بیان کرتے ہیں۔ ہم انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کی تاریخ بناء کا نقشہ ذیل میں تحریر کرتے ہیں +

(۱) اکسفورڈ یونیورسٹی۔ بارہویں صدی عیسوی		(۴) گلاسگو یونیورسٹی	سنہ ۱۴۵۰ء
(۲) کیمبرج " تیرہویں " "		(۵) ایرڈین "	سنہ ۱۴۹۲ء
(۳) سنٹ انڈریور "	سنہ ۱۴۱۱ء	(۶) یونیورسٹی کالج لندن	سنہ ۱۸۲۸ء

نقشہ مندرجہ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ الازہر سب سے پُرانی یونیورسٹی ہے۔ جس میں کسی وقت میں بیس بیس ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ اس وقت بھی دس بارہ ہزار تک جن میں مصر کے علاوہ دیگر ممالک کے طلبہ بھی شامل ہیں۔ زیر تعلیم ہیں +

مدرسہ کے مشرق میں ایک مسقف خانقاہ ہے جس کا رقبہ ۳۶۰۰ گز مربع ہے۔ اس کی چھت سنگ مرمر اور سنگ سُرخ کے ۳۸۰ شاندار ستونوں پر استادہ ہے۔ اس مکان میں شب کو بارہ سو گلاس کی روشنی ہوتی تھی جو برنجی زنجیروں میں چھت سے آویزاں ہیں۔ صدر دروازہ پر پچیکاری کا کام ہے۔ اور جا بجا کتبے کندہ ہیں جن کے حروف اب صاف پڑھے نہیں جاتے۔ یہ کل عمارت بہ ہیئت مجموعی عجیب شاندار اور زمانہ قدیم کے فن تعمیر کا حیرت انگیز نمونہ ہے +

بشیر حسین خاں دسمبر ۱۹۲۷ء

زمزمۂ تغزل

(نتیجۂ فکر جناب رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب محمد سجاعلی خاں صاحب بہادر نواب آف کرنال)

سکوں کیونکر ہو اس بیمارِ غم کو کیا قرار آئے
خیالِ زُلفِ پیچاں جس کے دل میں بار بار آئے

گلے مل کر ذرا رخصت تو ہو لیں اہلِ گلشن سے
خدا جانے کہاں اگلے برس ہم کو بہار آئے

مٹا کر اپنی ہستی اُن کی خاطر یہ صلہ پایا
کبھی تربت پہ بھی آئے تو وہ بیگانہ وار آئے

مرے درماں کا وعدہ اور پھر وہ آپ کا وعدہ
وہ باتیں کیجئے جن کا کسی کو اعتبار آئے

زمانہ تا نہ دے الزام اُن کو خونِ ناحق کا
جنازے پر ہمارے اس لئے وہ سوگوار آئے

کہاں تک فصلِ گُل میں بے پر و بالی کا ماتم ہو
مدد اے چشمِ خوں افشاں قفس ہی میں بہار آئے

نہیں ہے مسلکِ تسلیم میں شکوہ کی گنجائش
کرے وہ ظلم ہم پر جس قدر اُتنا ہی پیار آئے

اُچھلتے تھے ہر اک تارِ نگہ سے جامِ مدہوشی
عجب انداز سے محفل میں وہ مستانہ وار آئے

نہ پوچھا اُس وقت کی مجبوریاں اور بے کسی ہمدم
کسی بے درد پر جس وقت دل بے اختیار آئے

نہیں جوشِ جنوں پابندِ رنگ و بوئے گلشن کا
گئے وحشی تمہارے جس جگہ بھی بے قرار آئے

بدل جائے نظامِ دہر تو ٹھیرے زمیں بسمل
قیامت ہو اگر راحت ہمیں زیرِ مزار آئے

بسمل

(مرسلہ ملک عبدالحمید صاحب بی کیل، کرنال)

کامیابی کا راز

وحشی اقوام کا ایک افسانۂ محبت

پانڈی چری جو ہندوستان میں فرانسیسی دخل در معقولات کی آخری نشانی ہے اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار و جبروت کے بالمقابل فرانسیسی مشرقی پالیسی کا مرکز ہے۔ اپنے اندر مغربی دلچسپیوں اور دلفریبیوں کا ایک خاص دلاویز حسن رکھتا ہے۔ اور اس نعمت سے وہ تمام چھوٹے چھوٹے جزائر بھی مالا مال ہیں جو پانڈی چری سے چند میل کے فاصلہ پر مونگے کے جزیرے کہلاتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بھی جن کی آبادی دو چار ہزار دیسی اور چند سو فرنگی النسل افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ ڈاک خانہ۔ تار گھر۔ مدرسہ۔ کلب گھر۔ میونسپل ہال۔ تھانہ۔ لائبریری وغیرہ موجود ہیں۔

انہی مونگے کے جزیروں میں ملیشیا بہت ہی بارونق جزیرہ ہے۔ اسکا طول پندرہ میل اور عرض چھ میل ہے۔ آبادی بھی چھ سات ہزار کی ہے۔ جس میں سفید رنگ اقوام کی تعداد چند سو سے زایہ نہ ہوگی۔ جزیرہ کی اصلی آبادی ہندوستان کے قدیم باشندوں بھیل گونڈ پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کچھ عرب اور "ہندوستانی" بھی موجود ہیں۔

مغربی تہذیب کی جلد برکات کے ساتھ ملیشیا۔ بخار۔ پھوڑے پھنسی اور دیگر امراض خبیثہ سے بھی محفوظ اور مامون ہے۔ نہ اس میں مچھر ستاتے ہیں نہ پسو۔ نہ ہوا میں اڑنے والے ایسے جانور جن کے کاٹے سے جسم پر خوفناک زخم بن جاتے ہیں۔ اس لئے مونگے کے جزیروں کی برائیاں اور تکالیف بیان کرتے وقت ملیشیا کو اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔

ملیشیا کا دار الخلافہ مٹیالا ہے جو ایک خلیج کے بالمقابل آباد ہے۔ اس کے سامنے چھوٹی چھوٹی چٹانیں ایک میل تک سمندر میں چلی گئی ہیں ان چٹانوں نے سمندر کی پُرزور امواج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس لئے مٹیالا ایک اچھی بندرگاہ تھی جس کے دونوں طرف جہاز لنگر انداز ہوتے تھے اور جزیرے سے مچھلی۔ کھجور۔ ناریل۔ کیلا اور دیگر اشیائے تجارت لاد کر ہانڈی چری میں لے جاتے تھے۔

جزیرے کے اصلی باشندے فرانسیسی سیاست کے باوجود کمزور اور نذدل نہ ہو گئے تھے۔ گو وہ بھیل اور گونڈ کی نسل ہی سے تھے۔ لیکن انہیں قدیم آبائی کے جبر و ظلم کا آماجگاہ نہیں بننا پڑا تھا۔ ہماری کہانی کا ہیرو ڈیکا بھی قدیم باشندوں کا اصلی نمونہ تھا۔ یہ خوبرو۔ بلند قامت اور مضبوط اعضا کا مالک تھا ماہی گیری کے ذریعہ بسر اوقات کرتا تھا۔ شراب۔ افیون یا چانڈو کا شائق نہ تھا۔ اس نے معمولی سی تعلیم حاصل کی تھی جس سے اس میں غور و فکر کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔

مشنریوں (مسیحی مبلغین) کی تعلیمات کے باعث وہ یہ جان گیا تھا کہ ملیشیا کے باہر بھی ایک دنیا آباد ہے۔ اور ماہی گیر تمام کے تمام مفلس اور قلاش ہیں۔ نیز دنیا میں بعض آدمی لاقعداد روپیہ کے مالک ہیں۔ پھر بھی طرباکی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بعض لوگ طاقتور اور بااثر ہیں۔ اس لئے وہ حکمران کہلاتے ہیں جو غریب اور کمزور ہیں وہ دوسروں کے غلام ہیں۔ اور اس تعلیم کے لئے کسے اپنے گھر میں بھی کافی مثالیں بنتی تھیں۔ مثلاً کئی جینی سوداگر تھے۔ جو بہت تھوڑا کام کرتے لیکن ہر روز ڈیکا سے بہت زیادہ روپیہ کما لیتے تھے۔ اتنا زیادہ کہ وہ مشکل سے ایک مہینہ میں کماتا تھا۔ ہوٹل کا پرتگیزی مالک پاپانا جزیرہ میں زمین پر زمین خرید رہا تھا۔ اس نے دو گھوڑے رکھے ہوئے تھے۔ اور وہ موٹے موٹے سگار پیتا تھا جن پر روپہلی اور سنہری ورق لپٹے ہوتے تھے۔ اسی طرح سے ایک سوئٹزرلینڈ تھے۔ جو ناریل کا اجارہ رکھتے تھے۔ انہیں اپنی قوت لایموت کے لئے نہ ماہی گیری کا پیشہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی اور نہ زمین بونے کی۔

ڈیکا اس راز سے محض بے خبر تھا۔ کہ وہ کونسی قوت ہے جو بعض آدمیوں کو امیر اور بعض کو غریب بناتی ہے۔ کیا ہم بھی اس راز سے واقف ہیں؟ میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہے!

ڈیکا کی سادہ لوحی اس نتیجہ پر پہنچی کہ زندگی میں کامیابی کا راز صرف

جادو کے اثر پر مبنی ہے۔ وہ سرمایہ کی قوت سے محض ناواقف تھا، اور نہ اُس فوق العادت قوت سے آشنا تھا جو بعض آدمیوں میں پائی جاتی ہے۔ اور جس کے ذریعہ وہ دیانت داری یا بددیانتی سے دنیا کی دولت کو سمیٹ لیا کرتے ہیں۔ رات دن کے سوچ بچار سے ڈکیا کے لئے تمام عالم کی حکمران قوت جادو بن گیا۔ اُس نے ایک امریکن تماشہ گر کو جادو کے چند کرشمے کرتے دیکھا تھا۔ اُس نے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے اپنی ٹوپی میں سے سَو لہ بڑے بڑے ناریل نکال کر دکھائے تھے۔ اُس ٹوپی میں سے جس میں مشکل سے تین ناریل سما سکتے تھے۔ اُس نے ٹیٹو کے کان سے ایک گھڑی نکالی تھی۔ جس کا وقت بالکل دوسری گھڑیوں کے مطابق تھا۔ اُس نے تمو کے بیٹے کو ہوا میں معلق کر کے اُس کے پیٹ میں چمکتی ہوئی تیز تیز چھریاں بھونک دی تھیں۔ اور پھر اُسے زندہ کر دکھایا تھا! وہ جانتا تھا کہ یہ صرف جادو ہی ہے جس کی بدولت فرنگی چینی اور ہندوستانی جزیرہ میں طاقتور سمجھے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُسے یہ جادو آوفا سے مل سکتا ہے۔ جو دور پہاڑیوں کے اندر تن تنہا رہتی ہے +

ان تمام حالات پر خوب غور کرنے کے بعد ڈکیا ایک فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ گیا۔ اور وہ یہ تھا کہ وہ بھی دنیا میں کامیاب اور بامراد ہو سکتا ہے۔ وہ بھی اُن ہی طریقوں پر عمل پیرا ہو گا۔ جن پر دوسرے کامیاب لوگ عمل کر رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے اُسے آوفا جادوگرنی سے امداد لینی ہو گی۔ جس کے لئے ایک معقول رقم کی ضرورت ہے +

آوفا کی نذر کے لئے اُسے دس چھوٹی اشرفیوں کی ضرورت تھی۔ اور یہ اتنی رقم تھی جس سے وہ ایک گراموفون خرید سکتا۔ اور متحرک تصاویر کے چند تماشے بھی دیکھ سکتا تھا۔ دس چھوٹی اشرفیاں جمع کر لینا اُس کے لئے امرِ محال تھا۔ لیکن اپنے مقصدِ جلیلہ میں کامیاب ہونے کے لئے وہ دُگنی محنت کر رہا تھا۔ ہندی کا آہڑ قی اُس کی محنت کا بیشتر حصّہ غصب کر لیتا تھا۔ اُس کی محنت کے مقابلہ میں بہت قلیل رقم اُسے ملتی تھی۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ دس نصف اشرفیاں جمع کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف کرنا پڑیگا لیکن جو لوگ پس انداز کرنے کے راز سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب روپیہ جمع ہونے لگتا ہے تو اس تیزی سے بڑھتا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ ڈکیا جس نے اس سے پیشتر کبھی ایک پائی بھی جمع نہ کی تھی اس ترقی پر خود حیران رہ گیا۔ اور اسے اداغیبی تصور کرنے لگا۔ ڈکیا کی محنت اور کفایت شعاری رنگ لائی۔ اور بالآخر کار ایک دن اُس پیتھڑے میں جو اُس نے دیوار کے سوراخ میں چھپا رکھا تھا۔ دس چھوٹی اشرفیاں اکٹھی ہو گئیں +

کفایت شعاری اور کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا ہی دنیا میں سب سے بڑی تجارت ہے۔ اس گرگو آزما کو دیکھ لیجئے۔ چند ہی روز میں حالت کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ دُنیا میں روپیہ پیدا کرنے کا سب سے بڑا راز یہی ہے +

میتالا کے لوگ ڈکیا کے جدید طرزِ عمل پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ عوام کا خیال تھا کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس لئے شادی کے مراسم ادا کرنے کو کچھ نہ کچھ جمع کرتا رہتا ہے۔ عوام الناس کی اس رائے کا سب سے نمایاں اثر مریما پر ظاہر ہوا +

مریما جزیرہ میں سیاہ آنکھوں والی لڑکی کہلاتی تھی۔ اُس کی آنکھیں کاجل کی طرح کالی اور ہرنی کی طرح لمبی تھیں۔ اُس کی ناک پھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے یورپین باشندوں کی رائے میں اس کی ناک جزیرہ میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ مریما کو ڈکیا سے بچپن سے اُلفت تھی۔ وہ اکٹھے کھیلتے رہے تھے۔ جوہڑوں میں مچھلیاں پکڑتے۔ لڑتے جھگڑتے اور پھر صلح کر لیا کرتے۔ ماہی گیروں کے پیچھے رات رات بھر شارک کے شکار کا تماشہ دیکھنے کو پھرتے رہتے تھے۔ اُنہوں نے بڑے بڑے طوفان اور آندھیاں دیکھی تھیں جبکہ تناور درخت جڑوں سے اُکھڑ کر میلوں دور جا پڑتے تھے۔ لیکن یہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے زمین پر لیٹے رہتے +

ڈکیا مریما کی محبت سے واقف تھا۔ اور خود بھی اُس سے محبت کرتا تھا اور ممکن تھا کہ یہ محبت اُن میں کبھی سرشتۂ مناکحت قایم کر دیتی۔ کہ ڈکیا کی طبیعت میں بڑا آدمی بننے کے لئے یک لخت انقلاب فطیم پیدا ہو گیا۔ اور اُس کی تمام تر توجہ دس چھوٹی اشرفیاں حاصل کرنے پر جمع ہو گئی۔ تاکہ وہ آوفا کی نذر کر کے ایک جادو خرید لے۔ اور جزیرہ کا ایک بڑا آدمی بن جائے۔ اس لئے اُسے مریما کا بہت کم خیال آتا تھا +

مریما اُس کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کر رہی تھی۔ اُس نے وہ سرد مہری بھی محسوس کر لی تھی۔ جو اُس کی آنکھوں سے ظاہر تھی + وہ سمجھتی تھی کہ وہ برابر کچھ سوچتا اور روپیہ جمع کرتا رہتا ہے۔ یہ مسئلہ مریما کے لئے ایک لاینحل عقدہ تھا کہ وہ کیا سوچتا اور کیوں جمع کرتا ہے۔ ..... اس کے نزدیک اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی۔ کہ کسی دوسری لڑکی کا خیال!

مریما جب اس نتیجہ پر پہنچی اُس وقت ڈکیا پانچ چھوٹی اشرفیاں

جمع کر چکا تھا۔ اور اس پونجی کے رفتہ رفتہ بڑھ کر آٹھ اشرفیاں بننے تک مریما کے جذبات اس حد تک مشتعل ہو چکے تھے کہ وہ دوسری لڑکی کو نوچ ڈالے۔ اور پیٹتے پیٹتے جان سے مار ڈالنے کے خواب دیکھنے لگی۔ وہ ڈکیا کی اسقدر نگرانی کر رہی تھی کہ اُس کے علم کے بغیر اس کو کسی دوسری عورت سے بات چیت تک کرنا محال تھا۔

ایک شام چھوٹی ٹیپی جو کبھی کبھی مریما کی طرف سے ڈکیا کی نگرانی کرتی تھی۔ دوڑتی ہوئی مریما کے پاس آئی۔ اور اُسے بتلایا کہ ڈکیا اپنے گھر سے کچھ ہمراہ لے کر پہاڑی علاقے کی طرف چلا گیا ہے۔

پلک جھپکنے میں مریما اُس کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔ اُس نے اپنی کمر میں اپنے باپ کا وہ لمبا چاقو چھپا لیا جس سے ڈکیا شارک مچھلی سے لڑا کرتا تھا۔ وہ اسی چاقو سے اپنی رقیب کو ذبح کر دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔

رات ناریل اور کھجور کے درختوں کی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔ اور بڑے بڑے ستارے ناریل کے درختوں کے اوپر ننھی ننھی قندیلوں کی طرح دمک رہے تھے۔ کالے آسمان پر کہکشاں ایک جوئے نور نظر آ رہی تھی۔ ڈکیا تمام ستاروں کی رہنمائی پشت پر لئے دیوانہ وار قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ نصف شب کے قریب وہ داہنی طرف مڑا اور اُس پہاڑی پر چڑھنے لگا جہاں اوفا جادوگرنی رہتی تھی۔ مریما بھی سایہ کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ اوفا کی جھونپڑی کے دروازہ پر ڈکیا کی دستک کی آواز سن رہی تھی۔ وہ چھپکلی کی طرح گھاس پر سے گھسٹتی ہوئی جھونپڑی کے اتنے قریب جا پہنچی کہ وہ دونوں کو بخوبی دیکھ سکتی۔ اور اُن کی باتیں سن سکتی تھی۔

چاند بلند ہو چکا تھا۔ اس کی روشنی میں مریما نے دیکھا کہ اوفا اور ڈکیا گھاس پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

مریما اور قریب ہو گئی۔

اس سحر آلود سکوت کو بڑھیا اوفا کی آواز نے توڑا۔ اُس نے کہا:۔

"ڈکیا، تم ایک طلسم خریدنے کے لئے آئے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہوٹل والے پاپانا کی طرح امیر کبیر اور فرانسیسی گورنر کی طرح طاقتور بن جاؤ۔ اور سنہرے درختوں والے سنگار پیو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ پاپانا کی بیوی اپنے خاوند کے لئے دولت اور عزت لائی تھی؟"

ڈکیا نے جواب دیا:۔ "میں عورتوں کے متعلق نہ باتیں کرنے آیا ہوں نہ اُن کے معاملہ میں دلچسپی لیتا ہوں۔"

اوفا نے مسکرا کر کہا:۔

"جو شخص عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ وہ کامیابی کے متعلق بھی کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ یہ صرف عورتیں ہی ہیں جو مردوں کو طاقتور اور دولتمند بناتی ہیں۔ جو طلسم میں تمہارے پاس بیچونگی وہ بھی یہی اثر رکھتا ہے۔ وہ جزیرہ کی تمام عورتوں کو تم پر مائل کر دیگا۔ تم اُن میں سے نہایت دانشمندی سے اپنے لئے ایک کو انتخاب کر لو۔ پس وہ تمہاری ہو گی۔ اور تمہیں اس دنیا میں کامیاب بنا دیگی!"

ڈکیا نے سر ہلایا۔ اور کہا:۔

بے شک۔ بے شک۔ درست۔ یہ عجیب بات ہے۔ اب جہاں تک میں غور کرتا ہوں۔ مینالا کے تمام بڑے آدمیوں کی ترقی میں کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ دیکھتا ہوں۔ میں تمہارے طلسم کو ضرور خریدوں گا۔ اگر وہ میرے لئے دولت اور عزت نہ بھی لایا تو ایک عورت تو ضرور لائیگا۔ افسوس ہے کہ میں نے اپنی غربت کی وجہ سے آج تک کسی عورت کا خیال تک نہیں کیا۔"

اوفا۔ اب تمہیں عقل آئی۔ اچھا تو تمہارے پاس رقم کتنی ہے؟

ڈکیا۔ پانچ چھوٹی اشرفیاں۔

اوفا۔ جو ڈکیا سے بھی زیادہ چالاک تھی۔ بولی۔ میرے طلسم کی قیمت پندرہ چھوٹی اشرفیاں ہے۔ جب تمہارے پاس یہ رقم جمع ہو جائے تو میرے پاس آنا۔ اس سے پہلے نہیں۔

ڈکیا نے ایسا ظاہر کرتے ہوئے کہ گویا وہ اُٹھنا چاہتا ہے۔ ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

اوفا نے کہا یہ تمہاری مرضی پر موقوف ہے۔ کہ پھر کبھی آؤ یا نہ آؤ لیکن تمہارے والد نے ایک دفعہ مجھ پر ایک احسان کیا تھا۔ اس لئے میں تمہارے خاطر وہ کام کر دکھاؤنگی جو کسی دوسرے آدمی کے لئے کبھی بھی نہ کرتی۔ لو میں اس رقم کو نصف کر دیتی ہوں۔ آٹھ اشرفیاں۔ اور طلسم تمہارا ہے۔

ڈکیا جس نے اشرفیاں جمع کرنے اور مچھلی بیچنے کے دوران میں تجارت کے بعض راز معلوم کر لئے تھے۔ کہنے لگا۔ "میرے پاس صرف سات چھوٹی اشرفیاں ہیں۔ اپنی جان کی قسم صرف سات"

(اُس نے ایسی صورت بنائی گویا وہ صداقت مجسم ہے) اس پر اوفا سات چھوٹی اشرفیاں لیکر جھونپڑی میں چلی گئی۔ اور ایک چھوٹی سی تھیلی میں

سے ایک اژدھے کی کھال میں بندھا ہوا تعویذ لائی جسے اُس نے ڈکیا کی گردن میں لپیٹ دیا۔

"یہ تمہارا ہے۔ یہ تمہارے لئے سب کچھ لائیگا۔ اگر تم نے سچ کہا ہے"

ڈکیا کو سچ کی پرواہ نہ تھی۔ اُس نے جھوٹ بول کر تین چھوٹی اشرفیاں بچالی تھیں۔ اور وہ اس پر خوش تھا۔ اور جھوٹ کے نتائج سے بے خبر۔

اوفا نے پھر کہا:-

ڈکیا! سچ پوچھو تو عورتیں ہی مردوں کو کامیاب بناتی ہیں۔ پاپانا کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اُس کی بیوی وفادار اور سچی نہ ہوتی۔ میں بڑھیا ہوں۔ لیکن میری آنکھیں جوان ہیں۔ اور میں ان سے تمہاری نگاہ سے بہت درے کی چیزیں دیکھ سکتی ہوں۔ اس طلسم کو لیجاؤ اور میرے الفاظ کو یاد رکھو۔

ڈکیا طلسم لے کر پہاڑی سے نیچے اُترا۔ مریما ایک دوسرے راستہ سے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اب اُس کا دماغ بالکل نئے خیالات کا مرکز بن گیا تھا۔

مریما رقابت کے جوش سے اندھی ہو کر ڈکیا کے پیچھے آئی تھی۔ اور اُس ایک لڑکی کو مار ڈالنا چاہتی تھی جو اُس کی محبت کے راستہ میں حائل تھی۔ لیکن اب تو اُسے نظر آرہا تھا کہ میٹالا کی تمام لڑکیاں اُس کی رقیب ہیں۔ گو اُس کے لئے بھی دوسری عورتوں کی طرح کامیابی کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اگلی صبح ڈکیا تین چھوٹی اشرفیاں جیب میں ڈالے اور طلسم گلے میں باندھے ہوئے اپنے مکان سے باہر نکلا۔ اب اُس کی گردن بلند تھی۔ اور وہ سمندر کے کنارے اس طرح سے ٹہل رہا تھا جس طرح فرانسیسی افسر ٹہلا کرتے ہیں۔

ڈکیا اب پُرانا ڈکیا نہ تھا۔ وہ یکسر بدل چکا تھا۔ اُس کے گلے میں اوفا کا طلسم بندھا تھا۔ جس کی قوت اور اثر سے یا خوش اعتقادی کی بدولت اُس میں اعتماد نفس پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اعتماد نفس جو آنکھوں میں بجلی کی سی تیز روشنی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے عورتیں مردوں میں تلاش کرتی ہیں بشرطیکہ مرد بدصورت نہ ہو۔

ڈکیا اب عورتوں سے دلیرانہ آنکھیں چار کرتا۔ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن کے جذبات مخفی کا مطالعہ کرنا چاہتا۔ ڈکیا متعجب تھا۔ خوش تھا۔ اور اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی کی سات اشرفیوں کے ضایع نہ جانے پر مطمئن تھا۔ کیونکہ عورتیں اور لڑکیاں خاص انداز سے [illegible] کو دیکھتیں اور اُسکا تعاقب کرتی تھیں۔ مریما بھی اُسے راستہ میں ملی۔ [illegible] نے محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ ڈکیا اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ اور اُسے بھی اُن عورتوں میں سے ایک سمجھنے لگا جو اُس پر فدا ہو رہی تھیں۔ اور بس۔

ڈکیا جو اپنے تئیں جزیرے کا ہیرو سمجھے ہوئے تھا۔ سیر کرتا اور گھومتا ہوا ہاپ سنگ چینی کی دکان میں جا نکلا۔ وہاں سے اُس نے ایک بکس سگرٹ اور دیا سلائی خریدی۔ اور درختوں کے سایہ میں بیٹھکر سگرٹ کا دھواں اُڑانے اور خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ کہ اتنے میں پاپانا کی بیوی سیپی اُس کے سامنے سے گذری۔

اوفا نے سیپی کا ذکر کیا تھا جس کی وفاداری اور تدبر کی بدولت پاپانا نے ہوٹل کے کاروبار میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ سیپی جوان نہ تھی۔ لیکن جوان آدمی کی توجہ ضرور جذب کر سکتی تھی۔ جب ڈکیا نے سیپی پر اپنی جادو بھری نگاہ ڈالی تو سیپی نے اُس کے جواب میں ڈکیا کی طرف دیکھا۔ ایسے انداز سے جس سے ظاہر ہوا۔ کہ طلسم کی امداد سے ڈکیا نے سیپی کے دل پر فتح حاصل کر لی ہے۔

ڈکیا نے اطمینان کا سانس لیا اور ناریل کو توڑ کر اُس کا سرد اور شیریں پانی پیا۔ سگرٹ سلگایا اور دیا سلائی کی تیلیاں ایک ایک کر کے جلا جلا کر پھینکنے لگا۔ تاکہ مسرت کی گھڑیاں ذرا اور طویل ہو جائیں۔ سگرٹ کے ختم ہونے تک وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ سیپی ہی وہ عورت ہے جو اُس کے لئے دولت اور قوت لائیگی کیونکہ اُس کا خاوند اُس کی مٹھی میں ہے۔ ڈکیا نے سیپی کو انتخاب کرنے میں گویا مغرب کی معاشرت کا چربہ اُتارا تھا۔

اپنے انتخاب سے خوش اور مطمئن ہو کر اُسے اپنا شاندار مستقبل درخشاں نظر آنے لگا۔ وہ سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ وہاں مچھلی کا شوربا کھایا۔ اور پھر عبدالکریم کی دکان سے باجہ سوا چھ آنہ میں خرید کر سمندر کا راستہ لیا۔ سمندر کی پُرشور امواج مونگے کی چٹانوں سے قدمبوس ہو ہو کر گھونگے اور سیپیوں کا خراج ساحل کی نذر کر رہی تھیں۔ ڈکیا ایک چٹان پر بیٹھکر باجا بجانے لگا۔ اُس میں اُسے ایسا لطف آیا کہ وہ سرور کے عالم میں اپنے آپ کو ایک گراموفون کا مالک۔ بڑے سگار پینے والا دولتمند۔ اور سیپی جیسی بیوی کا خاوند تصور کر بیٹھا۔

[illegible]

لیکن وہ اس نظریہ سے محض بے خبر تھا کہ عورتوں کو کامیابی کا اوّلین زینہ قرار دیتے ہوئے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ انسان اس سیڑھی سے پھسل کر منہ کے بل گر بھی پڑا کرتا ہے +

بقیہ تین نصف اشرفیاں جیب میں اور آوقا کا جادو گلے میں باندھ کر جس کے محیّر العقول مشاہدات ڈکیا کو دیوانہ بنانے کے لئے کافی تھے۔ وہ میٹالا میں سب سے خود پسند شخص بن گیا تھا۔ کہ میں میٹالا کی عورتوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ حسین اور دلکش شخص ہوں۔ کیونکہ وہاں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جو اُس کے پیچھے پیچھے دور تک نہ آئی ہو +

مریما بھی اُن عورتوں میں شامل تھی۔ اور ڈکیا جانتا تھا۔ کہ وہ اُسی سے محبت کرتی ہے۔ لیکن مریما کی محبت ایک سچی محبت تھی۔ اور عورت جب محبت کرتی ہے تو وہ اُس کے لئے یکسر کان اور آنکھیں بن جاتی ہے۔ وہ صرف اپنے محبوب کی باتیں سنتی اور اُسے ہی دیکھتی ہے۔ وہ اُس کے لئے نہ گہرے سمندر سے ڈرتی ہے نہ گھنے جنگلوں سے۔ ہر مشکل میں سے اپنے لئے راستہ نکال لیتی ہے +

سیپی اور ڈکیا کے متعلق مریما نے سب کچھ دیکھ اور سن لیا تھا۔ وہ حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ گئی تھی۔ اور تعجب کی بات تھی کہ سیپی کے لئے اُس کے دل میں رقابت کا اتنا جوش پیدا نہ ہوا تھا۔ قدرتی جزیرے کی دوسری جوان لڑکی کے لئے پیدا ہونا یقینی تھا۔ مریما جانتی تھی کہ سیپی محض طلسم کی وجہ سے ڈکیا کی اسیر ہے۔ اور جلد یا بدیر اپنی غلطی کا خمیازہ اُٹھا لیگی۔ اور مریما کو اس کے لئے زیادہ منتظر نہ رہنا پڑا +

بندرگاہ میں ایک نوادر جہاز لنگر انداز ہوا تھا۔ اور مریما جانتی تھی کہ آج کلب گھر میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوگا۔ جس میں میٹالا کی تمام فرنگی آبادی جمع ہوگی۔ سیپی اور ڈکیا اس تنہائی سے فسردہ فائدہ اُٹھائینگے!

اُس دن آفتاب جلد ہی سمندر میں ڈوب گیا۔ اور میٹالا پر ایسی تاریکی چھا گئی۔ گویا کسی صندوق میں بند کر دیا گیا ہے۔ اس تاریکی میں کہیں کہیں ننھے ننھے ستارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ مریما جھاڑیوں اور درختوں میں چھپی ہوئی پاپانا کے مکان کی پشت پر جا پہنچی۔ تاکہ ہونے والے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اُس نے چھوٹی سیپی کو کلب گھر اور پاپانا کے مکان کے درمیان چھپا کر رکھا تھا +

مریما نے ستاروں کی مدھم سی روشنی میں دیکھا کہ ایک سایہ دیوار پر بڑھا آ رہا ہے۔ وہ دروازہ کے سامنے آکر رُک گیا۔ اس کے بعد دستک کی آوازیں سنائی دیں۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص کے اندر داخل ہونے پر بند کر لیا گیا +

مریما ہمہ تن چشم انتظار تھی۔ اُس نے اپنے قلب کی تیز دھڑکنیں شمار کی ہونگی۔ کہ وہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ اُس دروازہ کے پاس جا پہنچی جس سے وہ اجنبی مکان میں داخل ہوا تھا۔ اُس نے رسّی کا ایک سرا دروازہ کے دستے سے باندھ کر دوسرا سرا قریب کے ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا۔ اس کے بعد دیا سلائی جلائی۔ یہ روشنی سیپی کے لئے ایک اشارہ تھا جس کے لئے وہ منتظر بیٹھی تھی۔ چنانچہ سیپی اُٹھی۔ اور کلب کی طرف بھاگی جہاں میٹالا کا تعلیم یافتہ اور متمول طبقہ مصروفِ نشاط تھا۔ شراب پی جا رہی تھی۔ اور سگار کے دھوئیں فضا میں خوشبو پھیلا رہے تھے۔ چاند نے اپنی ابرو سمندر سے بلند ہی کی تھی۔ کہ سیپی کی آواز کلب کے برآمدہ میں قہقہوں اور جھگڑوں کے درمیان گونج اُٹھی:-

"پاپانا کے مکان میں چور گھس آیا ہے۔ چور! چور!!"

ایک لمحہ کے بعد پاپانا اپنے مکان کی طرف بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا۔ اُسکے پیچھے پیچھے درجنوں اور آدمی بھی چلے آ رہے تھے۔ پاپانا نے مکان میں داخل ہوتے ہی ڈکیا کی وہ مرمت کی کہ اُسے تمام عمر یاد رہے گی۔ ٹھوکروں، لاتوں اور گھونسوں سے اُس کی تواضع کی گئی۔ اور ڈکیا نے بڑی مشکل سے ایک ناریل کے درخت پر چڑھ کر اپنی جان بچائی +

ڈکیا جانتا تھا۔ کہ پاپانا اس سے زیادہ اور کچھ نہ کریگا۔ کیونکہ اُسنے اُسے بیوی کے ہمراہ ایک میز پر کھانا کھاتے دیکھ لیا تھا۔ ڈکیا نے اس رات اپنی عزت۔ اپنے گلے میں بندھا ہوا طلسم۔ اپنا منہ کالا یا جا الغرض سبھی کچھ کھو دیا +

وہ رات کی خاموشی میں ناریل کے درخت سے نیچے اُترا۔ اور ریت پر منجمد تمام واقعات پر ابتدا سے لے کر انتہا تک غور کرنے لگا۔ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تمام اُس کے جھوٹ بولنے اور آوقا سے تین اشرفیاں بچا لینے کا خمیازہ ہے۔ اب اُس کی جیب میں چاندی کے صرف چند سکّے باقی تھے +

ڈکیا سیدھا گھر پہنچا اور ایک بے فکر نوجوان کی سی گہری نیند سو گیا۔

علی الصبح وہ بیدار ہوا اور گھر سے باہر نکلا تو اُس نے دیکھا کہ دنیا بدل چکی ہے +

اب لڑکیاں علانیہ اُس پر ہنستی تھیں۔ اور اُس کا مذاق اُڑاتی تھیں۔

لڑکے اُس کے پیچھے دوڑتے۔ اُسے دق کرتے تھے۔ اب نہ اُس کی جیب میں رقم تھی۔ نہ گلے میں طلسم تھا۔ رات کا واقعہ ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا۔ اس صورت میں اُس نے اپنی تلخ زندگی پر موت کو ترجیح دی اور سمندر کے کنارے چپکا جا بیٹھا۔ سوچنے لگا کہ سمندر میں کود کر اپنا کام تمام کر ڈالے لیکن بھوک نے گھر واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ اور جب انسان سیر ہو کر کھانا کھالے تو خودکشی کے جذبات ذرا دب جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنا جال لے کر پھر مچھلیاں پکڑنے کے لئے چلا گیا +

کئی دن گذر گئے۔ اس دوران میں مریما اُسے کہیں نہ ملی تھی۔ شہر میں بھی حالت رو بہ سکون تھی۔ لوگ حسب عادت تمام واقعات کو فراموش کر چکے تھے۔ اب اگر لڑکیاں اُس کی طرف توجہ نہیں کرتی تھیں تو ہنستی بھی نہ تھیں۔ چنانچہ اب وہ پھر زندہ انسانوں کی طرح محنت مزدوری سے پیٹ پالنے لگا +

کئی مہینوں کے بعد جب تین چھوٹی اشرفیاں اُس کے پاس جمع ہو گئیں تو وہ پھر اوفا کی طرف روانہ ہوا۔ اس دفعہ بھی مریما اُس کے تعاقب میں تھی۔ اور جب وہ اوفا سے باتیں کر رہا تھا تو مریما گھانس میں دبکی ہوئی سب کچھ سن رہی تھی +

ڈکیا نے کہا:-

"اوفا۔ جب میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ میرے پاس صرف سات چھوٹی اشرفیاں ہیں۔ تو میں جھوٹ بولا تھا۔ اُس وقت میرے پاس دس اشرفیاں تھیں۔ لو یہ تین بقایا موجود ہیں۔ اب مصیبت مجھ پر سے دور کر دو۔ اس سے میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے" +

اوفا نے اشرفیاں اُسے واپس کر دیں۔ اور کہا "جاؤ اس مصیبت کا کچھ خیال نہ کرو۔ اور جس طرح سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہو۔ اسی طرح سے گذار دو۔ اور اُس عورت کی تلاش کرو جو صداقت رکھتی ہے۔ تمہیں اب سچائی کی قوت معلوم ہو گئی ہے۔ اس لئے اس سچی عورت کو تلاش کرو۔ اور مدت العمر خوش رہو"

دوسرے دن ڈکیا غم و اندوہ کی حالت میں سمندر کے کنارے بیٹھا لہریں گن رہا تھا۔ کہ اُس نے دیکھا کہ ایک عورت اُس کی طرف چلی آ رہی ہے۔ جس کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔ یہ مریما تھی اس کے چہرے پر دوسری لڑکیوں کی طرح سرد مہری یا استہزا کی علامات نہ تھیں۔ بلکہ محبت اور صداقت برس رہی تھی +

مریما نے کہا:-

"ڈکیا۔ یہ ہے تمہارا طلسم۔ جو تم سے کھو گیا تھا۔ یہ مجھ سے مت پوچھو کہ میں نے اسے کہاں پایا۔ یا یہ کہ میں کیونکر جانتی ہوں۔ تم نے اسے اوفا سے خریدا تھا" +

ڈکیا نے طلسم لے لیا۔ اور جب مریما کی آنکھوں میں محبت اور صداقت کی روشنی دیکھی تو طلسم کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ کیونکہ اُسے اب اسکی ضرورت نہیں رہی تھی +

چند سال گذر گئے۔ اب جزیرہ ملیشیا کی تمام مچھلی کا اجارہ ڈکیا کے پاس ہے۔ سینکڑوں ماہی گیر مچھلی پکڑ کر اُسکے پاس فروخت کرتے ہیں۔ مریما کی محبت۔ صداقت اور عقل سلیم کی مدد سے ڈکیا بہت بڑا آدمی بن گیا۔ پس انداز کرنیکی وہ عادت جو اُسنے ایک طلسم حاصل کرنے کیلئے اختیار کی تھی۔ مریما کی کفایت شعاری اور خوش انتظامی کیساتھ اُسکی کامیابی کا راز تھی +

(سٹیک پول)

ایڈیٹر

دسمبر نمبر

حسب دستور نیرنگ خیال کا دسمبر نمبر بھی پوری آب و تاب سے شائع ہے۔ یہ دسمبر نمبر کئی رسائل کے خاص نمبروں سے بھی دلچسپ ہے۔ قیمت صرف ۵ر

زیلیکو

(سالنامہ کے لئے براہ راست جرمن سے ترجمہ کیا گیا)

پارسیوں کا عقیدہ ہے۔ کہ دنیا میں خیر و شر دو قوتوں کی حکمرانی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو برّاعظم افریقہ کس قوت کے زیر اثر ہے؟ کیا دنیا کے کسی اور حصے میں بھی وہ خوفناک جانور اور زہریلے سانپ موجود ہیں۔ جو اس سرزمین میں پائے جاتے ہیں؟ کیا یہاں کے وحشی قبائل کی تاریخ خون آشام درندوں اور سفاک بھیڑیوں کی تاریخ نہیں جو اپنے قیدیوں کا گوشت تک کھا جاتے ہیں؟ لیکن تعجب ہے۔ کہ ان بے رحم انسانوں میں بھی کبھی کبھی نیکی۔ دیانتداری صبر و تحمل اور موت سے شریفانہ نفرت کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں اگرچہ شاذ ہیں لیکن ان سے رہ رہ کے خیال ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ آخر انسان ہیں۔ ٹھیک اس طرح سے جیسے کسی خشک اور وسیع صحرا میں دو چار درختوں کے مشاہدے سے مسافر کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ ابھی تک زندوں کی دنیا میں ہے۔

سنہ ۱۷۲۷ء کا واقعہ ہے۔ ساحل گائینا کے قریب جوئیڈا ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس کے دارالحکومت زآبی کے پاس ایک غریب بیوہ رہا کرتی تھی۔ اس کا نام ڈارینا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ جن کو اسنے بڑی محنت سے پالا تھا۔ وہ لوگ جو فطرت کے اس عام عطیے سے بھی محروم ہیں۔ اور اپنے بچوں کو سامان تجارت کی طرح بیچ دیتے ہیں۔ ان کے اندر یہ بات کسقدر عجیب تھی! تینوں بچے نہایت شریف تھے۔ اور ایک دوسرے سے سچی محبت رکھتے تھے۔ بڑے کا نام گوبیرائی تھا۔ منجھلے کا ٹیلوے۔ اور چھوٹے کا زیلیکو۔ وہ اپنی شفیق ماں کی بے حد عزت کرتے تھے۔ وہ بھی اگر زندہ تھی تو محض ان کے لئے۔ ان کا کل سرمایہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی اور مکی کا ایک کھیت تھا جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ ہر روز ان میں سے ایک شکار کے لئے اور دوسرا کھیت میں کام کرنے کے لئے جاتا تھا۔ تیسرا اپنی ماں کے پاس رہتا تھا۔ اس بات پر اکثر جھگڑا ہو جایا کرتا تھا کہ ماں کے پاس کون رہے۔ شام کو یہ لوگ پھر جمع ہو جاتے تھے اور شکار اور کھیت سے جو کچھ میسر آتا تھا۔ اس سے مل کر پیٹ بھر لیتے تھے۔ اس کے بعد بوڑھی ماں انہیں دعائیں دیتی تھی۔ اور وہ دوسرے روز کی محنت اور کام کاج کی فکر میں سو جاتے تھے۔

زیلیکو اکثر شہر جایا کرتا تھا۔ جہاں سے وہ فصل کی نئی نئی چیزیں لاتا تھا۔ جن کو یہ لوگ بڑے دیوتا کی ہیکل میں چڑھا دیتے تھے۔ دیوتا کون تھا؟ ایک بہت بڑا سانپ۔ زہریلا نہیں بلکہ بے ضرر۔ سانپوں کی اس قسم سے جو اپنے زہریلے ہم جنسوں کو کھا جاتی ہے۔ جوئیڈا میں ان کو بڑے احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی یہ کثرت تھی کہ لوگوں کے محلوں اور کھیتوں میں تو درکنار۔ ان کے گھروں اور بستروں میں بھی چلے آتے تھے۔ اس بات کو یہ لوگ ایک مبارک شگون خیال کرتے تھے۔

اہل جوئیڈا میں زیلیکو سب سے زیادہ سیاہ اور سب سے زیادہ مضبوط تھا۔ لیکن سب سے زیادہ محبت کے قابل بھی وہی تھا۔ وہ بڑے سانپ کی ہیکل میں بیریسا کو دیکھ چکا تھا۔ بیریسا وہاں کے سب سے بڑے کاہن فارولہو کی لڑکی تھی۔ اور اپنے حسن و جمال کے لئے جوئیڈا بھر میں مشہور تھی۔ زیلیکو کا دل اس کی محبت میں تڑپتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسکی محبت کا جواب بھی محبت سے دیا گیا۔ بدھ کا سارا دن جو زآبی میں دیوتاؤں کی پرستش اور آرام کے لئے مقرر ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ گذارتا تھا۔ بالآخر اس نے اپنی محبت کا تذکرہ بیریسا سے کر دیا۔ اور اس بے پایاں مسرت کی طرف اشارہ کیا۔ جو دونوں کو باہم زندگی بسر کرنے میں حاصل ہونیوالی تھی۔ بیریسا نے اس بات کو مطلق نہیں چھپایا کہ وہ اس وقت کے لئے بیتاب ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کا باپ اس رشتے کو رضامندی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور ان سے بہت کچھ حسن سلوک کا ارادہ رکھتا ہے۔

تھوڑے ہی عرصے میں شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اور بالآخر وہ دن آگیا۔ جس کے لئے وہ اس ذوق و شوق سے منتظر تھے۔ زیلیکو کی ماں اور اس کے بھائیوں نے جہانتک ہو سکا۔ اپنے غریبانہ جھونپڑے کو آراستہ کیا۔ لیکن ٹھیک اسی روز ڈاہومائی کے طاقتور سردار آؤڈاٹی نے آرڈرا پر حملہ کر دیا۔ آرڈرا کو فتح کرنے کے بعد وہ اس دریا کی طرف بڑھا۔ جہاں سے جوئیڈا کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ شاہ جوئیڈا ایک کمزور انسان تھا۔ اور

زیادہ تر اپنی بیویوں اور ذرا کے زیر اثر تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ سرحد پر کوئی مضبوط فوج بھیجتا۔ اس نے حکم دیا کہ لوگ جسقدر بھی سانپ پکڑ سکیں۔ انہیں دریا کے کنارے چھوڑ آئیں۔ اس کا خیال تھا۔ کہ جو ٹیڈا کے یہ رینگنے والے مبعود اُسے دشمن کے حملہ سے محفوظ رکھیں گے۔ لیکن اسے بہت جلد معلوم ہوگیا۔ کہ آڈ ڈائی کے سپاہیوں نے انہیں جلتی ہوئی آگ میں جھونک دیا ہے۔ اس خیال سے کہ مزید مداخلت بیکار ہوگی۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ ایک غیر معلوم جزیرے میں روپوش ہوگیا۔ ڈاہومائی کا سردار بلا کسی مزاحمت کے زابی میں داخل ہوا۔ اور اپنی قتدری اور کامیابی کے غرور میں اُس نے جس شخص کو دیکھا قتل کر ڈالا۔

تھوڑے بہت لوگ جو اس کی بے پناہ تلوار سے بچ گئے تھے۔ اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ زیلیکو اور اُس کے بھائیوں نے بھی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ جنگل کا راستہ لیا۔ زیلیکو نہیں چاہتا تھا۔ کہ اُس کی ماں کے لئے ذرا سا بھی خطرہ باقی رہ جائے۔ لیکن جونہی اُس نے محسوس کیا۔ کہ وہ آڈ ڈائی اور اُس کے ظالم سپاہیوں کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ ہیریسا کے لئے بیتاب ہوگیا۔ اب اس کے سامنے دو ہی باتیں تھیں۔ یا تو جہاں کہیں بھی ہو ہیریسا سے جا ملے۔ یا اس کی تلاش میں جان دیدے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ زابی روانہ ہوگیا۔ لیکن یہاں اُس نے جلتے ہوئے مکانوں۔ لاشوں کے انبار اور خاک و خون کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہ دیکھا۔ اُس نے زابی کا ایک ایک کونہ چھان مارا۔ لیکن ہیریسا یا فاڈلمو کا کہیں پتہ نہ تھا۔

پانچ روز گذر گئے۔ اور اب زیلیکو کو یقین تھا۔ کہ ہیریسا اور فاڈلمو دونوں شاہ ڈاہومائی کی نذر ہوگئے ہیں۔ نہایت دل شکستہ ہو کر وہ زابی سے واپس لوٹ گیا۔ اس کے افسردہ چہرے۔ اس کی مایوس نگاہوں اور اس کے شدید صدمہ کا حال سُن کر اس کے اہل خاندان کا جی لرز گیا۔ ڈارینا اس کی مصیبت پر رو دی۔ اور نہایت درد بھرے دل سے اسے صبر کی تلقین کرنے لگی۔ لیکن زیلیکو طے کر چکا تھا کہ وہ کچھ کھائیگا نہ پئیگا۔ اور اسی طرح ہیریسا کی یاد میں جان دیدیگا۔ گو بیرائی اور ٹیلوے حیران تھے کہ اس سے کیا کہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس پر نہ سمجھانے کا اثر ہوگا نہ خوشامد کا۔ آخر وہ اسے بوڑھی ڈارینا کے پاس لے گئے۔ جس نے اپنے بیٹے کے غم میں کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ اور اُس سے پوچھنے لگے کہ کیا تم اپنی ماں کو زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتے؟

زیلیکو نے اپنی ماں کی یہ حالت دیکھی تو پریشان ہوگیا۔ اس نے اپنے بھائیوں سے وعدہ کیا۔ کہ میں اپنی ماں کی سلامتی کے لئے ہر ممکن کوشش کرونگا۔ اب وہ جنگل میں اور دور دور تک گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے ایک پوشیدہ وادی میں ایک جھونپڑا تیار کر لیا۔ اور شکار پر گذر کرنے لگے لیکن اب ان کی حالت سے پہلے سے بھی بدتر تھی۔ زابی سے چلتے وقت وہ اپنی تمام ضروری چیزیں وہیں چھوڑ آئے تھے۔ ان کے پاس نہ تیر تھا نہ کمان۔ بھلا یہ تھا کہ وہ اپنی ضروریات کو کیونکر پورا کریں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگل میں تھوڑے بہت پھل موجود تھے۔ لیکن ان کو بندر نہ چھوڑتے تھے۔ اس کے علاوہ یا گھاس تھی یا پانی۔ اگر کبھی اتفاق سے انہیں کوئی چھوٹا سا پرند مل جاتا تھا۔ تو وہ ان کے لئے کافی نہ ہوتا تھا۔ اب پھر فاقہ کشی کی نوبت آئی۔ انکی بوڑھی ماں کی حالت دن بدن بگڑتی جاتی تھی۔ اس طرح تین مہینے گذر گئے۔ اور حالات میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا۔ تنگ آکر تینوں بھائیوں نے باہم مل کر مشورہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس طرح سے کہ ان کی والدہ کو خبر نہ ہو۔ گو بیرائی کی بچہ بڑ تھی۔ کہ ان میں سے کوئی ایک اپنے آپ کو ساحل کے کسی کارخانے میں بیچ ڈالے۔ اور اس طرح جو رقم حاصل ہو۔ اس سے ضروریات کی چیزیں خرید لی جائیں۔ ٹیلوے اور زیلیکو اس خوفناک تجویز کو سُن کر خاموش ہوگئے۔ ان کے لئے یہ بات کسقدر تکلیف دہ تھی۔ کہ وہ جیتے جی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ بالآخر ٹیلوے نے درد بھری آواز میں کہا "ہم میں سے اس کے لئے کون تیار ہے؟" گو بیرائی نے کہا۔ اس کا فیصلہ آسان ہے۔ ہم تین خیر مساوی پتھروں کی مدد سے قرعہ اندازی کرینگے جس کے حصے میں سب سے چھوٹا پتھر آیا۔ اُسی کو یہ مصیبت برداشت کرنا ہوگی"

زیلیکو ابتک خاموش تھا۔ جب گو بیرائی اپنی بات ختم کر چکا۔ تو اُسنے کہا "تم نے مجھے مرنے سے روکا تھا۔ محض اس لئے کہ میں اپنی ماں کی خدمت کروں۔ تم کو چاہئے کہ اپنے الفاظ پر قایم رہو۔ تمہو قرعہ اندازی بیکار ہے۔ قسمت بہت پہلے فیصلہ کر چکی ہے کہ یہ مصیبت مجھے برداشت کرنا ہوگی"

ٹیلوے اور گو بیرائی نے انتہائی کوشش کی۔ کہ وہ اپنے بھائی کو اس خوفناک ارادے سے باز رکھیں۔ لیکن زیلیکو اپنی بات پر قایم رہا۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ اُس نے دھمکی دی۔ کہ اگر انہوں نے زیادہ اصرار کیا۔ تو وہ تنہا چلا جائیگا۔ بالآخر طے پایا کہ گو بیرائی اپنی بوڑھی ماں کی خبر گیری کرے۔ اور ٹیلوے اور زیلیکو دونوں زابی روانہ ہو جائیں۔ جہاں ٹیلوے زیلیکو کو فروخت کر ڈالے۔

اور کھانے پینے کی ضروری چیزیں خرید کر فوراً واپس چلا آئے، یہ فیصلہ کر کے دونوں بھائی زیلیکو سے چمٹ گئے۔ ان کی آنکھیں فرطِ محبت سے اشکبار تھیں۔ مگر زیلیکو خاموش تھا۔ اس کے چہرے سے رہ رہ کے اس امر کا اظہار ہوتا تھا۔ کہ وہ آنے والی مصیبت کو نہایت استقلال اور جوانمردی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن جب وہ اپنی بوڑھی اور شفیق ماں سے رخصت ہوا ہے۔ تو اس نے کسقدر ضبط اور حوصلے سے کام لیا ہوگا! اس نے آخری مرتبہ اپنی ماں کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور کہنے لگا "ہم اپنے اخراجات کی تلاش میں زابی جا رہے ہیں۔ کل واپس آجائیں گے"۔ نیکدل ڈارنیا اس فریب میں آگئی۔ لیکن کسی نامعلوم خطرے کے احساس سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دیوانہ وار ان کے پیچھے دوڑنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ اس کی نظروں سے غائب ہو گئے۔

دونوں بھائی ـــــ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں زیادہ بدقسمت کون تھا ـــــ ایک ہی روز میں زابی پہنچ گئے۔ اب ہنگامۂ جدال و قتال ختم ہو چکا تھا۔ اور شہر میں ہر طرح سے امن و امان قائم تھا۔ ڈاہومانی کے سردار کی خواہش تھی کہ تجارت کو فروغ ہو۔ اس غرض سے وہ بہت سے دلندیزی اور فرانسیسی تاجروں کو زابی میں بلوا چکا تھا۔ اور اہلِ جونیڈا جن کی جائدادیں اور املاک سب ضبط ہو چکی تھیں۔ غلاموں کی طرح بازاروں میں بکتے تھے۔ ٹیلوے کو بھی بہت جلد ایک دلندیزی سوداگر مل گیا جو زیلیکو کے لئے ایک سو ڈالر ادا کرنے کے لئے تیار تھا۔ قریب تھا کہ سودا ہو جائے۔ لیکن اتنے میں انہوں نے نفیریوں کا شور سنا۔ قصرِ شاہی کے قریب ایک افسر اعلان کر رہا تھا کہ جو شخص اس مجرم کو زندہ گرفتار کریگا جس نے کل رات حرمِ شاہی میں بسر کی اور صبح کے وقت پہرہ داروں سے بچکر بھاگ نکلا۔ اُسے سونے کی خالص چار سو اشرفیاں انعام دی جائیں گی۔

زیلیکو نے اس اعلان کو سنا تو اس نے ٹیلوے کو اشارا کیا۔ کہ وہ اسے فروخت کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔ وہ اسے ایک طرف لے گیا۔ اور ایک فیصلہ کن انداز میں کہنے لگا "تم مجھے بیچنا چاہتے ہو۔ اس لئے کہ میں فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ میں اپنی ماں پر اپنی جان قربان کر دونگا۔ ایک سو ڈالر کی قلیل رقم جو تمہیں اس سفید آدمی سے ملیگی۔ تمہاری ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوگی۔ لیکن خالص سونے کی چار سو اشرفیاں تمہیں اور ڈارنیا کو ہمیشہ کے لئے تمام فکروں سے آزاد کر دینگی۔ ہمیں بہت جلد اس انعام کو حاصل کر لینا چاہئے۔ تم فوراً میری مشکیں کس دو۔ اور مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو احمق نہ بنو۔ میں بھی ایسا ہی سمجھدار ہوں۔ جیسے کہ تم ہو۔ ۔ ۔ ۔ میں خوب جانتا ہوں۔ میری سزا کسقدر خوفناک ہوگی۔ لیکن میں اس کا اندازہ کر چکا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ مجھے ایک گھنٹے تک اس کی اذیت برداشت کرنا ہوگی۔ لیکن تم جانتے ہو۔ جب میری والدہ نے مجھے جنا ہے تو اُسے اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیف ہوئی تھی"۔

خوف اور رنج کے مارے ٹیلوے کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا وہ بے اختیار ہو کر زیلیکو کے پاؤں پر گر گیا۔ اور ڈارنیا اور ہیریسا کا نام لے کر بڑی عاجزی سے التجا کرتا رہا۔ کہ وہ اپنے خوفناک ارادے سے باز آجائے۔ لیکن زیلیکو ہنسا اور کہنے لگا "تم کس کا نام لیتے ہو! ہیریسا تو مدت ہوئی مجھ سے چھن چکی ہے۔ مجھے جسقدر جلد ہو سکے اس سے مل جانا چاہئے میری موت سے میری ماں کو تمام مشکلات سے نجات ملیگی۔ اور تم ہمیشہ کے لئے دولت مند ہو جاؤ گے۔ میں غلامی کی زندگی پسند نہیں کرتا۔ اگر تم نے مجھے روکا۔ تو میں خود بخود چلا جاؤنگا۔ اور تم اس سونے سے بھی محروم رہ جاؤ گے جو میری فروخت سے تمہیں حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میری بدقسمت ماں کی موت کا گناہ بھی تمہاری گردن پر رہیگا"۔

زیلیکو کے ایک ایک لفظ سے اُس کے دلی عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ ٹیلوے نے محسوس کیا۔ کہ اب اس سے مزید گفتگو کرنا بیکار ہوگی۔ اس نے حرف بحرف اپنے بھائی کی تمام ہدایات کی متابعت کی اور بادلِ ناخواستہ اسے رسیوں میں جکڑ دیا۔ اس کے بعد وہ اسے مجرموں کی طرح دھکیلتا ہوا شاہی محل کی طرف لے گیا۔

محافظوں نے اُسے روکا۔ لیکن جب اس نے اپنی اشکبار آنکھوں سے آنسو خشک کر کے بتلایا کہ وہ مجرم کو لے کر حاضر ہوا ہے۔ تو وہ اسے بادشاہ کے حضور میں لے گئے۔ ڈاہومانی کا سردار زر و جواہر میں ملبوس۔ ایک تخت پر بیٹھا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر اس کا وزیرِ اعظم اور سپہ سالار مودب بیٹھے تھے۔ ان کے ارد گرد مقربین کا حلقہ تھا۔ جن میں سے بعض نے اپنی فتوحات کے اظہار کے لئے مقتول سرداروں کے دانتوں کے ہار پہن رکھے تھے۔ بہت سی عورتیں بندوقیں اٹھائے پہرہ دے رہی تھیں۔ بادشاہ کے قریب ہی سونے کے برتنوں میں ہر قسم کی شراب موجود تھی۔ ٹیلوے نے اپنے ملک کے رواج کے مطابق بادشاہ کو سجدہ کیا اور کہنے لگا:-

"دنیا کے سردار! میں تیرے حکم کی تعمیل میں یہاں آیا ہوں تاکہ۔۔۔"
ٹیلوے کی زبان بند ہوگئی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ خاموش تھا۔ اپنے بھائی کی اس حالت کو دیکھ کر زلیکو بول اُٹھا +

"ڈاہومائی کے بادشاہ! تم اپنے سامنے جس شخص کو رسّیوں میں بندھا دیکھتے ہو۔ یہ وہی مجرم ہے جو کل رات تمہارے حرم میں داخل ہوا۔ اور صبح کے وقت بچکر نکل گیا۔ یہ شخص جو مجھے اپنے ساتھ لایا ہے میرا دوست ہے۔ مجھے اس پر اعتماد تھا۔ میں نے اس سے کل رات کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ میری مدد کریگا۔ لیکن آج صبح جب کہ میں سو رہا تھا۔ اس نے موقعہ پاکر مجھے رسّیوں میں جکڑ دیا۔ اور اب انعام کے لالچ میں کشاں کشاں تمہارے پاس لایا ہے" +

بادشاہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا البتہ اس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے ایک افسر کو حکم دیا کہ وہ مجرم کو سپاہیوں کے حوالے کر دے۔ اس کے بعد اس نے ٹیلوے کو بُلایا۔ اور اپنے ہاتھ سے انعام دے کر اسے رخصت کر دیا +

تھوڑی دیر میں دو گڑھے تیار کئے گئے۔ تاکہ اہل جوئیڈا کے رسم و رواج کے مطابق مجرم کو بدکاری کی پاداش میں خوفناک سزا دی جائے۔ ان میں سے ایک گڑھا اس کے لئے تھا اور دوسرا بادشاہ کی اس عصمت فروش ملکہ کے لئے جس کے ہاں مجرم نے ساری رات بسر کی تھی۔ جب گڑھے تیار ہوگئے۔ تو ان میں سے ایک میں کٹی ہوئی لکڑیاں چُن دی گئیں اور ان کے ساتھ ہی لوہے کی ایک سلاخ نصب کر دی گئی۔ تاکہ ملزم کو اسی کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ دوسرے گڑھے کے ارد گرد جس میں ایک بلّی گاڑ دی گئی تھی۔ بادشاہ کی تمام عورتیں کھڑی تھیں۔ ان کے سروں پر کھولتے ہوئے پانی کے مٹکے تھے۔ جن کو وہ ڈھول اور نفیریوں کے شور کے درمیان اپنی بدقسمت بہن پر گرانے والی تھیں +

تمام محل کھچا کھچ تماشائیوں سے بھرا تھا۔ فوج کے اسلحہ کی جھنکار سے اچھا خاصہ شور بپا ہو گیا تھا۔ ایک طرف کوہن کھڑا تھا۔ تاکہ مرنے والوں کو آخری مرتبہ دیوتاؤں کی طرف متوجہ کر سکے۔ جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو آمنے سامنے سے دونوں مجرموں کو لایا گیا۔ زلیکو نہایت مطمئن نظر آتا تھا۔ اور گردن جھکائے بیباکی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سپاہی اس کو لوہے کی سلاخ کے پاس لے گئے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اُسے اُس کے ساتھ باندھ دیتے۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ دیکھ تو لے کہ اس کے ساتھ کون مر رہا ہے۔ اس نے گردن اُٹھائی اور اپنے سامنے نظر ڈالی۔ لیکن اُس نے دیکھا؟ دوسرے گڑھے کے پاس بریسا پابزنجیر کھڑی تھی۔ زلیکو کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ قریب تھا کہ وہ زمین پر گر جائے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ زندگی کے ان آخری لمحوں میں اس کے لئے یہ بات کسقدر اذیت دہ تھی۔ کہ وہ بریسا کو ایک بدکار عورت کی طرح مزا دیکھے۔ کون بریسا جس کو وہ اپنا دل و جان نذر کر چکا تھا۔ اور جس کی جدائی میں وہ موت کو دعوت دے چکا تھا! کیا بریسا بیوفا تھی؟ کیا واقعی اُس نے اس مقدس عہد کو توڑ دیا تھا۔ جو دیوتاؤں نے اس کے اور اس کے خاوند کے درمیان قائم کر دیا تھا؟ بظاہر ان باتوں کے لئے اب کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بریسا کو مجرموں کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ زلیکو کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ اسنے اپنی ماں کو یاد کیا اور کہنے لگا "میری مہربان ماں اب میں صرف تیری یاد میں مرونگا" +

ٹھیک اُس وقت۔ بریسا نے بھی زلیکو کو پہچان لیا۔ وہ بھاگ کر کاہن کے پاس پہنچی اور آسمانوں اور پہاڑوں اور تمام خوفناک دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہنے لگی "یہ نوجوان بالکل بے گناہ ہے۔ خدا کے لئے اسے بچا" کاہن یہ سُنکر حیران ہو گیا۔ وہ فوراً بادشاہ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ جو شخص گرفتار ہوا ہے۔ وہ اصلی مجرم نہیں +

بادشاہ اپنے تخت سے اُٹھا اور خود بریسا کے پاس آیا۔ غصّے اور رنج کے مارے اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ ایک نہایت ہی خوفناک لہجے میں اُس نے کہا "بریسا! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میں تجھے اپنی ملکہ بناؤنگا لیکن تم نے میری محبت کو نفرت سے دیکھا اور مجھ سے شادی کرنا پسند نہ کیا۔ باوجود اس کے میں نے تجھے زندہ رہنے دیا۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اب جھوٹ بول کر اس نوجوان کو چھڑا لوگی؟ کیا تمہیں اس نوجوان سے محبت نہیں ہے؟ اور اگر یہ غلط ہے تو بتاؤ کل شب کو تمہارے پاس کون آیا تھا؟"

"ڈاہومائی" کے بادشاہ" بریسا نے کہا" میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ سُنو مجھے یہ الفاظ دُہراتے ہوئے ذرا بھی ڈر معلوم نہیں ہوتا۔ میں تسلیم کرتی ہوں۔ کہ کل شب کو ایک شخص میرے پاس

آیا اور صبح تک وہیں رہا۔ میں خوب جانتی ہوں وہ کون تھا۔ لیکن میں اس کا نام نہیں بتلاؤنگی۔ تم مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے ہو۔ میں مرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن ان خوفناک لمحوں میں صرف ایک درخواست کرونگی اور وہ یہ کہ تم اس بے گناہ شخص کا خون اپنی گردن پر نہ لو۔ بس مجھے صرف یہی کہنا ہے"۔

بیریسا کے الفاظ ایک تیر کی طرح بادشاہ کے دل میں سے نکل گئے۔ وہ خاموش ہوگیا۔ اور گردن جھکا کر سوچنے لگا کہ کیا کرے۔ اس کا دل نہ چاہتا تھا۔ کہ کسی بے گناہ آدمی کا خون بہائے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ شاید بیریسا کو اس نوجوان سے محبت ہے۔ وہ بے قابو ہوگیا۔ اس نے حکم دیا کہ گڑھوں میں آگ روشن کردی جائے۔ جلاّد اس حکم کی تعمیل کے لئے آگے بڑھا۔ عورتوں کے خاموش حلقے میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ لیکن ٹھیک اُس وقت ایک بوڑھا آدمی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور بادشاہ کے پاؤں پر گر گیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور اس کے گرد آلود چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا" مجرم میں ہوں۔ میرا نام فارولمو ہے۔ میں یہاں کی سب سے بڑی ہیکل کا کاہن تھا۔ لوگوں نے مجھ سے میری بیٹی چھین لی اور اسے تمہارے پاس لے آئے۔ میں اُسکی تلاش میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ کل رات میں پہرہ داروں کی نظر بچا کر تمہارے محل میں پہنچا۔ اور چاہتا تھا کہ موقعہ ملے تو اپنی بیٹی کو لیکر بھاگ جاؤں۔ لیکن میں اس کوشش میں ناکام رہا۔ پہرہ داروں نے مجھے دیکھ لیا۔ بڑی مشکل سے میں اُن سے جان بچا کر بھاگا۔ اب میں حاضر ہوں۔ اور اپنی بیٹی کیساتھ مرنے کو تیار ہوں۔ میں اگر جیتا تھا تو اس کے لئے۔ اب میری زندگی بیکار ہے"۔

فارولمو اپنی بات ختم کر چکا۔ تو بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ زیلیکو کی رسیاں کھولدی جائیں۔ اُس نے اسے اپنے پاس بُلایا۔ اور کہنے لگا" تم موت کے لئے کیونکر تیار ہوگئے؟" زیلیکو نے ایک ایک کرکے اپنی تمام مصیبتوں کو بیان کردیا۔ بیریسا اور فارولمو زیلیکو کی باتیں سُن رہے تھے۔ اس کی ہمت و استقلال اور اس کے ایثار و قربانی کے خیال سے ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ جو بادشاہ کے دل پر بھی زیلیکو کی المناک باتوں کا بے حد اثر ہوا۔ حاضرین میں سے کوئی شخص نہ تھا جو اس کی داستان مصیبت کو سُن کر بیقرار نہ ہوگیا ہو۔

اب ڈاہومانی کا بادشاہ ایک فرانسیسی سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا" تمہارے مہذب ملک میں تو اس قسم کی مثالیں بیشمار ہونگی۔ تمہاری رائے میں اس نوجوان کی قیمت کیا ہوگی؟"

فرانسیسی نے جواب دیا" دس ہزار ڈالر"! ڈاہومانی کے بادشاہ نے حکم دیا کہ دس ہزار ڈالر بیریسا کو دیدیئے جائیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اُسے زیلیکو کو خرید لے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ ان سے شادی کرلے۔

دوسرے روز فارولمو نے اپنی بیٹی کی شادی زیلیکو سے کردی اور اس سے اگلے روز وہ ڈاہومانی کے پاس تھے۔

نیازی

ہندوستان کی خصوصیات

ذیل کے نقشہ سے مختلف ممالک کی شرح اموات فی صدی معلوم ہوسکتی ہے:- نیوزیلینڈ ۹/۰- آسٹریا ۱۰/۰- نیوفنڈلینڈ ۱۰/۶- امریکہ ۱۲/۹- ناروے ۱۳/۲- سویڈن ۱۳/۲- برطانیہ ۱۴/۲- بلجیم ۱۵/۲- جرمنی ۱۶/۲- ہندوستان ۳۰+

نوزائیدہ اطفال کی شرح اموات فی صد حسب ذیل ہے:- انگلستان ۵/۵- فرانس ۸/۵- بلجیم ۱۰/۸- جرمنی ۱۰/۸- ہسپانیہ ۱۴/۵- اٹلی ۱۶/۱- جاپان ۱۶/۶- ہندوستان ۲۰+

ہندوستان کا ایک ایک صوبہ دنیا کی بڑی سے بڑی قہار سلطنتوں کے برابر ہے۔ مثلاً برما۔ آسٹریا ہنگری سے۔ بمبئی۔ اسپین سے۔ پنجاب۔ بلوچستان ممالک متوسط۔ راجپوتانہ۔ جزائر برطانیہ سے بڑے ہیں +

۳۲۶۸۰ ہندوستانی قیدخانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور بھیک مانگنے والے اور بیکاروں کے شرمناک طبقہ میں ۳۳۱۸۷۰۰ افراد ہیں +

چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر ہندوستان کی خاص خاص ریاستوں کی تعداد ۱۴ ہے +

شبیر مارہروی

دسمبر ۱۹۲۷ء

پشیمان

(جی۔ ڈی مانپانت کا ایک افسانہ)

خدا جانے کتنی بار طوفان آئے اور کتنے نفیس نفیس مکان تباہ و برباد ہوئے لیکن یہ دونوں بوسیدہ جھونپڑے جو سامنے دکھائی دے رہے ہیں اپنی پرانی شان کو لئے ہوئے اب تک قایم ہیں۔ ان جھونپڑوں میں کل چار متنفس ہیں جو ایک ساتھ رہنے سہنے کے علاوہ کھیتی باڑی کا کام بھی مل جل کر کرتے ہیں +

ان کی زندگی امن و سکون کی راحت سے مالا مال ہے۔ انہیں تو یہ بھول کر بھی خیال نہیں آتا کہ کسی دن وہ واقعات بھی پیدا ہوں گے جو ہمیں ایک دوسرے سے الجھنے پر آمادہ کر دیں گے۔ وہ شب و روز محنت سے کام لیتے ہیں۔ پھر بھی وہ راندۂ روزگار ہیں۔ اور ان کا مدار زندگی آلو اور معمولی سی روٹی پر ہے۔ جن لوگوں کی قسمت میں محنت و مشقت لکھی ہوتی ہے وہ اکثر کڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ رونا دھونا بے سود ہے۔ تقدیر کا لکھا اٹل اور انمٹ ہے +

ماہ اگست کے ایک خوشگوار اور پُر کیف دن کو ایک گاڑی اس طرف آنکلی۔ اس گاڑی میں ہنری اور اُس کی بیوی سوار تھی +

میڈم ٹوک کے بچے سڑک پر کھیل رہے تھے +

ہنری کی بیوی نے گاڑی سے جھانک کر کہا:۔ "ہنری! دیکھو یہ بچے کس قدر خوبصورت حسین اور البیلے ہیں ——— کاش کہ!! ہمیں بھی ایک ایسا ہی بچہ مل جائے ———"

یہ سن کر ہنری کا رنگ فق ہو گیا۔ ایک لمحہ کے بعد گاڑی ان جھونپڑوں سے بہت دور نکل گئی +

میڈم ٹوک نے دل ہی دل میں کہا:۔

"امیروں کے واسطے اسباب تعیش و تنعم کی فراوانی ہے۔ لیکن ایک نعمت کا نہ ہونا ہمیشہ اُن کی طبیعت میں تنغص و اضمحلال پیدا کر دیتا ہے" +

دوسرے ہفتے وہی گاڑی پھر اس طرف آنکلی۔ اب کے ہنری کی بیوی ان بچوں کے لئے مٹھائی کا رومال بھر کر لے آئی۔ پھر متواتر کئی ہفتوں تک انکا اس طرف آنا معمول ہو گیا +

ایک دن میڈم ٹوک روٹی پکا رہی تھی۔ اور اُس کی لڑکی آلو چھیل رہی تھی۔ ٹوک اوزار درست کر رہا تھا۔ کہ ہنری اور اُس کی بیوی ہاتھوں میں ہاتھ دئے جھونپڑے میں در آئے۔ ان کا داخل ہونا تھا کہ وہ اکبارگی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر کرسیاں اٹھا کر ان کے سامنے لا رکھیں۔ میڈم ٹوک نے خاطر تواضع کے طور پر سیب کا عرق لا کر انہیں پینے کے لئے دیا +

ہنری کی بیوی نے اطمینان کی گہری سانس لیکر کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اُسکے جذبات و امیال میں ہیجان پڑ گیا۔ آخر بڑی مشکل سے جذبات پر قابو پا کر کہا:۔

"مجھے تمہارے بچے سے بیحد اُنس و محبت ہے۔ میرے کوئی اولاد نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تیرے بچے کو متبنیٰ بنا لوں۔ کیا آپ میری یہ درخواست منظور کر سکتی ہیں ———؟"

میڈم ٹوک اور اُس کا خاوند حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے +

ہنری کی بیوی نے یہ درخواست دوبارہ پیش کی۔ ٹوک نے آگ بگولہ ہو کر جواب دیا:۔

"یہ قطعاً نہیں ہو سکتا؟" پھر ہنری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا:۔

"میرے دل کا سہارا چارلٹ! ہمارا اکلوتا لڑکا ہے۔ ہمیں اُس سے جس قدر محبت ہے۔ اس کا تذکرہ فضول ہے ———!"

ہنری نے بات کاٹ کر جواب دیا:۔

"میری بیوی کی درخواست ابھی صراحت طلب ہے۔ اگر ہم نے چارلٹ کو متبنیٰ بنا لیا۔ تو اس کو اعلیٰ تعلیم دینے کے ذمہ دار ہم ہوں گے۔ اگر ہمارے کوئی اولاد ہوئی تو وہ اس کے ساتھ برابر کا حقدار ہوگا۔ ورنہ وہ ہماری جائداد کا وارث قرار پائیگا۔ ہاں بیس سال کی عمر کے بعد ہم سے علیحدہ ہونا چاہے گا تو بیس ہزار فرانک اس کو تجارت کے لئے دیدیئے جائیں گے" +

میڈم ٹوک نے گلوگیر آواز میں جواب دیا:۔ "میں اپنے لخت جگر کو بیچنا نہیں چاہتی!"

یہ سُن کر ہنری کی بیوی پر حزن و ملال کی گہری کیفیتیں طاری ہوگئیں۔ اور ہنری کی طرف رُخ کر کے بولی:- ہنری! ہنری!! کیا وہ نہیں مانتے؟ پھر آہ کھینچکر زار زار رونے لگی +

وہ کچھ اس طور سے روئی کہ ان دہقانوں کا بھی دل بھر آیا +

ہنری نے مضطرب ہو کر کہا:- "یہ مراعات صرف چارلٹ تک محدود رہیں گی۔ بلکہ سوفرانک نہیں بھی ماہانہ دیا جائیگا!"

ٹوک نے میز پر ہاتھ مار کر جواب دیا:-

"کچھ بھی ہو چارلٹ کو بیچا نہیں جا سکتا!"

ہنری کی بیوی نے خاوند کے قدم لے کر کہا:- "ہنری! تاہم خدا نہیں میری خاطر راضی کیجئے۔ چاہے جس طور بھی معاملہ ٹھیرے۔ ٹھیرائیے ——"

کوتاہ اندیش میڈم ٹوک نے برافروختہ ہو کر کہا:- "ان سرمایہ دار لوگوں نے بچوں ایسی نایاب و گرانمایہ نعمت کو بازار کا سودا سمجھ رکھا ہے کہ معاملہ ٹھیراتے پھرتے ہیں +

محترمہ! یہ بہت بُرا ہے کہ ہم خدا کی بخشی ہوئی نعمتِ غیر مترقبہ کو زر و مال کی خاطر بیچ دیں۔ آپ لوگ ہماری مفلسی اور تہیدستی سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھو تمہارا خاوند خاموش سا ہو گیا ہے۔ غالباً اُس نے اپنی حماقت کا اندازہ کر لیا ہے۔ —— کرم فرما کر ہمارا جھونپڑہ چھوڑ دیجئے"

ہنری کی بیوی نے مایوس ہو کر کہا:- "آج پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا —— آؤ واپس چلیں" +

میڈم ٹوک نے بگڑ کر کہا:- "تشریف لے جائیے۔ تم انسانی لباس میں ایک شیطان سے بھی بڑھ کر ہو۔ دھن دولت کا لالچ دے کر کنگال اور قلاش لوگوں سے اُن کے لال خرید لینا چاہتے ہو" +

پھر وہ روٹی پکانے میں مصروف ہو گئی۔ ہنری اور اُس کی بیوی ٹکٹکی جھونپڑے سے نکل ہی رہے تھے۔ کہ انہیں ایک موٹی موٹی اور جادو بھری سیاہ آنکھوں والا لڑکا نظر آیا۔ ہنری کی بیوی نے ٹھٹک کر پوچھا:- "یہ کس کا لڑکا ہے؟"

ٹوک نے گرج کر کہا:- "یہ ہمارے پڑوسی جین ولین کا لڑکا ہے۔ قریب کا جھونپڑا ان کا ہے۔ ان سے جا کر بات چیت کیجئے" —— پھر نفرت و استحقار سے ناک سکوڑ کر کہا:- "میں نہیں سمجھتا کہ کوئی معقول آدمی آپ سے اس قسم کی بات چیت کرنے کا بھی روادار ہو ——؟"

(۲)

جین کے ماں باپ آجکل ایک مخمصے میں تھے۔ وہ اس کے مستقبل کا خیال کر کے مضطرب سے ہو جاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دور اندیش اور زمانہ ساز بھی تھے۔ اب تو ضروریات زندگی نے مجبور اور قطعاً مجبور کر رکھا تھا کہ وہ ہنری کی شرائط مان لیں۔ ورنہ مستقبل قریب میں انہیں بہت بُری طرح اس کا خمیازہ کھینچنا پڑتا +

ہنری کی بیوی نے کہا:- "جین طباع اور ذہین ہے۔ اگر اس کو اعلیٰ تعلیم اور تربیت نہ دی گئی تو بہت ممکن ہے کہ اسی پر مدت العمر کبت و ادبار کی گھٹائیں چھائی رہیں"

آخر جین کی ماں شیشے میں اُتار لی گئی اور اُس نے خاوند سے کہا:- "آپ کی کیا مرضی ہے؟"

جین ولین نے مشتعل ہو کر جواب دیا:- "تمہاری شفقت مادری کو کیا ہوا ہے کہ یہ سوال کر کے تم شرمائی بھی نہیں۔ ایسا تو قطعاً نہیں ہوگا"

ہنری نے کہا:- "یہ لیجئے ایک سوفرانک۔ آئندہ ہر ماہ سوفرانک ملا کریں گے"

جین ولین تذبذب میں پڑ گیا۔ بیوی نے پھر پوچھا:- "کہو تمہاری کیا مرضی ہے؟"

اُس نے مدھم آواز میں جواب دیا:- بارہ سوفرانک تو ہمارے مصارف کو متکفل نہیں ہو سکینگے"

ہنری کی بیوی نے کہا:- "اچھا سالانہ پندرہ سوفرانک ملا کریں گے"

جین ولین نے کہا:- "بہتر ہوگا کہ اس معاملہ کا قانونی طور پر فیصلہ کرا لیا جائے"

ہنری اور اُس کی بیوی نے خوشی کی پھولی ہوئی سانسوں میں جواب دیا:- "یہ معاملہ کل ٹھیرا لیا جائے گا"

صبح یہ معاملہ عدالت میں دو گواہوں کے ذریعہ سے طے کر لیا گیا +

جین کو جدا کرتے وقت اُس جھونپڑے میں قطعی طور پر غم و الم کا کوئی مظاہرہ نہ ہوا۔ صرف پُرنم آنکھوں سے اُسے الوداع کیا گیا۔ گاڑی آگے بڑھی۔ ٹوک اور اُس کی میڈم نے اپنے جھونپڑے سے سر نکال کر دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیوں کہ انہیں یقین تھا۔ کہ کوئی معقول آدمی انکے جھانسے میں نہیں آئیگا۔ جب جین کے ماں باپ اپنے جھونپڑے میں جانے

لگے تو میڈم ٹوک نے کہا:۔

"کمبخت! دھن دولت کے بھوکے یہ تم نے کیا کیا ہے؟ ——— ہم نے چارلٹ کے بیچنے سے انکار کر دیا تھا ——— غالباً شفقت مادری اور ابوی حب دنیا سے اُٹھ گئی ہے! ———"

(۳)

اُن سینوں میں جہاں محبت اور خلوص کا سمندر لہریں لیتا تھا۔ اب وہاں بغض و حسد کی آگ بھڑکنے لگی۔ ٹوک اور اُس کی میڈم نے ایذا رسانی کا سلسلہ برابر جاری رکھا +

جب جین ولین اور اُس کی بیوی کہیں سے گزرتے تو لوگ اُنگلیاں اُٹھا اُٹھا کر آوازے کستے کہ ان سنگدلوں نے اپنا لال زرومال کے لالچ میں آکر بیچ دیا ہے۔ سوسائٹی کا فرض ہے کہ ان سے انتقام لے۔ جین کے متعلق پھر کوئی خبر نہ آئی۔ لیکن موعودہ طور پر روپیہ ملتا رہا۔ وہ راحت اور آسودگی جو ماں باپ اپنی اولاد کو گود میں لے کر محسوس کرتے ہیں جین کے والدین میں نہ رہی۔ اور وہ رہ رہ کر پچھتانے لگے۔ لیکن میڈم ٹوک کو امن و سکون کی راحت میسر تھی۔ اور وہ پڑوسیوں سے فخر و مباہات سے کہتی:۔

"میں نے دھن دولت پہ لات ماردی اور چارلٹ آنکھوں کے تارے اور نور کے پارے کو جدا کرنا پسند نہیں کیا" +

اب یہ شیخیاں اور تعلیاں صرف ٹوک تک محدود نہ رہیں۔ بلکہ اب خود چارلٹ بھی اپنے ہمجولیوں سے ایک انداز تفاخر سے کہنے لگا:۔

"میرے ماں باپ نے مجھے بیچنا پسند نہ کیا۔ ورنہ ہم متمول اور سب سے بڑے سرمایہ دار ہوتے" +

چارلٹ اپنی ماں سے کئی گنا زیادہ منہ پھٹ اور مغرور تھا۔ وہ برابر جین ولین کی ایذا رسانی اور آوازہ کسی پر تلا رہا +

کئی سال گذر گئے۔ جین ولین کی مالی حالت بہت اچھی ہوگئی۔ اور وہ مالا مال ہوگئے۔ لیکن ٹوک کی مالی حالت درست نہ ہوسکی۔ اس کا چھوٹا لڑکا لڑائی پر چلا گیا۔ اور منجھلا لڑکا مر گیا۔ اب کام کاج کا سارا وبال چارلٹ کے کندھوں پر آپڑا۔ اُس کو سارے کنبے کی کفالت کرنی پڑی +

جین ولین سے ان کی عداوت اور خصومت اُسی انداز پر بدستور قائم رہی۔ چارلٹ کی بیسویں سالگرہ کا دن تھا کہ اتفاقاً ایک گاڑی ادھر آنکلی جس میں ایک کڑیل جوان بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کی پوشش فوق البھڑک اور اس کے اطوار سنجیدہ تھے۔ گاڑی ان جھونپڑوں کے قریب آکر رُکی۔ پھر وہ جوان ایک سپید بالوں والی عورت کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر جین ولین کے رسوئی خانے میں داخل ہوا +

جین نے فرط محبت سے اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا:۔ "سلام"

حیرت و حسرت کے مارے بوڑھے نے اپنی نگاہیں جین کے چہرہ پر جما دیں اور رقت خیز آواز میں بولا:۔

"تم میرے بیٹے جین ہو نا؟"

بوڑھی نے کھانا پکانا چھوڑ دیا اور ہکلاتی ہوئی آواز میں بولی:۔

"تم یقیناً میرے اکلوتے لڑکے جین ہی تو ہو؟"

نوجوان نے آگے بڑھ کر انہیں چوما اور معانقہ کیا +

پھر یہ بوڑھے۔ جین کو اپنے ہمراہ لے کر مختلف مکانوں اور مختلف لوگوں کے پاس گئے۔ اور اس کا تعارف کیا۔ جین کی وضع قطع سے یہ بھول کر بھی گمان نہ ہوتا تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے +

دھن دولت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کھوئی ہوئی عزت و حرمت دوبارہ برقرار کر دیتی ہے۔ یہی ماجرا جین ولیم سے پیش آیا۔ وہ دشمن اور پڑوسی جو اُسے منہ لگانا تو درکنار۔ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اب دوستی کا دم بھرنے لگے۔ اور تو اور ٹوک بھی اُسے ٹوپی اُچھال کر سلام کرنے لگا۔ کہتے ہیں یہ آئے دن کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ مفلسی اور افکار و آلام آدمی کے بل نکال دیتے ہیں لیکن چارلٹ کے سینے میں رشک و حسد کی آگ برابر بھڑکتی رہی۔ وہ کھچا اور تنا رہا۔ جب جین خوش و خرم والدین کے ہمراہ دریچہ کے قریب آیا تو چارلٹ غصے اور نفرت کے سبب آپے سے باہر ہوگیا۔ اور انہیں سلام کا جواب تک نہ دیا +

شام کو جب کھانا کھانے کے لئے گھر آیا۔ تو اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا اور ماں باپ سے کہا:۔ "کیا ہی اچھا ہوتا تم مجھے بیچ ڈالتے۔ اور یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ اب زرومال کی فراوانی اور بھرمار ہوتی" +

ٹوک نے خشمناک ہو کر کہا:۔

"روپیہ ہاتھ پاؤں کا میل ہے۔ یاد رکھ کہ محبت زرومال سے زیادہ قیمتی ہے" +

چارلٹ نے کہا:۔ "آپ حقیقی معنوں میں میرے بدخواہ تھے۔ ورنہ آج میری ہستی دنیا میں آفتاب بنکر چمکتی" +

بوڑھی ماں یہ سُن کر رونے لگی۔ اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور کہا:۔

"مہر مادری دنیا میں مشہور ہے۔ ماں بچوں کے کارن اپنے سکھ کو تج دیتی ہے۔ اور ان کا پیٹ بھرنے کے لئے کئی کئی دن فاقوں مرتی ہے۔ اور کھیتوں میں خون پسینہ ایک کر کے اُن کے لئے سامانِ خورونوش مہیا کرتی ہے کاش کہ مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم اپنی تن آسانی کے لئے ہم سے آنکھیں پھیر لو گے تو میں معمولی سے مشاہرہ پر تجھے ضرور بیچ ڈالتی"

چارلٹ نے اٹھ کر کہا:۔ "اگر میری بود و باش یہاں کوئی دن اور رہی تو میری بیچارگی کی دشواریاں اور بھی بڑھ جائیں گی ——— اور میں پچھتاتے پچھتاتے جان دیدونگا ——— اچھا۔ خدا حافظ! ———

الوداع!!

وہ جھونپڑے سے نکل کر یا ہر آیا تو معلوم ہوا کہ دوسرے جھونپڑے میں جن کی واپسی پر رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔ سیڈم ٹوک کی چلاتے چلاتے گلوگلی بند ہو گئی۔ اور ٹوک مایوس ہو کر انسانی فطرت کے متعلق سوچنے لگا +

چارلٹ نے جھونپڑے کا دروازہ بند کر دیا اور پھر کہیں رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا ———

صادق

امرود

مسٹر ڈیوہرسٹ نے پروفیسر ڈاکٹر نکلسن کے ترجمہ انگریزی مثنوی مولانا روم کا تبصرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ڈاکٹر نکلسن ہی امرود کو PEAR سے تعبیر کرنے میں مستثنیٰ ہے۔ ڈیوہرسٹ کا خیال ہے کہ GUAVA اصل میں امرود سے مترادف ہے اسے علم نہیں۔ ممکن ہے GUAVA کا مولانا روم کو علم ہو جس نے تیرہ صدی عیسوی میں ایک صدی کا قبل امریکہ دریافت ہونے کے مثنوی کو تصنیف کیا۔ امرود کا اصل نام بغیر کسی شک و شبہ کے PEAR ہے نہ کہ GUVA اموت امرود۔ امرود فارسی لفظ کی تین صورتیں ہیں۔ اور تینوں ہی فارسی لغت کی کتب میں ملتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عام مشہور و معروف پھل ہے۔ بعض کہتے ہیں اسے عربی میں کشتری کہتے ہیں اور کشتری ہی PEAR ہے۔ امرود ایرانیوں میں عام طور پر مشہور ہے حالانکہ ترکی زبان میں عام طور پر ارمود استعمال ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض ترکی کتب لغات میں ارمود ملتا ہے جیسا کہ ترکی سے فارسی میں امرود۔ نیز ترکی میں PEAR اس کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں ہیں میکسیکو میں GUAVA (GUAYABA) اور جدید عربی میں پھل کو جوافہ کہتے ہیں جو GUAVA کی عربی شکل ہے۔ یہ محض اُردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں امرود GUAVA سے مراد ہے۔ اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ کیونکہ GUAVA ہندوستان میں بالکل ہندی ہو گیا ہے جبکہ PEAR نے کبھی ترقی نہیں کی شکل اور رنگ میں GUAVA کی مشابہت ناشپاتی (ناخ) سے فوراً امرود کا تصور (جام) کے بدلے دلاتی ہے۔ قیاس غالب ہے کہ جنوبی ہند میں ایرانیوں اور مغلوں کی بدولت ہندی ہو گیا ہے۔ اسی طرح لفظ فارسی شیر انگریزی کے دونوں LION اور TIGER کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں LION نہیں ہے۔ محض تمیز کے لئے LION کے لئے شیر ببر کر دیا ہے۔ فارسی میں بابر کے معنی کچھ اور ہیں اسی طرح اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں +

(مائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل لندن جولائی ۱۹۲۶ء)

محمد عبداللہ اسلامیہ کالج

تین دھمکیاں

(آسٹریا کے مشہور ادیب اور افسانہ نگار آرتھر شنٹ زلر کا ایک افسانہ

(از جناب چودھری محمد رمضان صاحب بی اے علیگ)

صبح کے دھندلکے میں ایک نوجوان فلک بوس پہاڑیوں کی طرف جانیوالے راستے پر چل رہا ہے۔ اس کا دل فیرخانی ترنم کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ وہ کئی گھنٹے ہموار راستے پر بلا تکان چلتا رہا۔ قریب تھا کہ وہ ایک سنسان جنگل میں گھسنے کے لئے پہلا قدم اٹھائے۔ کہ دفعتاً اس نے ایک عجیب پُراسرار آواز سنی جو نہ تو قریب ہی معلوم ہوتی تھی اور نہ دور:۔

"اس پُرخطر جنگل میں سے مت گذرو۔ ورنہ تم قتل کے مرتکب ہوگے"۔

نوجوان دیر تک مبہوت کھڑا رہا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ لیکن جب یقین ہوگیا کہ اس جنگل میں کوئی ذی روح موجود نہیں۔ تو اس نے خیال کیا کہ اس کا مخاطب کوئی غیر مرئی جسم ہے۔ نوجوان کی فطری جرأت خطرے کے احساس سے بے نیاز تھی۔ اس نے اس پریشان کن آواز کی کچھ بھی پرواہ نہ کی اور مردانہ وار جنگل میں سے گزرنے لگا۔ اب وہ زیادہ حساس نظر آتا تھا۔ اور ہر معمولی سی آہٹ پر اس خیال سے چوکنا ہوجاتا۔ کہ شاید اسے کسی خوفناک حریف سے جس نے اس کو موہوم خطرے سے آگاہ کیا ہے۔ اچانک نبرد آزما ہونا پڑے۔ وہ گھنے جنگل کو طے کرکے کھلے میدان میں بلا مقابلہ جا پہنچا۔ اور اس پار جنگل کے آخری سایہ دار درخت کے نیچے سستانے لگا۔ نوجوان بظاہر آرام کر رہا تھا لیکن اس نے نظریں وسیع وادی کے پار اس سربفلک چوٹی پر گاڑ دی تھیں۔ جو اس کے سفر کی آخری منزل تھی +

لیکن ابھی یہ نوجوان اٹھا ہی تھا کہ اس نے پھر وہی مخفی آواز سنی لیکن پہلے سے زیادہ درد مندانہ لہجہ میں تھی:۔

"نوجوان خبردار۔ اس وادی سے مت گزرو۔ ورنہ اپنے وطن کی بربادی کا باعث بنوگے"!

نوجوان کا غرور اس آواز کے سننے سے مانع تھا۔ وہ ایسے مبہم الفاظ پر مسکرا دیا۔ جو ایک بے معنی دھمکی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔ تاہم اس کے قدم نامعلوم اضطراب کی وجہ سے اور بھی تیز ہوگئے۔ اور جب وہ منزل مقصود کے سامنے پہاڑی کے دامن میں کھڑا تھا۔ اور شام کی کثیف دھند فضا کو غبار آلود کر رہی تھی نوجوان نے ابھی پتھریلی سطح پر قدم رکھا ہی تھا کہ پھر تیسری دفعہ وہی آواز تکلمانہ لہجہ میں سنائی دی۔ وہ نہ تو نزدیک تھی اور نہ دور۔ تاہم خوفناک تھی:۔

"آگے مت بڑھو ورنہ تمہاری موت یقینی ہے"۔

نوجوان نے لاپرواہی سے قہقہہ لگایا۔ اور بلا پس وپیش اپنے رستے پر قدم بڑھاتے چلا گیا۔ اونچا پہاڑی راستہ اگرچہ تاریک ہو رہا تھا۔ مگر اس کے بازو اور سینہ ہمت سے کشادہ ہو رہے تھے۔ اور بڑھتا ہوا پہاڑ کی بلند چوٹی پر تمسخرانہ انداز میں جا پہنچا۔ اس وقت سورج کی آخری کرنیں اپنی شعاعوں سے اس کے چہرہ کو روشن کر رہی تھیں +

"میں منزل مقصود پر پہنچ گیا ہوں"۔ نوجوان نے فاتحانہ مسرت سے کہا۔

"اے نیک یا بد روح۔ اگر یہ آزمائش تھی۔ تو میں نے میدان جیت لیا۔ میرے ہاتھ کسی کے خون سے رنگین نہیں ہوئے۔ میرا وطن امن کی نیند میں مدہوش ہے اور میں اپنے علی الرغم زندہ ہوں۔ بہرحال خواہ تم کوئی بھی ہو میں تم پر غالب رہا۔ کیونکہ میں نے تجھے نہیں مانا۔ جو کچھ میں نے کیا وہی ٹھیک تھا"۔

ایک وہشتناک اور مہیب آواز پہاڑیوں میں گونجی جو قریب ہی معلوم ہوتی تھی +

"نوجوان تم غلطی پر ہو"۔

نوجوان الفاظ کی سختی کو محسوس کرنے لگا۔ اور پہاڑ کی چوٹی پر لیٹ گیا تاکہ تھکان کو دور کرسکے۔ وہ ان آوازوں کے مذاق پر خود بخود ہنسنے لگا +

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بلا ارادہ کسی کو قتل کر چکا ہوں"۔

"تم نے لاپرواہی سے ایک ننھے سے جاندار کو پاؤں کے نیچے روند ڈالا ہے"۔ ہولناک گرج نے جواب دیا۔ لیکن نوجوان نے لاپرواہی سے کہا:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے نہ تو کوئی خبیث اور نہ ہی پاک روح خطاب کر رہی تھی۔ بلکہ کوئی سخرہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کہ ایسی ارواح بھی ہم فانی انسانوں

کے ساتھ مذاق کیا کرتی ہیں"۔

مگر دوبارہ وہی آواز پہاڑ کی بلندیوں پر زرد روشنی میں زلزلہ فگن انداز میں گونج اٹھی:۔

"تو کیا تم وہ انسان نہیں رہے جس کا دل آج ہی صبح کائنات کے ہر ذرّہ کی حرکت پر رقص کر رہا تھا۔ کیا تم اب اتنے ہی مردہ دل ہو گئے ہو کہ ایک کیڑے کی موت سے متاثر نہیں ہو سکتے"۔

"کیا تمہارا یہی مطلب تھا" نوجوان نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اس طرح تو میں سیکڑوں ——— نہیں ہزار دفعہ مجرم ہوں۔ اُن ہادی انسانوں کی طرح جنہوں نے بغیر ارادے کے لاتعداد معصوم اور نازک کیڑوں کو روندڈالا ہے"۔

"لیکن اس خاص قتل سے تمہیں روکا گیا تھا۔ کیا تجھے پتہ ہے۔ کہ کارخانۂ اسباب وعلل میں اُس کیڑے کی حیثیت کیا تھی"۔

نوجوان نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا:۔

"نہ تو مجھے اس کا علم تھا۔ اور نہ آسانی سے معلوم کر سکتا تھا۔ تجھے متنبہ ہونا چاہئے کہ اس طرح دخت نور دی کرتے ہوئے میں نے ٹھیک ایک قتل کیا ہے (حالانکہ اسی طرح میں بہت سے قتل کر سکتا تھا) جس سے کہ تم مجھے روکنے کے خواہاں تھے۔ لیکن زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ میں اثنا دسفر میں وطن کی تباہی کا محرک کیسے ہوا ہوں۔ اس مہنے کو سمجھنے کے لئے بے تاب ہوں"۔

"کیا تم نے وہ زرق پوش مکھی دیکھی تھی۔ جو ایک دفعہ تمہارے دائیں بازو پر بیٹھ بھڑ ابھڑا رہی تھی"۔ آہستہ سے آواز آئی:۔

"میں نے بہت سی مکھیاں دیکھی تھیں۔ اور وہ بھی جس کا تم ذکر کر رہے ہو"

"بہت سی مکھیاں! آہ تمہارے سائس کے طوفانی رَو میں کتنی ہی مکھیاں اپنے راستے سے بھٹک گئیں۔ لیکن جس برق وش مکھی کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں۔ وہ مشرق کی طرف چلی گئی۔ چلتے چلتے شاہی باغ میں بارُ پر بیٹھ گئی۔ اُس مکھی کے پیٹ سے ایک زہریلا کیڑا پیدا ہوگا۔ جو آئندہ سال موسم گرما کی ایک دوپہر کو نوجوان ملکہ کی مرمریں گردن پر رینگنے لگیگا۔ ملکہ خواب سے چونک اُٹھیگی۔ اس کا دل بیٹھ جائیگا۔ اور دہشت سے پہلے قبل از وقت پیدا ہو کر مر جائیگا۔ اسلئے بجائے مستقبل وارث کے جس کی ہلاکت کے تم باعث ہوئے ہو۔ بادشاہ کا بھائی سریر آرائے سلطنت ہوگا۔ جو ظالم حاکم ثابت ہوگا۔ مظلوم رعایا مایوسی کے گہرے گڑھے میں دھکیل دی جائے گی۔ آخر کار بادشاہ اپنے بچاؤ کی خاطر ملک کو جنگ کی خوفناک آتش میں دھکیل دیگا۔ اس طرح تمہارا ملک تباہ ہو جائیگا۔ اس فعل کا ذمہ دار تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تمہارے سانس نے اس زنبور مکھی کو مشرق کی طرف دھکیلا۔ وادی کو طے کر کے وہ شاہی محل میں پہنچی۔ اور ایک خوفناک انتشار کی بنیاد ڈالی +

"اے غیر مرئی روح! میں ان حوادث کے امکان سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ جبکہ اس خاکدان ارضی پر قانون اسباب وعلل نافذ ہے۔ ایک واقعہ دوسرے واقعہ سے مستخرج ہوتا ہے۔ ایک سبب دوسرا نتیجہ۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ معمولی اور حقیر حادثہ عظیم الشان حوادث عالم کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس پیشینگوئی کو باور نہ کرنے کے لئے یہ کافی وجہ ہے کہ تیسری دھکی جو مجھے دی گئی تھی کہ پہاڑ پر چڑھنا میرے لئے موت کا پیغام ہوگا۔ پوری نہیں ہوئی +

"جتنے قدم تم پہاڑی پر اوپر چڑھ آئے ہو۔ اگر دوبارہ انسانی چہرہ دیکھنے کی خواہش کرو تو ناگزیر نہیں انہیں قدموں واپس جانا ہوگا۔ کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے؟"

نوجوان اب مذبذب حالت میں تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے خیال کیا۔ کہ بہتر یہی ہے کہ نیچے اُتر جائے۔ لیکن اس خیال سے کہ ایک تاریکی اسکا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور کرن کی روشنی کے سوا وہ ایسے خطرناک راستے پر دوبارہ گامزن نہیں ہو سکتا۔ اور اس خیال سے بھی کہ دوسرے دن تازہ دم ہو کر مضبوط ارادہ کے ساتھ جادۂ پیما ہو۔ اسی تنگ پہاڑی راستے پر تازہ دم گرنے والی۔ اور طاقت بخشنے والی نیند کے انتظار میں لیٹ گیا۔ لیکن خیالات کے ہجوم سے وہ پریشان تھا۔ نیند اس سے کوسوں دُور تھی۔ اس نے نیم باز آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ خوف وہراس سے ہر رگ حیات مرتعش ہو گئی۔ پہاڑ کا عریاں اور بے رونق دامن اس کے سامنے تھا۔ یہی حیات ثانیہ کی شاہراہ تھی۔ وہی نوجوان جو ابھی تک اپنے راستے کے متعلق پوری طرح متیقن تھا۔ شک وشبہ کے طوفان میں یہ نکلا۔ خوف وہراس کا بوجھ ہر لمحہ زیادہ اور تکلیف دہ ہو رہا تھا۔ اب اُس نے تاریک رات میں پڑے رہنے پر آگے بڑھنے کو ترجیح دی۔ اور اس کے سوا چارہ کار بھی نہ تھا۔ وہ دوبارہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ خطرناک راستے کو فتح کرنے کے لئے۔ دن کی روشنی کا انتظار کئے بغیر چلنے لگا۔ لیکن مشکل سے ہی اس نے تاریکی میں قدم رکھا ہوگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ابدی ملعون ہو چکا ہے۔ اس کا پیمانۂ حیات چھلکنے کو ہے۔ اور قسمت کا آخری فیصلہ قریب ہے +

نوجوان بلند آواز سے چلاّ اُٹھا:۔

"اے طلسمی روح! جس نے مجھے تین دفعہ تنبیہ کی اور جس کی میں نے ہر بار تکذیب کی۔ اے روح اب کہ میں تیرے سامنے تجھے غالب سمجھکر سر نیاز خم کرتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ تو مجھے ہلاک کر ڈالے۔ مجھے بتا کہ تو کون ہے؟"

وہی آواز غیر معین بُعد اور قرب سے سُنائی دی:۔ "کوئی فانی انسان آج تک مجھے نہیں سمجھ سکا۔ میرے بہت سے نام ہیں۔ اوہام پرست مجھے تقدیر کہتے ہیں۔ جُہلا میرا نام **اتفاق** رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو عقلمند کہلاتے ہیں میں اُن کے نزدیک میں ہی وہ **سرمدی قوت** ہوں جو ابتدا سے ہے اور انتہا تک رہیگی"۔

"تو میں اس آخری لمحۂ حیات میں بھی تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں"

نوجوان موت کی تلخی محسوس کرتے ہوئے چلّایا۔ "اگر حقیقتاً وہی طاقت ہو جو اوّل سے آخر تک ہے۔ تو کیا یہی قسمت میں تھا کہ وہی ہوتا جو منشاء قدرت تھا۔ —— کہ میں جنگل سے گزرتا۔ وادی عبور کر کے وطن پر تباہی لاتا۔ اور موت کی تلاش میں اس پہاڑی پر چڑھ آتا —— یہ تمام حوادث باوجود تمہاری ممانعت کے رونما ہوئے۔ لیکن اگر تمہاری ایک تنبیہ بھی مجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ تو مجھے تین دفعہ پیغام دینے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن افسوس! قسمت!! مجھے اس آخری وقت میں بھی ایک ایسا بودا سوال کرنا ضروری تھا"۔

نوجوان کو ایسا جواب ملا جو زلزلہ انگیز اور ہیبتناک تھا۔ پُر اسرار مسلسل بلند قہقہے سُنے گئے۔ جن کی صدائے بازگشت نامحدود فضا میں آسمانوں سے ٹکرائی۔ اس نے الفاظ سُننے کی کوشش کی۔ لیکن زمین تھرّا اُٹھی۔ اُسکے پاؤں کے نیچے سے مٹی نکل گئی۔ وہ سیلوں کی گہرائیوں میں گر پڑا۔

چودھری محمد رمضان

مایوسِ تمنّا

(ایک افسانہ)

(محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ کے قلم سے)

والدہ حمیدہ۔ بیٹی چار بجنے والے ہیں اُٹھ کر ہنڈیا چڑھا دو۔ بھیا صبح بھی روکھی روٹی کھا کر مدرسہ گیا ہے۔ رات کو تو دال مل جائے۔

نسیمہ۔ (سوئی کپڑے سے نکال کر ڈورا ڈالتے ہوئے) اماں جان دال گھر میں نہیں ہے۔ ورنہ میں صبح ہی نہ پکا دیتی۔ میرے نسیم نے چٹنی سے روٹی کھائی۔ مگر مجبوری تھی۔ آپ کے پاس پیسہ بھی نہیں ہے۔ جلدی جلدی کر کے یہ قمیض تیار کر رہی ہوں جا کر بیگم صاحب کو دیدونگی اور چوتی لا کر دال نہیں گوشت منگایا جائیگا۔ نسیم غریب نے آٹھ دن سے سالن نہیں چکھا۔

والدہ حمیدہ۔ بیگم صاحب ابھی پیسے نہ دینگی۔ ہفتوں سلائی دینے میں دیر کیا کرتی ہیں۔ اپنی ہمسائی سے آدھ پاؤ دال اُدھار مانگ لاؤ۔

نسیمہ۔ اماں وہ نہ دینگی مجھکو شرم آتی ہے۔ ابھی ابھی چار آنہ لاتی ہوں۔ یہ قمیض اُن بیگم صاحبہ کی نہیں ہے۔ اُن کی دیورانی جو پرسوں ہی آئی ہیں۔ اُن کی خادمہ کی قمیض ہے۔ وہ فوراً دیدینگی۔

والدہ حمیدہ۔ (ٹوپی ہاتھ سے رکھ کر) اونہہ مجھے کسی سے اُمید نہیں۔ میں ہی جا کر دال اُدھار لاتی ہوں۔ ٹوپی میں ذرا سا کام رہ گیا ہے۔ یہ ہاتھ سے چھوٹا تو کل پر جا پڑیگا۔ اس لئے نہ اُٹھتی تھی۔ گیہوں بھی ختم ہو گئے ٹوپی تیار ہو جائے ملائن سے دو روپے مل جائینگے۔

نسیمہ۔ ٹھہریئے اماں جان۔ ابھی پیسے ملے جاتے ہیں۔ صرف ایک بٹن ٹانکنا باقی ہے۔ مانگنا نہیں چاہئے شرم کی بات ہے۔

والدہ حمیدہ۔ (برہم ہو کر) تم امیر زادی کے لئے شرم ہے۔ میں غریب ہوں مجھکو کوئی شرم نہیں۔ اور یہ کوئی بھیک نہیں ہے۔ کل کو دال دیدی جائیگی۔ یہ کہہ کر اُٹھیں۔ ٹوپی۔ سوئی۔ کلابتون کی لچھی پٹاری میں رکھی۔ اور پاندان کھولکر پہلے تمباکو تازہ کیا یعنی ذرا سی پان کی کتر پر کتھ چونہ لگا کر جٹکی تمباکو کی ڈالی اور منہ میں رکھ کر پھر چادر لیتی ہوئی کھڑکی سے ہمسائی کے گھر چلی گئیں۔ نسیمہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اُس نے جلدی سے بٹن ٹانک قمیض تہہ کی اور اور جوتی پہن برقعہ اوڑھا۔ قمیض ہاتھ میں لئے دروازہ سے نکل گئی۔

گلی سے نکلکر نسیمہ سامنے والی سڑک سے گذرتی ہوئی ایک شاندار چھاٹک میں داخل ہوئی۔ پہلے بڑے میاں دربان نے ٹوکا۔ جب اُس نے اپنا نام بتایا

تو جانے کی اجازت مل گئی۔ اور وہ محل میں داخل ہو گئی۔ صحن باغ کی روشوں پر ہوتی ہوئی مکان کے اُس حصہ میں پہنچی جہاں بیگم صاحبہ کی دیورانی صاحبہ فروکش تھیں چبوترے پر چڑھ کر اُس نے منہ سے نقاب اُلٹا اور دالان میں چلی گئی وہاں اُس وقت بیگم صاحبہ تو نہ تھیں۔ نہ اُن کی وہ قمیض والی خادمہ۔ مگر ایک نوجوان آرام کرسی پر لیٹا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اُس کو آتے دیکھ کر صاحبزادہ صاحب نے اخبار رکھ کر دریافت کیا کہ "کون ہے کیا کام ہے" لڑکی نے شرماتے ہوئے جواب دیا کہ "بیگم صاحب کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ یہ کپڑا دینا ہے"

صاحبزادہ۔ بیٹھو بیگم صاحبہ ابھی آتی ہیں +

نسیمہ۔ وہ خادمہ نرگس کہاں ہے۔ اُسی کا کپڑا ہے +

صاحبزادہ۔ وہ ابھی آتی ہے۔ چاء پینے گئی ہے۔ بیٹھ جاؤ +

بٹھانے پر زور دینے لگے۔ نسیمہ کو پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہیں فرش کے کونے پر آنکھیں نیچی کر کے بیٹھ گئی۔ اس محل والوں سے نسیمہ اور اُس کی والدہ کا پردہ نہ تھا۔ باہر سب سے پردہ کرتی تھیں۔ اتنے میں خادمہ چاء کی کشتی لیکر آ گئی اور اُن کے آگے رکھدی۔ نسیمہ نے جلدی سے قمیض دیدی اور چلنے لگی۔ مگر سلائی کی ضرورت تھی +

صاحبزادہ۔ ٹھہرو پیسے لیکر جانا بیگم صاحب آتی ہیں +

نرگس۔ ہاں ذری بیٹھ جاؤ۔ ابھی بیگم صاحب سلائی دیدینگی" +

یہ سُنکر وہ غریب پھر بیٹھ گئی۔ نرگس قمیض لیکر خوشی خوشی چلتی ہوئیں +

صاحبزادہ۔ لڑکی تمہارا گھر کہیں دور ہے۔ جو اسقدر جلدی ہے جانے کی ؟

نسیمہ۔ حضور گھر تو دور نہیں ہے۔ مگر شام ہو رہی ہے کام کا وقت ہے +

صاحبزادہ۔ وہ ابھی آتی ہیں۔ چند منٹ ٹھہر جاؤ۔ تم کس کی بیٹی ہو؟ کیا اسی محلہ میں رہتی ہو؟

نسیمہ۔ جی حضور۔ یہیں سڑک کے اُس پار گھر ہے۔ مرحوم مرزا عزیز بیگ کی لڑکی ہوں۔ اب والدہ اور میں سلائی کرتی ہیں +

صاحبزادہ۔ کوئی بھائی نہیں ہے ؟

نسیمہ۔ بھائی پڑھتا ہے۔ ابھی بچہ ہے۔ سواء خدا کے اور کوئی بسر اوقات کا سہارا نہیں ہے۔ ذرا جلدی پیسے عنایت ہو جائیں تو چل کر کھانا پکاؤں +

صاحبزادہ (جیب سے بٹوہ نکال کر ایک روپیہ پھینکتے ہوئے) یہ لو اگر جلدی ہے تو کل پھر آنا۔ ہماری اَنّا کو کچھ سلوانا ہے +

نسیمہ۔ حضور میرے پاس بارہ آنہ نہیں ہیں۔ آپ چوٹی دیجئے +

صاحبزادہ۔ اوہو ایک قمیض کی سلائی صرف چوٹی ؟ بہت کم ہے۔ تم غریب نے محنت کی۔ یہی لے لو +

نسیمہ۔ (ذرا بگڑ کر) حضور میں اتنا نہیں لے سکتی۔ بیگم صاحب کو آنے دیجئے۔ اتنے میں بیگم صاحب آ گئیں اور صاحبزادہ نے اُن کو دیکھتے ہی میز پر سے روپیہ اُٹھا لیا۔ جو ابھی لڑکی نے واپس کر دیا تھا۔ بیگم کو نسیمہ نے اُٹھ کر سلام کیا اور اُنہوں نے فوراً ہی بیٹے سے کہہ دیا کہ "میاں [illegible] جیب میں کچھ پیسے ہوں تو اس لڑکی کو دیدو۔ میرے پاس اس [illegible] زیرگاری نہیں ہے۔ یہ بھابی جان (صاحب خانہ) کی سلائی [illegible] والی ہے۔ اُن کو خبر ہو گئی تو خود ہی دیدینگی۔ اور یہاں سب نوکرنیوں کے جاڑے کے کپڑے سلوانے ہیں۔ میں اُن پر بار ڈالنا نہیں چاہتی" +

صاحبزادہ۔ امّی جان ہمارے پاس بھی روپیہ ہی ہے +

اماں جان۔ اچھا دیدو اور کپڑے سیئے گی اُس میں مجرا ہو جائے گا۔ نسیمہ کل صبح آنا اور سلائی دینی ہے" یہ حکم دیکر وہ چاء پینے بیٹھ گئیں اور نسیمہ برقعہ اُٹھا کر سلام کرتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے بعد پانچ ہی منٹ میں صاحبزادہ صاحب بھی باہر چلے گئے۔ وہ ابھی آہستہ قدم اُٹھاتی پھاٹک میں ہی پہنچی تھی کہ یہ بھی پہنچ گئے۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے اپنا ملازم چھوکرا بھیجدیا کہ اس کا مکان دیکھکر آؤ۔ بلانا ہوا تو جا سکو گے" خود اپنے کمرے میں جا کر سوچنے لگے۔ کہ آخر اس غریب سلائی کرنے والی لڑکی کا مجھ کو کیوں اتنا خیال ہو گیا؟ کیوں جی چاہتا ہے کہ وہ سامنے ہی بیٹھی رہے۔ بیشک وہ حسین ہے۔ اُس کی ہر ادا دلکش آنکھوں میں خاص اثر رکھتی ہے۔ مگر ہے کون ؟ ایک غریب ذلیل گھر کی سلائی کرنے والی لڑکی۔ مجھے اس کا خیال بھی نہ کرنا چاہئے۔ یہ تو حد درجہ کی بداخلاقی ہے کہ گھر میں آنے والی شریف لڑکیوں پر پرکھ کی نظر ڈالی جائے۔ مگر میرے اختیار سے باہر ہے۔ میرا دل اُسی طرف کھنچا جاتا ہے۔ صرف چند منٹ کی ملاقات میں میرا خیال اسقدر قابل ملامت ہو گیا۔ میں ایسا ذلیل ہوں۔ آخر تین دن سے چچا جان کے گھر آیا ہوا ہوں۔ اُن کی لڑکیاں کسقدر حسین۔ خوش خلق اور تعلیم یافتہ ہیں۔ مگر میرے دل پر اُن کا کچھ اثر نہیں۔ درآنحالیکہ اُن میں سے ایک کے ساتھ عمر بھر کی وابستگی کی تجویزیں سُن رہا ہوں۔ اور وہ ہیں بھی اسی قابل۔ بھلا وہ اوصاف اور صفات کے ہم رتبہ ہیں۔ اُن کا ذرا خیال نہیں۔ اور اس غریب کمین نیچے درجہ

کی لڑکی کا دل پر نقش ہو گیا۔ اگر میں ایسا ہی ذلیل و خوار ہوں اپنی مغلانی کی لڑکی جمیلہ گھر ہی میں کس قدر خوبصورت ہے اس کو پسند کرتا"+

آج تمام شب وہ اسی خلجان میں مبتلا رہا۔ کوئی وجہ کشش و دلچسپی نظر نہ آتی تھی سمجھ سے باہر تھا کہ میرا دل کیوں میرے اختیار میں نہ رہا۔ دوسرے دن صبح ہی نو بجے وہ کپڑے لینے آ گئی۔ اس وقت صاحبزادہ صاحب اُسکے انتظار میں اماں جان کے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ اور وہ اپنی جٹھانی کے ساتھ دوسری طرف چاء پینے گئی ہوئی تھیں جونہی سفید برقعہ نظر آیا وہ کرسی پر انتہا نسیمہ نے آگے آکر ادب سے سلام کیا۔ اور بیگم صاحبہ کو دریافت کیا +

صاحبزادہ۔ بیٹھو وہ اُدھر ہیں کسی کو بھیجکر بلواتے ہیں۔ لڑکی تمہارا نام کیا ہے۔ تم نے سلائی سیکھی۔ اگر کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھا ہوتا۔ تو کسی زنانہ مکتب میں نوکری کر سکتیں۔ جو سلائی سے زیادہ معزز پیشہ ہے۔ ہمیں تم ایسی شریف و خوش شکل باتمیز لڑکی کو یوں مصیبت میں دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے +

نسیمہ۔ میں اپنا حالِ زار کیا عرض کروں کہ کون ہوں۔ کس حالت میں ہوں اور کسقدر رنج میں گھلی جاتی ہوں۔ کچھ نوشت و خواند کی قابلیت تو مجھ میں ہے۔ مدرسہ میں پڑھا ہے۔ مگر ہمارے خاندان میں۔ نوکری کرنا عیب ہے۔ مگر مزدوری کرنا اور بھیک مانگنا کوئی بُرا نہیں۔ بلکہ شریفانہ حیاداری کا یہی طریقہ یا ذریعہ معاش ہے"+

اس کے ایسے اچھے خیالات اور پڑھے لکھوں کی سی زبان سُن کر بہت خوشی اور تعجب بھی ہوا +

صاحبزادہ۔ بیشک ہندوستان کی بہت ہی افسوسناک حالت ہے تم پڑھی لکھی ہو۔ یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی۔ رات تمہاری اماں بھی آئی تھیں جس وقت وہ آئیں میں چچی جان (صاحبِ خانہ) کے پاس بیٹھا تھا۔ اُن کی طرزِ گفتگو سے تو یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ کچھ پڑھی ہونگی معاف کرنا۔ نہ یہ ہی یقین آتا تھا کہ تمہاری والدہ ہیں۔ وہ بیچاری ایک مفلوک الحال غریب پردہ نشین معلوم ہوتی تھیں۔ مگر تم اُن سے بہت اونچی ہو جس کے دو ہی وجوہ خیال میں آسکتے ہیں۔ ایک تمہاری حسین صورت۔ دوسری تعلیم اور اُس کا اثر۔ مگر ایسی والدہ کی تربیت سے اتنے اچھے خیالات؟ حیرت ہے۔ کاش تم محل میں چھوڑ دی جاؤ اور والدہ صاحبہ تمہاری تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیں جیسے کہ ہماری انّا کی لڑکی پڑھ رہی ہے۔ علاوہ اُردو کے وہ خاصی فارسی اور انگریزی بھی جان گئی ہے +

نسیمہ۔ یہ آپ کی قدردانی ہے۔ میں غریب تو اُسی غریب عورت کی لڑکی ہوں۔ ہاں کچھ کتابیں ضرور دیکھی ہیں جن کی مدد سے بول لیتی ہوں۔ میرا اپنا ارادہ تھا کہ یہاں کے اسی محلہ کے زنانہ مدرسے میں ملازمت کر لوں۔ "پرائمری سکول" ہے۔ مجھ کو سیکنڈ معلّمہ مقرر کیا جا رہا تھا۔ مگر والدہ نے اجازت نہ دی۔ (اور روکر) مگر اس کی اجازت ہے کہ باوجود اس سن و سال کے میں سلائی لیتی دیتی گھر گھر پھروں۔ ایک برقعہ میرا محافظ و پردہ رکھنے کا ذریعہ کافی ہے۔ آہ آہ" نیچی آنکھیں کر لیں اور آنسو فرش پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اوّل تو یونہیں.... صاحبزادہ کے دل میں اُسکی محبت و ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اب ایسے اچھے خیالات سُنکر اور بھی دل قدردان ہو گیا پھر ایسی دلکش حسینہ کا رونا ؎

کون دیکھ یہ سکتا ہے کہ حسیں روتا ہے
ہو بناوٹ کا بھی رونا تو قلق ہوتا ہے

اور یہ تو اپنے تباہ حال پر خون جگر کے قطرے بہا رہی تھی۔ باوجود بہت ضبط و استقلال سے بیٹھے رہنے کی کوشش کرنے کے بھی ان سے نہ بیٹھا گیا اور اُٹھکر اُس کے قریب آ گئے۔ جھک کر اُس کا سر اوپر کو اُٹھاتے ہوئے کہنے لگے:۔

"اوہو بس بس میں نے تم کو بہت صدمہ پہنچایا۔ معاف کرو اور اسقدر رنج نہ کرو۔ میں ہر ممکن امداد کو تیار ہوں۔ بشرط اپنی والدہ کو راضی کر لو۔ ہماری بیگم صاحب (والدہ) بہت رحمدل ہیں۔ تم کو بیٹی کی طرح رکھینگی"+

نسیمہ۔ ایسا ناممکن ہے۔ میں محل میں رہنے کی نہ ہمت کر سکتی ہوں نہ والدہ سے کہہ سکتی ہوں جب سکول میں نہ چھوڑی گئی تو یہاں کہاں"+

صاحبزادہ۔ اچھا بس بس اور کوئی طریقہ بتاؤ جس سے تمکو مدد دی جائے؟ واللہ ہم کو بہت ہمدردی ہے۔ تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ للہ مجھ سے شرم و تکلف نہ کرو میں تمہارا خالص ہمدرد و خیرخواہ ہوں +

نسیمہ۔ اس عنایت و شفقت کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قاصر ہے۔ مگر میں سواء محنت کی اُجرت کے اور کسی کی رحمدلی و خدا ترسی سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ بلا محنت یا آپ کی کسی نوازش سے کچھ فائدہ اُٹھانا۔

آئندہ آپ ایسا خیال ظاہر کرکے مجھکو ذلیل نہ کریں" اور کھڑی ہوکر چلدی۔ صاحبزادہ صاحب پشیمان و رنجیدہ ہوکر رہ گئے۔ پہلے تو اس کی اعلیٰ حوصلگی و بلند ہمتی پر متعجب رہے۔ پھر یہاں چین نہ آیا اور خود بھی چچی جان کی طرف چلے گئے جہاں وہ سلائی لے رہی تھی۔ مگر اُس نے ان کی طرف نظریں نہ اُٹھائیں سمجھ گئے کہ ناراض ہے۔ آدھے گھنٹہ بعد وہ بقچہ سنبھال گھر روانہ ہوگئی۔ یہ دن ان کو بہت بیچینی اور اذیت قلبی سے گذارنا پڑا۔ اس کی خفگی کا خیال سوہانِ روح تھا۔ آج چچازاد بہنوں کے ساتھ شام کو "ٹینس" بھی نہ کھیلا خاموش پڑے رہے۔ شام کو خیال آیا کہ کسی طرح مل کر معافی مانگنی چاہئے۔ ضرور معاف کردیگی۔ جب مجھ کو اُس سے اسقدر محبت ہوگئی ہے تو یقیناً اُس کو بھی خیال ہوگا۔ مانا کہ وہ غریب شریف پاکباز لڑکی ہے۔ لیکن کہتے ہیں محبت کا ضرور اثر ہوا کرتا ہے۔ آج میں نے بہنوں کے ساتھ شام نہیں گذاری۔ رفعت آرا بیگم (جس سے نسبت ہونے والی تھی۔ مگر ابھی پردہ نہیں کرایا گیا تھا) کیا خیال کر رہی ہونگی؟ کھانے پر بھی میری افسردگی کا سبب پوچھ رہی تھیں۔ کیسی اچھی لڑکی ہے رفعت بے نظیر چیز ہے۔ تعلیم یافتہ حسین ذہین اور پھر میری قدردان۔ مگر میرا بدبخت دل اُس کی طرف نہیں پسیجتا۔ میں پسند کرتا ہوں مگر محبت نہیں کرتا۔ آہ اس غریب فقیرنی نے ایک ہی نظر میں کیا جادو کردیا کہ میں اس کے خیال کے سواء اب دنیا کے کسی کام کا نہ رہا۔ انہیں خیالات میں غلطاں سڑک پر آئے۔ ملازم لڑکا اندر بھیجا کہ "بیگم طلب کر رہی ہیں"۔ اور خود گلی میں دروازہ کے قریب ہی نیم کے گھنے درخت کے نیچے کھڑے ہوگئے۔ وہ غریب برقعے میں لپٹی ہوئی اندر سے نکلی اور سڑک پر چلنے لگی کہ فوراً انہوں نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اندھیرے میں ڈر گئی۔ گویا جسم سے روح نکلنے لگی۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور چلانے کو تھی کہ انہوں نے روکا اور بتایا کہ "ڈرو نہیں میں ہوں جس سے تم صبح سے ناراض ہو"۔

نسیمہ۔ (جھلا کر) صاحبزادہ مجھکو آپ ایسے شریف عالی خاندان تعلیم یافتہ انسان سے یہ امید نہ تھی۔ آپ نے غریب جانکر ایسا رویہ اختیار کیا ہے مگر غریب کم بخت کیا شرافت نہیں رکھتے؟ ان کو نیک بھی نہیں سمجھا جاتا۔ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میں آج سے محل میں قدم نہ رکھونگی اور والدہ سے سب حالات بیان کردونگی۔ کہ اب وہ گھر جانے کے قابل نہیں رہا۔ آخر آپ کے چچازاد بھائی حامد صاحب و محمود صاحب بھی تو ہیں۔ سال گزر گئے مجھکو وہاں جاتے۔ کبھی اُنہوں نے نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ آپ نے چار ہی دن میں یہ غضب کیا"۔ غصے میں تھرّاتی ہوئی لڑکی سے ایسی شرم دلانے والی تقریر سنکر وہ نہایت شرمندہ ہوئے۔ اور دل پر اسقدر اثر ہوا کہ خود بھی چشم پُر آب ہوگئے اور اس کے سواء کچھ نہ بن پڑا کہ یہ لکھپتی تعلقدار اودھ کا اکلوتا جگر گوشہ ایک ادنیٰ فقیرنی کے آگے دست بستہ ہوکر سرنگوں ہوجائے۔ تلافی کے لئے الفاظ منہ سے نکالنے کا یارا نہ رہا۔ لڑکی آخر غریب لڑکی تھی۔ گھبرا گئی۔ اور اس عالی رُتبہ شہزادہ کا ہاتھ باندھنا بہت کچھ اثر کر گیا۔ اُس نے فوراً ان کے ہاتھ علیحدہ کئے۔ اور خود یہ کہتی ہوئی قدموں کی طرف جھکی "عالی جاہ صاحبزادہ صاحب اس غریب کو گناہگار نہ بنائیں۔ ہم تو آپ کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں خدمت کرکے روٹی کھاتے ہیں۔ ایسے ادنیٰ لوگوں کے ساتھ اسی طرح پیش آنا زیبا ہے؟ کیا آپ کے لئے باعثِ شرم نہیں؟ - بس یہی عنایت ہوگی کہ آئندہ سے میرا خیال ہی چھوڑ دیں۔ میں اس محل میں نہ جاؤں گی۔ نہ آپ کو رحم آئیگا"۔

صاحبزادہ۔ (پھر ہاتھ جوڑ کر منت سے) برائے خدا ایسا ارادہ نہ کرو۔ بیشک میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی بات ایسی نہ ہوگی جس سے تم کو رنج ہو۔ مگر وہاں جانا نہ چھوڑنا۔ اور میری صبح کی اتنی سی خطا کو کہ "کس طرح مدد دینی چاہئے" معاف کردو۔ میں صرف معافی مانگنے اس وقت آیا ہوں۔ بخدا میرا کوئی بُرا ارادہ نہ تھا۔

نسیمہ۔ توبہ توبہ خطا کیسی؟ غریب محتاج جان کر آپ نے ایسا کہا۔ مگر میں یہ سوال کرکے رخصت ہونا چاہتی ہوں کہ محل میں کیوں جایا کروں؟

صاحبزادہ۔ وعدہ کرو کہ خفا نہ ہوگی تو کہہ دوں۔

نسیمہ۔ اگر کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہوئی تو ناگوار نہ ہوگی۔

صاحبزادہ۔ بتادوں آہ بتادوں بگڑ نجانا۔ غریب بھولی لڑکی تمکو قسم ہے ناراض نہ ہونا۔

نسیمہ۔ کہئے کہئے۔

صاحبزادہ۔ یہ امر میری سمجھ سے باہر ہے کہ پرسوں شام ہی سے میرے دل میں تمہاری تصویر کیوں جم گئی ہے۔ اور تمہارا خیال کیوں نہیں ہٹتا یہی جی چاہتا ہے کہ تم ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہو۔ بس یقین جانو۔ لڑکی صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے بدگمان نہ ہو۔

نسیمہ۔ (نیچی نگہ کرکے) اگر ایسا ہے تو بہت افسوس کی بات ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ میں وہاں رہوں۔ پھر ناممکن امر کی خواہش لاحاصل۔

صاحبزادہ - مگر جو بات بے اختیاری ہو اُس کا کیا علاج؟ میں خود سب سمجھتا ہوں - اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ میری خواہش ناممکن الحصول ہے - مگر میں مجبور ہوں - قسم ہے خدا کی میں مجبور ہوں - ایک رات اور دن بہت ہی مشکل سے گزرے ہیں - یہی ارادہ کیا کہ اس خیال سے باز آؤں - مگر نہیں تمہارا خیال میری جان کے ساتھ ہے - کیا تم اسقدر ظالم ہو جاؤ گی کہ جس گھر میں برسوں سے جا رہی ہو - اب جانا ترک کر دو گی؟

نسیمہ - میں پھر یہی کہتی ہوں کہ اس خیال کو دل سے نکال دیں - میں بہت ہی ادنیٰ طبقہ میں شمار کی جاتی ہوں - آپ کا مجھ سے بات کرنا بھی نازیبا ہے +

صاحبزادہ - اوہ اس کی تو پرواہ نہیں - تم شریف ہو - سمجھدار ہو اور میرے لئے وہ کشش رکھتی ہو کہ جو ایک شہزادی سے نہیں +

نسیمہ - مگر دنیا کیا کہیگی؟ گھر والے ہی ناپسند کرینگے +

صاحبزادہ - ان باتوں کو پھر سوچینگے - خدا کے لئے تم جس طرح بنے کپڑا لینے دینے کے نام سے روزانہ ایکبار ہو آیا کرو +

نسیمہ - مانا کہ ہو آیا کروں - میں نے وہاں صاحبزادیوں میں سارا سارا دن گذارہ ہے - جا سکتی ہوں - مگر آپ کا اُس جگہ آنا میری طرف دیکھنا بات کرنا بہت ہی بُرا ہوگا - پھر ذلت کے ساتھ میرا وہاں جانا بند کرا دیا جائیگا - یہ آپ کو گوارہ ہے؟ میری بدنامی اور رُسوائی منظور کرینگے؟

صاحبزادہ - ہرگز نہیں - ایسا ہو نہیں سکتا - میں بیوقوف نہیں ہوں کہ لوگوں پر میرا خیال ظاہر ہو جائے +

نسیمہ - مگر صاحبزادہ - رفعت اور بیگم کو فوراً بدظنی ہو جائیگی - کیونکہ ان کو آپ کا بیحد خیال ہے - اور چند ہی دن میں منگنی و شادی ہونے والی ہے +

صاحبزادہ - تم کو سب علم ہے؟

نسیمہ - رفعت آرا بیگم بڑی مہربانی سے مجھ غریب کو سہیلیوں کے برابر چاہتی ہیں - اور عزت کرتی ہیں " یہ سُنکر وہ چکرا گئے - چند منٹ خاموش رہے پھر کہا:-

"یہ سب درست ہے - مگر پہلے ہی سے بُرا خیال کیوں قایم کر لیا جائے؟ ہم نادان نہیں ہیں کسی کو بدگمانی کا موقعہ نہ دینگے" +

نسیمہ - لیکن حضور یہ ملنا اور دیکھنا آخر کہاں تک؟ تھوڑے عرصہ میں آپ معہ بیگم صاحبہ کے روانہ ہو جائینگے - پھر میری یاد نہ آئیگی +

نسیمہ کی زبان سے اتنا سُنکر اُنہیں ضبط یارانہ رہا اور بے اختیار اُنکی آنکھوں سے گرم گرم قطرے نسیمہ کے ہاتھوں پر گرنے لگے - کیونکہ اُس کے ہاتھ اُن کے ہاتھوں میں تھے - وہ اور بھی پریشان ہو گئی - اور پھر یہی کہا کہ "خدا کے لئے سمجھ سے کام لے کر میرا خیال دل سے نکال دیں" +

صاحبزادہ - یہ مشکل ہے - اچھا ہم یہیں رہینگے - گھر میں صلاح کر کے اسی جگہ وکالت شروع کر دینگے - چچا کا گھر ہے یہاں رہنا معیوب نہیں +

نسیمہ - مگر بعد شادی میرا خیال کرنا نہ نبھ سکیگا - بیگم صاحب بہت ہی عقلمند ہیں وہ مجھے گھسنے بھی نہ دینگی - نہ مجھ سے یہ نمکحرامی ہو کہ اُنکو رنج دوں +

صاحبزادہ - خیر یہ بعد کی باتیں ہیں - ابھی ہم شادی کو اور ٹالینگے - تم آتی جاتی رہو - اتنا اقرار کرو +

نسیمہ - اب میں اماں سے کیا کہونگی کہ کس نے بلایا تھا؟

صاحبزادہ - ابھی شام ہے تم تھوڑی دیر کو کوئی چیز بٹن یا گوٹ کا کپڑا وغیرہ مانگنے کی غرض سے وہاں ہو آؤ +

نسیمہ - میری سخت ذلت ہے - آہ کل میں اُس طرف ہی نہ جاتی جہاں آپ بیٹھے تھے +

صاحبزادہ - ہاں نہ جانیں تو بہت ہی اچھا تھا - مگر اب کیا کیا جائے جو ہونا تھا ہو چکا - اگر مجھے دیوانہ نہیں بنا دینا ہو تو جاتی رہو +

نسیمہ - آپ کو مجھ سے زیادہ میری عزت کا خیال لازم ہے - اگر میری محبت ہے +

صاحبزادہ - ابھی اس میں شک ہے؟ سچ کہتا ہوں کہ مجھے دُنیا میں اب تم سے کوئی بھی عزیز نہیں - میرے جسم کی روح تم ہو - بگڑنا نہیں - میں بُرا انسان نہیں ہوں +

نسیمہ - آخر کیوں اتنی عزیز ہو گئی؟ رفعت آرا بیگم سُنیں تو کیا خیال کریں؟ سب سے عزیز تو آخر وہ ہیں +

صاحبزادہ - بالکل نہیں - مجھکو خود تعجب ہے - ایسی اچھی لڑکی سے مجھ کو کیوں محبت نہیں ہوئی جس کے ساتھ عمر گزارنی سُنی جاتی ہے +

نسیمہ - اُن سے محبت نہیں سچ کہتے ہیں؟

صاحبزادہ - تمہاری قسم - بالکل نہیں ہے - مگر آہ جس کی پہلی نظر نے کام تمام کر دیا - اُس کو ذرا خیال نہیں - میرا خیال درست ہے تم کو مجھ سے ذرا محبت نہیں؟

نسیمہ۔ صاحبزادہ صاحب ایسی باتیں زبانی کرنے کی نہیں ہوتیں۔ اور پھر ایک غیر شادی شدہ شریف لڑکی سے۔ اچھا میں اندر جاتی ہوں۔ آپ بھی تشریف لے جائیں۔ اور دروازہ میں داخل ہو گئی۔ وہ چند منٹ نہایت غمگین کھڑے رہے۔ پھر کمرے میں جا کر پڑ رہے۔ آج کھانا بھی نہ کھایا۔

نواب رفعت اللہ خان صاحب کی بھاوج اور بھتیجے کو یہاں آ کر ٹھیرے ہوئے دو ماہ گذر چکے ہیں۔ ان کی بڑی لڑکی رفعت آرا بیگم کی نسبت بھی صاحبزادہ قمر الزماں صاحب سے ہو چکی ہے۔ ان کے اصرار سے اور محبت بے پایاں کے اظہار سے نیز ان کی مجنونانہ کیفیت کو سمجھ کر وہ غریب لڑکی برابر محل میں آتی جاتی ہے۔ کبھی کبھی موقعہ ملنے پر تنہائی میں بھی گفتگو ہو جاتی ہے۔ مگر اس عقلمندی سے دونوں ملتے ہیں۔ کہ گھر میں کسی کو شک و شبہ کا موقعہ نہیں ہوا۔ یہاں آنے کے پانچویں ہفتہ رفعت آرا بیگم کی شادی ٹھہر گئی۔ چونکہ یہ آبائی مکان تھا۔ آدھا آدھا دونوں بھاجیوں میں تقسیم تھا۔ اسی محل میں شادی قرار پائی دلہن دولھا کو مایوں بٹھا دیا گیا۔ رفعت آرا بیگم کی ہم رتبہ سہیلیاں مانجھے کے دن سے یہیں مہمان کر لی گئیں۔ اور غریب نسیمہ کو بھی انہوں نے رکھ لیا۔ کیوں کہ اس کی سمجھداری اور خوبصورتی کا صاحبزادہ صاحب کے دل پر بہت ہی اثر تھا۔ اور وہ اس سے بیحد محبت کرتی تھیں۔ بلکہ جس وقت والدہ موجود نہ ہوتیں اس کو برابر بٹھا کر کھانا بھی کھلا لیا کرتی تھیں۔ صاحبزادہ قمر بظاہر شادی سے خوش معلوم ہوتے تھے۔ مگر دل کا حال خدا جانتا تھا۔ ہر وقت یہی فکر تھی۔ کہ اب نسیمہ سے ملنا نہ ہوگا۔ مانجھے کے دن ختم ہوئے۔ آج برات تھی۔ قمر صاحب دولھا بنائے جا رہے تھے۔ رشتہ کی بہنیں اور سالیاں سب موجود تھیں۔ نسیمہ بھی کھڑی تھی آج اس غریب نے بھی پرانے کپڑے اتار کر نیا ریشمی جوڑا بدلا ہوا تھا جو نواب بیگم صاحبہ نے اپنی بیٹی کی شادی کی خوشی میں سینے والی لڑکی کو بنا دیا تھا۔ سب رئیس زادیاں فوق البھڑک لکھنؤ کے لباس میں تھیں۔ کچھ نہایت فیشن ایبل ساڑیاں پہنے تھیں۔ اور نسیمہ وہی غریبانہ لباس۔ تنگ پاجامہ اور کرتہ دوپٹہ میں تھی۔ مگر آج یہ ذرا اچھا تھا۔ سبز نسر کا پاجامہ۔ گلابی جاپانی ریشمی قمیض اور بادامی کریب کا گوٹہ ٹکا دوپٹہ۔ لیکن اسی سادہ اور پرانے لباس میں وہ سب سے بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ جامہ زیب تھی۔ دلکش تھی۔ غیر معمولی حسین تھی۔ سرمگیں چشم سحر کار تھی۔ قمر صاحب تو درکنار اس کی آنکھوں کو لڑکیاں بھی بہت پسند کرتیں اور دیکھا کرتی تھیں۔ کوئی اس کی نظروں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا جس وقت وہ کسی کی طرف دیکھتی خود بخود اس کی آنکھیں نیچے جھک جاتی تھیں۔ اس وقت برقی روشنی میں شامیانہ کے نیچے یہ مجمع جگمگا رہا تھا۔ گویا پریوں کا اکھاڑا تھا جس میں یہ سادہ وضع جادوگرنی بھی کھڑی تھی۔ درمیان میں نوشہ صاحب چوکی پر بیٹھے تھے جنہیں دولھا بنایا جا رہا تھا۔ مگر وہ بار بار نظر غلط انداز سے اپنی ہمیشہ کو بچھڑنے والی نسیمہ کو دیکھ دیکھ لیتے تھے۔ سہرا بندھائی پر لڑکیاں بیگم صاحبہ سے جھگڑ رہی تھیں۔

نوشاہ کے والد صاحب ابھی نہیں پہنچے تھے۔ اسی وقت کی ٹرین سے ان کا انتظار تھا۔ اس لئے برات چڑھنے میں دیر ہو رہی تھی۔ سہرا بندھ چکا تو مراسنیں خاموش کرا دی گئیں۔ اور بیگمات کے حکم سے مہمان لڑکیوں نے ہارمونیم پر گانا شروع کیا۔ نسیمہ بھی محل میں آنے کی بدولت باجہ بجانا سیکھ گئی تھی۔ اور ان سب سے اچھا بجانے لگی تھی۔ باری باری سب سنا رہی تھیں۔ سب کے اصرار پر نسیمہ گانے پر تیار ہوئی۔

نسیمہ۔ اچھا سوچوں (اور اک نظر سے نوشاہ کو ایکبار۔ اور ادھر سے بھی بیلے کے پھولوں میں نرگس نے جھانک ہی لیا) چند منٹ نیچے سر کر کے سوچنے کے بعد باجہ پر ہاتھ رکھ کر اہل محفل کے دلوں کو زیر و زبر کرنے لگی ؎

اے جنوں ہنگام وحشت بادیہ پیمانہ ہو
تنگیٔ دل میں تڑپ منت کش صحرا نہ ہو
بیقراری سے تری دنیا تہ و بالا نہ ہو
ضبط قلب مضطرب محشر کہیں برپا نہ ہو

مہمان لڑکیاں (آہستہ سے) کمبخت ہمیں تو تڑپا دیا۔

ایک ظریف بیگم۔ اے بیوی اور کیا محشر کرو گی۔ میری آنکھوں سے تو آنسو نکلنے لگے۔

؎ تا قیامت تیر الفت کی خلش باقی رہے
یا الٰہی حشر تک زخم جگر اچھا نہ ہو

(نوشاہ اس پر سر ہلا رہے تھے)

ہے وہ محتاج ترحم او بت نا آشنا
جس کا دنیا میں کوئی تیرے سوا اپنا نہ ہو

مکرر ؎

ہے وہ محتاج ترحم او بت نا آشنا
جس کا دنیا میں کوئی تیرے سوا اپنا نہ ہو

اب تو علاوہ سننے والوں کے۔ خود گانے والی کی یہ حالت ہوگئی کہ بمشکل اُس نے ضبط سے کام لیا۔ اسی پر حسرت شعر کا قرصاحب کو دیکھ کر دوبارہ گانا، کہ "جس کا دنیا میں کوئی تیرے سوا اپنا نہ ہوئے" ان پر تیر و نشتر کا کام کر گیا۔ اب بیٹھنا مشکل تھا۔ لوگ سمجھ جاتے۔ اسی خوف سے وہ سہما اور لمبا جگمگاتا بھاری جامہ سنبھالتے ہوئے جلدی یہاں سے اُٹھ گئے۔ بہنیں روکتی رہیں۔ مگر "تھک گیا ہوں لیٹونگا" کہہ کر نکل گئے۔ ایک گھنٹے بعد چھوٹے نواب صاحب تشریف لے آئے اور برات روانہ ہوئی +

قمرالزماں بیاہے گئے۔ اور بادلِ ناخواستہ بیوی کی بھی خاطر محبت کرنی پڑی۔ لیکن شادی کے تیسرے دن اپنی پھوپھی کے گھر کلکتہ جانے کے لئے نسیمہ اگر سب محل والوں سے رخصت ہوگئی۔ قرصاحب سے علیحدگی میں نہ لی۔ والدہ سے جیسے بنا اجازت لی اور مرزا حمید بڑے بھائی کے ساتھ کلکتہ چلی گئی۔ اس کو بھی مہینے گزر گئے۔ قرصاحب کا یہاں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ بھی بیوی سے اجازت لے کر چند دن تفریح کے لئے بمبئی روانہ ہوگئے۔ مگر وہ اصل بمبئی نہ گئے بلکہ سیدھے کلکتہ گئے۔ اور چلنے سے پیشتر نسیمہ کی والدہ سے باتوں باتوں میں اُس کی پھوپھی کے گھر کا پتہ پوچھ لیا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہوٹل میں فروکش ہوئے۔ اور مرزا محمد علی بیگ کا گھر تلاش کیا۔ جو بہت آسانی سے مل گیا۔ وہ یہاں کے بڑے تاجروں میں تھے۔ چورنگی کے قریب ہی ان کی کوٹھی تھی۔ یہ موٹر کار پر کوٹھی پہنچے۔ شام کے پانچ بجے محمد علی صاحب تو اپنی فرم میں ہونگے۔ اُن کا لڑکا احمد علی ملا۔ یہ بھی انگریزی لباس میں اچھا امیروں کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ کوٹھی بھی شاندار۔ نوکر چاکر۔ گھوڑے گاڑی سب سامان دیکھکر ان کو بہت حیرت ہوئی کہ غریب فقیر نسیمہ بہلائی پر بسر کرے اور اس کے مرحوم باپ کی بہن اس شاندار حالت میں ہے۔ دنیا کے کیا نشیب و فراز ہیں۔ لڑکے احمد علی نے سگرٹ پان پیش کیا۔ اور برآمدہ میں بیٹھکر دونوں باتیں کرنے لگے:۔

قمرالزماں۔ آپ تو سکول میں پڑھتے ہونگے؟

احمد علی۔ نہیں۔ اسی سال سے کالج میں پہنچ گیا ہوں۔ سینیئر کیمبرج سال گذشتہ پاس کیا تھا +

قمرالزماں۔ اچھا۔ بڑے ذہین ہو۔ اتنی عمر میں کالج میں؟ آپ کے والد صاحب اس وقت کہاں تشریف رکھتے ہیں؟

احمد علی۔ وہ چورنگی میں ہیں۔ ہمارے کوٹھی والوں سبھی اندنوں ملیریا میں مبتلا ہیں۔ اس لئے والد صاحب کو زیادہ وقت فرم میں گزارنا پڑتا ہے +

قمرالزماں۔ آپ کا کوئی اور بڑا بھائی نہیں جو مدد دے؟

احمد علی۔ بھائی جان سال گذشتہ انگلینڈ تشریف لے گئے ہیں۔ بہنیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ سب سکول جاتی ہیں۔ حساب کتاب میں ہمارے ماموں کی لڑکی بہت مدد دیتی ہیں +

قمرالزماں۔ وہ بھی یہیں رہتی ہیں؟ کیا ماموں جان بھی کلکتہ میں ہیں؟

احمد علی۔ میرے ماموں جان کا سال گذشتہ انتقال ہوچکا ہے۔ ممانی جان بھی زندہ نہیں۔ صرف اُن کی ایک لڑکی ہیں +

قمرالزماں۔ وہ تمہارے ہی پاس ہیں؟

احمد علی۔ نہیں جناب ابھی آئی ہیں کوئی تین مہینے گزرے۔ اس سے قبل وہ اپنی خالہ جان کے گھر تھیں۔ جب سے والدین گذرے وہ وہیں ہیں کوئی سات سال بعد آئی ہیں +

قمرالزماں۔ اُن کا کیا نام ہے؟ اور اُن کے خالو جان کا کیا نام تھا؟ میرا خیال ہے ہمیں اس خاندان سے واقفیت ہے +

احمد علی۔ ان کے خالو جان کا نام شاید عزیز بیگ تھا۔ اُن کا بھی عرصہ سے انتقال ہوچکا ہے۔ صرف خالہ کے پاس رہتی تھیں۔ آپا جان کا نام نسیمہ ہے +

قمرالزماں۔ ہاں ہاں نسیمہ ان کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ جہاں وہ رہتی ہیں وہ اُن کے والدین ہیں۔ تم سے معلوم ہوا کہ خالہ ہیں؟

احمد علی (سادگی سے) یونہیں کہہ دیا ہوگا۔ اُن کی خالہ جان سُنا جاتا ہے کسی بہت معمولی گھرانہ میں بیاہی گئی تھیں۔ وہ غریب تھے۔ اور اب بیوگی میں بہت ہی خستہ حال ہیں۔ بڑا لڑکا حمید جاہل آوارہ ہے۔ چھوٹا ابھی پڑھتا ہے +

قمرالزماں۔ اچھا تو نسیمہ کے والدین کہاں تھے؟

احمد علی۔ ہمارے ماموں جان بڑے نامی وکیل تھے۔ علاوہ اس کے گھر کے بھی زمیندار تھے۔ اُنہوں نے بہت شوق سے نسیمہ کو [illegible] پر تعلیم دلانی شروع کی تھی۔ مگر ابھی آپا نسیمہ دس ہی سال کی تھیں کہ اُنکا انتقال ہوگیا۔ جائداد تقسیم ہونے لگی۔ میرے چھوٹے ماموں جان بہت جھگڑالو طبیعت کے آدمی ہیں۔ اُنہوں نے والدہ کو بھی کچھ نہ دیا جس

کی ہم کو ضرورت بھی نہ تھی۔ والدہ صاحبہ نے پرواہ نہ کی۔ مگر بھتیجی کو تو اُس کے والد کا حصّہ دینا چاہئے تھا۔ وہ ابھی کم سن تھیں۔ ان کے والد بھی قرار پائے۔ اور نسیمہ آپا کو اپنے گھر لے گئے۔ وہاں چچی نے بیچاری کو طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کیں۔ وہ پریشان ہو کر اپنی خالہ جان کے پاس چلی گئی۔ تب یہ نا سمجھ تھیں آپا نسیمہ کو کئی سال وہیں گزر گئے۔ اب ماشاء اللہ سمجھ آئی تو پہلے ہمارے پاس آئی ہیں۔ کیونکہ میری والدہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اب ہم لوگ ہوں جان سے جھگڑا کر کے ان کا حصّہ ان کو دلوانے کی کوشش کریں گے۔

قمرالزماں۔ جانی جائداد ہو گی ضرور بیچاری کی مدد کرو۔

احمد علی۔ اگر وہ آدھی بھی دیدیں تو پانچسو روپے ماہوار کی آمدنی کی جائداد ہے۔ آپا جان پھر سکول جانے لگی ہیں۔ خالی وقت میں والد صاحب کو حساب کتاب میں مدد دیتی ہیں۔ آپ کو جانتی ہیں آپ اُن سے ملے ہیں؟

قمرالزماں۔ ہاں ہمارے خاندان سے تعلقات پُرانے ہیں۔ وہ تو ہم سے پردہ بھی نہیں کرتیں۔

احمد علی۔ اچھا وہاں عام طور پر پردہ کرتی ہونگی؟ ہمارے یہاں تو پردہ کی رسم نہیں ہے۔ میری والدہ اور بہنیں پردہ نہیں کرتیں۔ یہاں آپا جان بھی ایسے ہی رہتی ہیں کیا آپ اُن سے ملنا چاہتے ہیں؟

قمرالزماں (جھجکتے ہوئے دل سے) ہاں اگر کوئی ہرج یا اعتراض نہ ہو۔

احمد علی۔ کوئی ہرج نہیں۔ مگر اس وقت وہ گھر پر موجود نہیں۔ کیونکہ اُن کی صحت جب سے آئی ہیں خراب ہے۔ ہر شام کو دو گھنٹے کے لئے شہر سے باہر ہوا خوری کو بھیجدی جاتی ہیں۔ آٹھ بجے تک آئینگی۔ آپ کل چار بجے تشریف لائیے اور یہیں ہم سب کے ساتھ چائے نوش کیجئے۔ آج تو والد صاحب بھی نہ مل سکے۔

اس کے بعد قمرالزماں احمد علی سے رخصت ہوئے۔ سات بجنے والے تھے۔ وہ ابھی ایک پارک سے گزر رہے تھے کہ فٹن پر کوئی نسیمہ کی ہم شکل لڑکی برابر سے گزرتی دیکھی۔ مگر وہ ساڑھی پہنے تھی۔ اِنہوں نے موٹر کار کی رفتار کم کر دی۔ اُس نے بھی فٹن روک لی۔ کیونکہ وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ قمر صاحب کار سے اُترے۔ سجاوٹ کے قریب گئے تب اس نے سلام کیا۔ دراصل یہی ان کی بچھڑی ہوئی منگیتن نسیمہ تھی مگر اب پہچانی نہ جاتی تھی۔ کہاں اُس پھٹے پرانے اور میلے لباس میں دیکھا تھا کہاں یہ شاندار ریشمی موتیوں کی جھالر لگی ساڑھی۔ مخملیں بال۔ مگر چہرہ سے پژمردگی عیاں تھی۔ اور بجائے ہلکی سرخی کے اب زردی جھلا رہی تھی۔ زبانوں نے ہاتھ ملانے کے بعد فوراً ہی کہا:-

"اُف نسیمہ کسقدر ظالم لڑکی ہو۔ اور گھورے دل کی آدمی ہو۔ مجھ سے ایسے سچے چاہنے والے سے یہ اخفاء۔ چلو کہیں بیٹھکر کچھ باتیں کریں۔ کہ مجھ کو یہاں اکر کیا کیا حالات معلوم ہوئے۔ اور آپ نے (اس سے قبل ہمیشہ قمر نے نسیمہ کو تم ہی سے مخاطب کیا تھا) کیا کیا ظاہر کیا؟ آہ آہ مجھے تباہ کر دیا۔ ہمیشہ کو کھو دیا۔

نسیمہ۔ خیر تو ہے۔ اتنی شکایت۔ ایسا غصّہ۔ آخر کیا گناہ ہوا؟۔ چلئے وہ قریب ہی کلب ہے۔ وہاں بیٹھیں۔ پھر شکایت کیجئے۔" چنانچہ دونوں کلب کے باغ میں ایک بنچ پر جا بیٹھے۔

قمرالزماں۔ آپ جانتی ہیں میرے لئے۔ میرے خیال میں۔ میری نگاہ میں تو آپ اُس حالت میں بھی ملکہ تھیں۔ مگر نیاز والے ایسا نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کو ذرا رتبہ کا خیال ہوتا ہے۔ باوجود یہ جاننے کے کہ میں آپکی جُدائی میں خوش نہیں رہ سکتا آپ نے میری بہتری کے لئے کوئی تدبیر نہ سوچی جس سے ہم کچھ زندگی بسر کر سکتے۔ آپ نے اپنے تئیں والدہ حمیدہ کی بیٹی اور غریب تباہ حال ظاہر کئے رکھا جس کے باعث میں کمزور دل تابع فرمان لڑکا والدین سے اتنی جرأت نہ کر سکا کہ مجھ کو اسی خاندان سے وابستہ کر دیا جائے جس کی بسر اوقات اُن کی سخاوت پر تھی۔ لیکن اگر آپ اپنا صحیح حال بتا دیتیں تو میں کیا کچھ نہ کر سکتا تھا ہائے ہائے مجھے گرفتار بلا کر دیا۔ ہمیشہ کو پابند زنجیر بنا دیا۔ اور خود اب شہزادی ہو گئیں۔ نسیمہ یہ گناہ کبھی نہ بخشا جائیگا۔ میرا خون کیا ہے۔

نسیمہ (مسکرا کر) آپ میں تو اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ اپنی ہم رتبہ خالہ زاد قمرالزمانی بیگم سے شادی کر سکتے۔ تو ایک غیر خاندان سے تعلق پیدا کرنیکی جرأت کہاں سے لاتے؟

قمرالزماں۔ (بگڑ کر)۔ مجھے کوئی قمرالزمانی سے محبت نہ تھی۔ نہ ہوا نہ سہی۔ والد صاحب کی خوشی کر دی۔ یہاں تو سر ہی جان پر بنی تھی اور بنی ہے۔ مگر سے بیوی سے گھبرا کر نکل آیا ہوں۔ آپ کی تلاش میں بھٹکتا کاش نہ ملتیں تو بہتر تھا۔

نسیمہ۔ اب پھر جانے والی ہوں۔ میرے چچا جان بُلا رہے ہیں۔ اچھا غصّہ کو جانے دیں اور کسی وقت پھر بھی صاحب کی کوٹھی پر تشریف لا کر باتیں کریں۔

قمرالزماں۔ کل اُنہوں نے چاء پر بُلایا ہے۔ گھر سے ہوکر آرہا ہوں۔ مگر بے سُود اس کے بعد کیا؟ آہ نسیمہ آپ نے یہ کیا کیا؟ اس سے بہتر تھا مجھ کو زہر دیدیتیں۔ اب بتایئے میں کیا کروں؟

نسیمہ۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ اس کا رنج ہی کیا۔ جبتک کلکتہ میں ہیں مل لیا کیجئے۔ پھر آخر جدائی ہے ؎

کبھی دم بھر کو جو مل بیٹھے تو کیا خوش ہونا؟
زندگی ہائے جدائی میں بسر ہوتی ہے

قمرالزماں۔ اچھا آپ مجھ سے بھاگئے پیچھے۔ مگر میں جہاں تک ہو سکے گا ملنے کی کوشش کرونگا۔ میں کلکتہ کی رہایش اختیار کرونگا۔ مگر آپ چچا صاحب کے پاس جانا کتنی ہیں ؎

نسیمہ۔ (ہنسکر) پھر وہاں چل رہے ؎

قمرالزماں۔ آپ ہنستی ہیں۔ میرا دل خون ہو رہا ہے۔ کاش آپ وہی ——

نسیمہ۔ کیئے کہئے ؎

قمرالزماں۔ کیا کہوں۔ اب تو کوئی صورت میری رہائی کی نہ رہی۔ آپ کی خاموشی اور اخفاء حالات نے مجھکو پابند زنجیر کردیا۔ ظالم اتنا کر کہ یہیں کا رہنا مستقل ہو جائے۔ آپ یہاں تعلیم پائیں۔ میں یہیں پریکٹس شروع کردوں۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے اتنی کیا کم خوشی ہے۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ بیوی میری بیگم صاحب ہیں۔ کبھی یہاں رہینگی کبھی گھر ؎

نسیمہ۔ مجھ کو یہ گوارا نہیں۔ نہ کسی شریف لڑکی کو ہو سکتا ہے۔ غریبی فقیری دیکھ لی۔ ذلیل وخوار ہولی۔ اپنی کسمپرسی اور ناسمجھی سے بہت ذلیل رہی۔ مگر اب کوئی بات ایسی نہ کرونگی جو حدِ شرافت سے باہر ہو۔ ورنہ میرے دل میں بھی آپ کی قدردانی کے جذبات حد سے سوا ہیں۔ اور شاید میری زندگی کا کوئی خوش کن خیال ہے تو وہ آپ کا خیال مگر بس خیال تصوّر اور کچھ نہیں ؎

خاکسار

نذر سجّاد حیدر

سالنامہ سنہ ۱۹۲۸ء

کیلنڈر

دسمبر	نومبر	اکتوبر	ستمبر	اگست	جولائی					جون	مئی	اپریل	مارچ	فروری	جنوری
شنبہ	پنجشنبہ	دوشنبہ	شنبہ	چہارشنبہ	یکشنبہ	۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	جمعہ	سہ‌شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ
یکشنبہ	جمعہ	سہ‌شنبہ	یکشنبہ	پنجشنبہ	دوشنبہ	۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	دوشنبہ
دوشنبہ	شنبہ	چہارشنبہ	دوشنبہ	جمعہ	سہ‌شنبہ	۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	یکشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ	سہ‌شنبہ
سہ‌شنبہ	یکشنبہ	پنجشنبہ	سہ‌شنبہ	شنبہ	چہارشنبہ	۱	۲۵	۱۸	۱۱	۴	دوشنبہ	جمعہ	چہارشنبہ	شنبہ	چہارشنبہ
چہارشنبہ	دوشنبہ	جمعہ	چہارشنبہ	یکشنبہ	پنجشنبہ	۲	۲۶	۱۹	۱۲	۵	سہ‌شنبہ	شنبہ	پنجشنبہ	یکشنبہ	پنجشنبہ
پنجشنبہ	سہ‌شنبہ	شنبہ	پنجشنبہ	دوشنبہ	جمعہ	۳	۲۷	۲۰	۱۳	۶	چہارشنبہ	یکشنبہ	جمعہ	سہ‌شنبہ	جمعہ
جمعہ	چہارشنبہ	یکشنبہ	جمعہ	سہ‌شنبہ	شنبہ	۴	۲۸	۲۱	۱۴	۷	پنجشنبہ	دوشنبہ	شنبہ	چہارشنبہ	سہ‌شنبہ
۳۱	۳۰	۳۱	۳۰	۳۱	۳۱					۳۰	۳۱	۳۰	۳۱	۲۹	۳۱

لمعات

غالب اور چغتائی! ہمارے پاس چغتائی ایڈیشن کے متعلق اسقدر آرڈر آئے کہ ہم حضرت چغتائی کا ناک میں دم لے آئے۔ وہ بھی سچے تھے۔ مصوّر کا کام تصویر بنانا ہے۔ مدراس کے مشہور نقاد مسٹر چیلم کے بقول اس شاندار ایڈیشن کا اہتمام کسی ریاست یا فرم کو کرنا چاہئے تھا۔ مگر حضرت چغتائی نے سب کام خود اپنے ذمہ لیا۔ اور اب مدتوں کی محنت کے بعد یہ کام سرانجام پہنچا ہے۔

کام کیا تھا؟ — ہر لفظ کا الگ الگ فوٹو اتروا کر بلاک بنوانا۔ کیونکہ لیتھو کی چھپائی ہمیشہ عیب دار ہوتی ہے۔ اور اردو کا نستعلیق ٹائپ مفقود ہے۔ ہر صفحے کو نئی نئی آرائشوں سے مرصع کرنا۔ اس طرح کہ متن کے اردگرد ایک سنہری ارغوانی اور کئی کئی رنگ کی جھالر مزین ہو جائے۔ یہ کام بھی فوٹو بلاک کا ہے۔ ان مختلف رنگوں کو کامل رجسٹریشن کے ساتھ ایک کے اوپر دوسرے کو جمانا اس کام کے لئے ایک نہایت ہی اعلیٰ قسم کی مشین درکار تھی۔ وہ بھی یورپ سے منگوائی گئی۔ پھر جلد بھی ایک نئی قسم کی ڈیزائن کی گئی۔ جسے تیار کرنے کی حامی ہندوستان کے کسی جلد ساز نے نہ بھری۔ لہٰذا اسے بھی یورپ ہی میں تیار کرایا گیا۔ اس کا مخملی چمڑہ بھی وہیں تیار ہوتا ہے!

اب رہیں تصویریں! — حضرت چغتائی نے اپنے باریک موقلم سے ایسی رنگ آمیزی کی کہ ایک نقاد جس نے ایک تصویر دیکھ لی تھی بمبئی سماچار کے دیوالی نمبر میں لکھتا ہے "چغتائی اس کام میں اپنے آپ کو بھی مات کر گیا ہے"۔ یہ کامیابی چغتائی کے لئے تو قابل تحسین ہے مگر مطابع کے لئے وجہ ناکامیابی۔ آگے ہی چغتائی کے مداح کہتے ہیں کہ تین تین رنگ کی تصاویر چھاپنا بھی چغتائی پر ظلم ہے۔ اور یہ کہ چغتائی کے رنگ کسی فوٹو میں نہیں آسکتے۔ ظاہر ہے کہ غالب کی یہ شاندار تصاویر ہندوستان میں کیسے چھپتیں۔ یہ بھی لنڈن ہی بھیجی گئیں اور وہاں کے مطابع نے بھی محض تین رنگوں کو اس کام کے لئے عاجز سمجھا۔ اور ایک تصویر کے پانچ پانچ بلاک بنائے۔ مگر الحمد للہ نتیجہ ایسا شاندار نکلا ہے کہ ان تصویروں کے دیکھنے والے بے اختیار کہہ اٹھینگے کہ چغتائی کی پہلی مطبوعہ تصویریں چغتائی کی نہیں تھیں۔ واقعی یہ یورپ ہی کا کام تھا۔ ہندوستانی مطابع تو سنہری رنگ بھی صحیح طور سے نہیں نکال سکتے!! ——

اب رہا قیمت کا معاملہ! — ظاہر ہے کہ جو کام اس اہتمام سے کیا گیا ہے۔ اس پر کسقدر خرچ ہوا ہوگا۔ چغتائی کو اور ہمیں زبانی طور پر اور خطوں سے اہل الرائے حضرات نے یہی مشورہ دیا کہ فی الحال ایک **محدود ایڈیشن** نکالا جائے۔ اور اس محدود ایڈیشن کے نسخے کسی صورت میں ۲۰۰ سے زیادہ نہ ہونگے اور ہر نسخہ پر الگ الگ نمبر ہوگا اور حضرت چغتائی کے دستخط ہونگے۔ مختلف صفحوں پر مختلف رنگ ہاتھ سے کئے جائینگے۔ اور ہر ورق **کاغذ** کا نہیں ہوگا۔ بلکہ **شفاف جھلی** کا ہوگا۔ جلد خاص مراکو کی ہوگی۔ اس ایڈیشن کیلئے نصف سے زیادہ آرڈر پہلے سے آچکے ہیں اور اس کی قیمت **ایک سو دس روپے** ہوگی! اس ایڈیشن کے ختم ہو جانے پر ایک **معمولی ایڈیشن پندرہ روپے** کی قیمت کا نکالا جائیگا۔ آرڈر دینے والے حضرات تصریح کردیں کہ وہ کونسا ایڈیشن طلب کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ خاص ایڈیشن ختم ہو جانے پر تاریخی اہمیت حاصل کریگا۔ اور اسے دوبارہ شائع نہیں کیا جائیگا۔ لاریب یہ کتاب ہندوستان میں کتاب سازی کے فن پر ایک مشعل راہ کا کام دیگی۔

(ایڈیٹر)

سالنامہ نیرنگ خیال کی کتابت

سالنامہ نیرنگ خیال کی کتابت جناب منشی اشفاق احمد صاحب بریلوی نے کی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے اپنا پورا زور قلم صرف کر کے دکھا دیا ہے۔ اب نیرنگ خیال کی کتابت کا کام پھر آپ کو تفویض ہوا ہے۔ جنوری کا رسالہ آپ ہی لکھیں گے جس سے نیرنگ خیال کی صوری خوبیوں میں اضافہ ہوگا۔

ہمارے معاونین

نیرنگ خیال کے معاونین کی قدر افزائی کا ہم جس قدر بھی شکریہ ادا کریں وہ کم ہے۔ ہر روز درجنوں خطوط دفتر میں موصول ہوتے ہیں۔ جن میں سالنامہ کی فوری طلبی کی درخواست کی جاتی ہے۔ کام اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ہم تمام آرڈروں کی فوری تعمیل سے معذور ہیں۔ جن اصحاب کو سالنامہ ۲۵ تاریخ تک نہ ملے وہ دوبارہ درخواست بھیجدیں۔ ورنہ چند ہی دنوں کے انتظار کے بعد اگر آپ نے دوبارہ درخواست بھیجی تو سالنامہ کے دوبارہ وی پی ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ہم روزانہ دو سو وی پی بھیج رہے ہیں۔ اس سے زاید وی پی کی روانگی کا انتظام محال ہے۔ نیز ہم کسی خریدار کو بغیر درخواست کے سالنامہ ہرگز ہرگز نہ بھیجینگے۔ یہ فیصلہ قطعی ہے۔

ہماری کوششیں آپ کے سامنے ہیں۔ آپ اپنے فرائض کو محسوس کیجئے اور وہ یہ ہیں (۱) سالنامہ کو خریدیئے (۲) نیرنگ خیال کی خریداری کا سلسلہ جاری رکھئے (۳) اور نیرنگ خیال کے مستقل خریدار جنوری سے پیدا کیجئے۔ تاکہ نیرنگ خیال کی مستقل اشاعت چھ ہزار تک پہنچ جائے۔

منیجر رسالہ نیرنگ خیال لاہور

* سالنامہ کے ٹائٹل کا کاغذ جرمن سے منگوایا گیا ہے اس قسم کا قیمتی کاغذ اور اتنا مضبوط یہاں سے ملنا محال تھا۔

(رجسٹرڈ)

"نپٹ بہراپن"

کان کی تمام بیماریوں کی سرطیشہ دوا

بلب اینڈ سنز پیلی بھیت کا روغن کرامات ہے

کم سننے۔ طرح طرح کی آوازیں ہونے۔ درد۔ زخم۔ ورم۔ بچوں یا بڑوں کے کان بہنے۔ وغیرہ پر حیرت انگیز جادو اثر اور حکمی یہ دوا ہے کہ جس پر ہزارہا انگریز اور ڈاکٹر تک لٹو ہیں۔ بصرہ۔ بغداد۔ افریقہ۔ عدن۔ سیلون اور برہما جیسے ممالک غیر تک جس کی خاص شہرت ہے۔ جس کے پندرہ سالہ تجربات نے دنیا کو حیرت میں ہی نہیں ڈال دیا۔ بلکہ ہزارہا نامراد اور مایوس نپٹ بہرے بھی کھٹا کھٹ سننے لگے۔ جن صاحبان کو اعتبار نہ ہو۔ یہاں تشریف لا کر علاج کرا سکتے ہیں قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنہ۔ ہندوستان کے اندر تین شیشی یک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف۔

وجے ناس۔ ہر قسم کے درد سر اور دماغ کی ہر ایک تکلیف پر فوراً فائدہ کرتا ہے فی شیشی چار آنے۔ **بادشاہی منجن** ہلتے دانت جما دیتا ہے ہمیشہ دانتوں کو صاف اور مضبوط رکھتا ہے دانت کی ہر ایک تکلیف پر اکسیر اور ہمیشہ استعمال کے قابل ہے فی شیشی ۴ر کرن بندو۔ صرف کان کے زخم کو صاف کرنیوالی دوا ہے فی شیشی ۸ر دھوکہ باز ٹھگوں سے ہوشیار ہونا آپ کا فرض ہے۔ نوٹ براہ کرم کچھ کان کی تکلیفوں میں مبتلا مریضان کو ہمارا پتہ دوا کا نام اور قیمت بتا کر ثواب دارین حاصل کیجئے۔

ہمارا پتہ یہ ہے:۔ بہراپن۔ کان کی دواء۔ بلب اینڈ سنز پیلی بھیت یو۔پی

نیرنگِ خیال کی مقبولیت کا راز

نیرنگ خیال کی مقبولیت کا راز معلوم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل آراء کا مطالعہ کیجئے۔ جو بہت اختصار کے ساتھ نقل کی جا رہی ہیں۔ ان کے مطالعہ کے بعد اُمید ہے کہ آپ کو خریداری میں کسی قسم کا پس و پیش نہ رہیگا۔ اور آپ ملک کے بہترین علمی ادبی رسالہ کی سرپرستی اختیار فرما کر اُس علمی خدمت میں امداد دینگے جو ہم چار سال سے بجا لا رہے ہیں +

نیرنگ خیال خود خرید لیجئے۔ اور اپنے دوست احباب کو اس کی خریداری کی سفارش کیجئے +

علامہ سر اقبال لکھتے ہیں:-

نیرنگ خیال کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا +

مسٹر راس مسعود ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم حیدرآباد دکن لکھتے ہیں:-

نیرنگ خیال جس ڈھنگ اور رنگ روپ سے کام کر رہا ہے وہ قابل ستایش اور لایق امداد ہے۔ ایک گشتی مراسلہ مدارس فوقانیہ اور ثنائیہ کے نام جاری کیا گیا ہے۔ جس میں آپ کے قابل قدر رسالہ کی خریداری کی ہدایت کر دی گئی ہے۔ میں آخر میں پھر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اور اُردو ادب کے لئے جس ایثار سے آپ خدمت کر رہے ہیں اُس کی دل سے قدر کرتا ہوں +

مولانا وحید الدین صاحب سلیم رکن اُردو یونیورسٹی حیدرآباد دکن لکھتے ہیں:-

نیرنگ خیال باقاعدہ نکل رہا ہے۔ اس سے مجھے بیحد خوشی ہوتی ہے۔ کاش اسی طرح تمام رسالے تاریخ معین پر نکلا کریں۔ نیرنگ خیال ہر عام رسالوں سے زیادہ مضامین درج ہوتے ہیں۔ گلہائی چھپائی کی خوبی جاذب نظر ہے۔ قیمت کی کمی نے تو اور بھی کشش پیدا کر دی ہے۔ مضامین عمدہ اور دلچسپ نکلتے رہتے ہیں۔ اور پھر طرہ یہ کہ آپ نے تصویروں کا بھی التزام کیا ہے۔ آپ کا رسالہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ میں آپ کی سرگرمیوں کا دل سے مداح اور آپ کی کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔ آپ نے نئے مضمون نگاروں کا ایک گروہ کھڑا کر دیا ہے۔ جن کی تحریروں میں زندگی اور جذبات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ فنون لطیفہ پر جو آپ نے توجہ کی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے +

سر عبد القادر سابق وزیر تعلیم پنجاب لکھتے ہیں:-

رسالہ نیرنگ خیال لاہور کے ایڈیٹر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کے اجرا سے لیکر آج تک اس کی خوبیوں کے بڑھانے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ اور یہ کوشش بہت کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ ہر اشاعت میں ہر مذاق کے لئے دلچسپی کا سامان ہوتا ہے +

مولانا عبد المجید صاحب سالک بی اے مدیر انقلاب لکھتے ہیں:-

آپ اُردو کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اسقدر نفیس رسالہ جو ظاہری و معنوی اعتبار سے نہایت دلفریب ہے۔ اتنی کم قیمت پر اور اسقدر باقاعدگی کے ساتھ شایع کرنا آپ ہی کا حصہ ہے۔ نیرنگ خیال کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن سے اس نے چند ہی ماہ کے اندر رسایل کی صف اوّل میں نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے +

جناب حامد اللہ صاحب افسر سابق ایڈیٹر نونہال لکھتے ہیں:-

نیرنگ خیال جس اسلوب پر چل رہا ہے۔ وہ اس وقت اُردو کے اور کسی رسالے کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک زبردست ادبی نفیس خواص

بھی ہیں۔ اُردو تو اُردو ہندی کے رسالے بھی گو کافی ترقی کر گئے ہیں۔ مگر نیرنگ خیال نے جو روش اختیار کی ہے۔ اس کو وہ بھی نہیں پہنچے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ نیرنگ خیال شاید سال دو سال میں یورپ کے اچھے رسالوں کے پہلو بہ پہلو پہنچ جائیگا +

جناب ہادی مچھلی شہری صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل علی گڈھ

نیرنگ خیال کو عرصۂ وجود میں آئے کافی مدت گذر چکی ہے۔ جو خوبیاں ایک ممتاز ادبی رسالے میں ہونی چاہئیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے اگر اس کو سرمایہ زبان اُردو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ سب سے بڑا کمال تو یہ ہے کہ آپ نے آج تک اس معیار کو گرنے نہ دیا۔ اسکی وقت کی پابندی تو مافوق العادت ہے۔ جس قدر سرگرمی پنجاب کی ادبی فضا میں نظر آتی ہے وہ سب اسی کی طفیل ہے۔ بلکہ یوپی کی موجودہ ادبی بیداری کا بھی ایک حد تک محرک ہے +

ایک دوست کے پاس نیرنگ خیال کا پورا فائل نظر آیا۔ اللہ اللہ واقعی آپ نے کام کیا۔ اس زمانہ میں ایسا اعلیٰ پایہ کا رسالہ اسقدر کم قیمت میں دینا اور چار چار تصویریں شایع کرنا اللہ آپ کا ہی کام ہے۔ خدا آپ کے ارادوں میں برکت اور ملک کو ذوق صحیح عطا فرمائے۔ ہر ایک شخص کا فرض ہے کہ آپ کی مدد کرے + تمکین احمد کاظمی +

جناب محمد شہباز خاں صاحب رنگون سے لکھتے ہیں:-

نیرنگ خیال کی پابندی اشاعت کو اصول قرار دے کر آپ نے ایک بہت بڑے الزام کو صحافت اُردو سے دور کر دیا ہے۔ اور ایک مثال قایم کر کے بتا دیا ہے کہ وی پی کا روپیہ وصول کر کے دو دو تین تین مہینے کی خاموشی کسی معذرت کے دامن میں سر چھپانے کے قابل نہیں ہوتی۔ پھر ایک ایک مضمون رشکِ فردوس اور جاذبِ نظر ہے +

جناب عبد الحمید صاحب بیرسٹر ایٹ لا لکھتے ہیں:-

نیرنگ خیال ملک کا بہترین ادبی رسالہ ہے۔ ہم تقریباً ہندوستان کے تمام اُردو رسالوں کے خریدار ہیں۔ مگر سب سے زیادہ نیرنگ خیال کے محتاج ہیں +

جناب مولانا احسان اللہ صاحب جوہر

آپ رسالہ کی تیاری اور تدوین میں جسقدر محنت کرتے ہیں وہ عدیم النظیر ہے۔ ملک آپ کی علمی قابلیت اور علمی خدمت کا معترف ہے +

جناب احمد اللہ خاں صاحب شاکی بھوپال سے لکھتے ہیں:-

حضرت ابو البیان بیدل آجکل میرے مہمان ہیں۔ علیل ہیں اور زیر علاج۔ آپ کا رسالہ بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ مولانا آپ کی ادبی ترقیات پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور میرے نزدیک آپ کا ہر مضمون داد سے مستغنی ہے۔ دل و دماغ دونوں مزے لیتے ہیں +

جناب صغیر احمد خاں صاحب بی اے لکھتے ہیں:-

میں آپ کے رسالہ کو صوری و معنوی کمالات کے بہترین مجموعہ ہونے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ میں نے چھ رسالوں پر اس کو ترجیح دی ہے +

مدیر افکار و حوادث زمیندار لکھتے ہیں:-

لاہور کا ادبی رسالہ نیرنگ خیال تجارتی اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ دوسرے ادبی رسالے ۵-۵ روپے سالانہ قیمت وصول کرتے ہیں۔ جلی قلم خط میں لکھے جاتے ہیں۔ بعض کبھی کبھار ایک آدھ تصویر بھی دیدیتے ہیں۔ اور بعض وہ بھی نہیں دیتے۔ اس پر طرہ یہ کہ دو دو مہینے غائب بھی رہتے ہیں لیکن نیرنگ خیال کو دیکھو۔ زمیندار کی چوتھائی تقطیع پر نکلتا ہے۔ کتابت باریک اور خوشنما ہوتی ہے۔ ایک چھوڑ چار چار بلاک کی رنگین تصویریں ہر مہینے دیجاتی ہیں۔ ہر رسالہ بہتر بہتر اسی اسی صفحے پر نکلتا ہے۔ اور تقدیم و تاخیر کے بغیر ہر مہینے کی یکم تاریخ کو پیام اجل کی طرح نازل ہو جاتا ہے۔ ان تمام خوبیوں پر قیمت صرف ۴ سالانہ ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ آیا یہ کوئی تجارتی اصول ہے؟ کیا یہ بھلے مانسوں کی باتیں ہیں۔ ہمارے نزدیک تو دوسرے

ادبی رسالوں کو نیرنگ خیال سے جتنی بھی شکایت ہو بجا ہے +

معزز معاصر معارف لکھتا ہے:۔

ماہوار رسائل میں بھی خاصی ترقی ہوئی ہے۔ نیرنگ خیال جو شاید گذشتہ سال لاہور سے نکلا ہے۔ تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ خصوصاً خاص خاص نمبروں کی اشاعت کی دوڑ میں وہ سب سے آگے ہے۔ اس کے خاص نمبروں میں بھی خصوصیت کے ساتھ اس کا عید نمبر ہر طرح لایق ستایش ہے۔ کئی سو صفحات کی ضخامت۔ مضامین کا تنوع۔ مناسب نظموں کی دلچسپی۔ تائیل کی دلکشی۔ تصاویر کی نیرنگی۔ ہر چیز اس میں وصف کے قابل ہے۔ اس کے مدیر اور لطیف الذوق اڈیٹر حکیم یوسف حسن صاحب اس کے لئے ہر طرح مبارکباد کے مستحق ہیں +

اخبار مدینہ بجنور

نیرنگ خیال لاہور کا ایک نہایت کامیاب رسالہ ہے۔ جس نے جدت اسلوب اور نظر فریب ظاہری و معنوی حسن کے باعث ادب اردو کے شائق حلقہ پر اپنا قبضہ کر لیا ہے۔ نیرنگ خیال کا خاص نمبر فی الحقیقت اردو رسایل کی تاریخ میں ایک بے مثال کارنامہ ہے +

حمایت اسلام

طرز عنوان سے ہکار اپنے بوقلموں محاسن اور گوناگوں لطائف کے اعتبار سے اس حقیقت صادقہ کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ کہ اردو رسایل کو مغربی صحائف کے ہم شان بنانا محال نہیں۔ اردو صحافت نیرنگ خیال پر جسقدر فخر و مباہات کا اظہار کرے بجا ہے۔ اس کا ہر نامہ نمبر گذشتہ پرچہ سے عمدہ تر اور خوشتر ہوتا ہے۔ معنوی اور ادب کے اس جامع المحاسن مرقع کی اشاعت پر ہم نیرنگ خیال کے صحیح الذوق فاضل اور ہمہ کار مدیر حکیم محمد یوسف حسن کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں +

ہفتہ وار اخبار پارس

ہمارا خیال ہے کہ جسقدر اچھے لکھنے والے نیرنگ خیال کو میسر ہیں۔ دیگر ادبی رسایل کو میسر نہیں۔ اس کے خاص نمبر کی نظیر اردو صحافت میں کبھی نہیں مل سکتی۔ اور بلا مبالغہ ظاہری اور معنوی اعتبار سے ہم اسے یورپ کے بہترین رسایل کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ نیرنگ خیال کی سرپرستی کرنی ہر علم دوست ہندوستانی کا فرض ہونا چاہئے +

روزنامہ مسلم آؤٹ لک

نیرنگ خیال کا عید نمبر اردو صحافت کا ایک نادر کارنامہ ہے۔ اوّل حصّہ بہت بلند پایہ ہے۔ یہ نمبر ایک خوان نعمت ہے جس پر بہترین لذایذ ادبی چنے ہوئے ہیں۔ حسین و جمیل نظموں اور عالمانہ مضامین کا ایک نادر مجموعہ ہے +

رسالہ زمانہ کانپور

لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال نے گذشتہ ڈیڑھ سال کے اندر دنیائے ادب میں کافی وقار حاصل کر لیا ہے۔ اور اس کے ہر نمبر کی ترتیب و تدوین سے یوسف حسن صاحب کا ادبی شغف بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ نیرنگ خیال آپ کے ذوق ادب کا بہترین کارنامہ ہے +

رسالہ اردو

رسالہ نیرنگ خیال کو شایع ہوئے ابھی زیادہ مدّت نہیں ہوئی۔ مگر یہ برابر ترقی کر رہا ہے۔ اور عید نمبر تو اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کی وجہ سے بے مثل ہے۔ اس کی تصاویر عمدہ اور تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ قابل اڈیٹر کا ذوق قابل تعریف ہے۔ ہمیں نیرنگ خیال کا عید نمبر دیکھ کر حقیقی مسرّت ہوئی +

مولانا محمد علی صاحب مدیر ہمدرد لکھتے ہیں:۔

دوسرے سال کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ مضامین دلچسپ ہیں جن سے ہر خیال اور ہر مذاق کے لوگ استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ افسانے افسانہ نگاری کے اچھے نمونے ہیں۔ حصّہ نظم کی ترتیب میں خاص کوشش صرف کی گئی ہے صرف تین روپے میں ہر مہینے رنگین تصاویر بھی شایع ہوتی ہیں۔ دیگر ادبی رسالوں سے نیرنگ خیال کی خصوصیت قابل لحاظ ہے +

کچھ نیرنگِ خیال کی نسبت

نیرنگ خیال جولائی ۱۹۲۴ء میں شایع ہوا تھا۔ چھ ماہ کی ایک جلد ہوتی ہے۔ اس وقت تک سات جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ سالانہ چندہ سوا تین روپے (۳/۴) بذریعہ منی آرڈر۔ اور بذریعہ وی پی ۳/۲ ہے۔ چندہ ششماہی ۱۲/۱۰ فی پرچہ ۵ر +

(۲) نیرنگ خیال میں قریباً ایک سو فوٹو بلاک کی تصاویر ایک سال کے اندر اندر شایع ہوتی ہیں۔ یہ تصاویر کیا بہ لحاظ فن کے اور کیا بہ لحاظ حسنِ مذاق کے ملک بھر میں قابل قدر تسلیم کی گئی ہیں +

(۳) نیرنگ خیال کا حجم سال بھر میں آٹھ سو (۸۰۰) صفحات سے زاید ہوتا ہے۔ جس میں دوسرے رسایل کے ڈیڑھ ہزار صفحات کے برابر مضامین شایع ہوتے ہیں +

(۴) نیرنگ خیال میں اعلیٰ پایہ کے علمی ادبی مضامین شایع ہوتے ہیں۔ اور ملک کے تمام مشاہیر اہل قلم نیرنگ خیال میں لکھتے ہیں۔ ہندوستان کے شعرائے نامدار کا تازہ ترین کلام شایع کیا جاتا ہے۔ ہر پرچہ میں مضامین کی تقسیم اس انداز سے کی جاتی ہے کہ ہر صاحبِ ذوق کے لئے اُس میں اپنے مطلب کی چیز موجود ہوتی ہے۔ فوٹو بلاکس۔ کارٹون۔ اور دیگر دلچسپیوں سے یہ مرقع ادب مزین ہوتا ہے +

(۵) نیرنگ خیال ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پابندیٔ اوقات سے شایع ہوتا ہے۔ گذشتہ ساڑھے تین سال میں ایک رسالہ بھی دیر سے شایع نہیں ہوا +

(۶) نیرنگ خیال کا عید نمبر بے مثل اور لاجواب ہوتا ہے۔ اس کی علیحدہ قیمت ایک روپیہ ہوتی ہے۔ یہ نمبر فروری و مارچ کا مشترکہ نمبر ہوتا ہے۔ اسلئے نیرنگ خیال کے خریداروں کو دو مہینوں کے معاوضہ میں یعنی صرف چار چار آنہ میں ملتا ہے۔ یہ نمبر ایسا شاندار ہوتا ہے کہ اس کی علیحدہ قیمت ہی تین روپیہ ہونی چاہئے تھی +

گویا نیرنگ خیال ہمہ صفت موصوف ہے۔ بہترین ہے۔ ارزاں ترین ہے۔ اس لئے ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسایل میں سب سے زیادہ شایع ہوتا ہے +

آپ دسمبر کا رسالہ ۵ر ٹکٹ بھیجکر منگا لیجئے۔ وہ بھی قابل دید ہے +

جنوری ۱۹۲۷ء سے خریداری قبول فرمایئے تاکہ سلسلہ خریداری مکمل رہے۔ ۳/۴ منی آرڈر بھیجئے یا وی پی کی اجازت دیجئے۔ نئے سال سے خریدار ہو جانے پر آپ کو سال بھر تک نیرنگ خیال پابندیٔ اوقات سے ملتا رہیگا۔ اور اسی چندہ میں آپ کو آنے والی عید کا بے مثل "عید نمبر" بھی ملیگا +

——— یہی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے "نیرنگ خیال" نقادانِ ادب کے نزدیک بہترین معیار کا پرچہ ہے اور عوام میں مقبول ترین!

——— وہ اُمید افزا یقین جو حضرت علامہ اقبال نے پہلے پرچے کے متعلق ظاہر کیا تھا۔ آج اُس کی بنا پہلے سے بھی زیادہ موثق ہے اور ہر پرچہ کی اشاعت سے موثق تر ہوتی جاتی ہے +

ملنے کا پتہ

منیجر نیرنگِ خیال۔ بارود خانہ لاہور

IQBAL ACADEMY PAKISTAN Library 31611 LAHORE

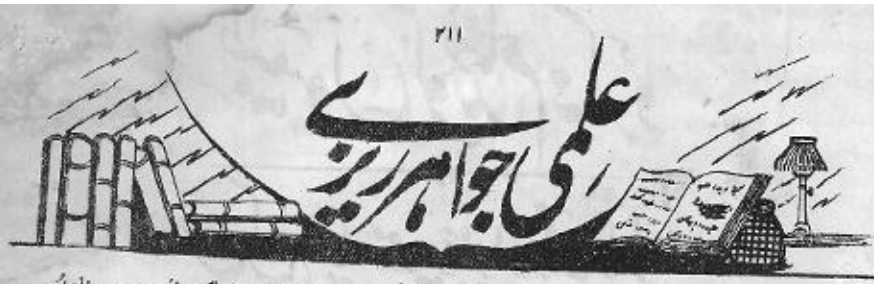

علمی جواہر ریزے

اردو کے اسالیب بیان :مصنفہ مولوی سید غلام محی الدین قادری زور بی۔ اے۔ اردو کے ابتدائی دور سے لے کر موجودہ زمانے تک نثر اردو کے مختلف اسالیب کے طرز تحریر پر ایک ناقدانہ و ادیبانہ نظر دنیائے اردو ادب میں بالکل انوکھی اور انچھوتی چیز ہے۔ گھٹائی چھپائی دیدہ زیب، کاغذ عمدہ، پاکٹ ایڈیشن قیمت عجم

روح تنقید :مصنفہ زور۔ اردو میں مشرقی و مغربی تنقیدی اصولوں کا مجموعہ جس سے اردو کے فن تنقید میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ گھٹائی چھپائی اعلیٰ رہے کی، کاغذ عمدہ، پاکٹ ایڈیشن قیمت عجم

تنقیدی مقالات :مصنفہ زور۔ روح تنقید کا دوسرا حصہ۔ تنقیدی اصولوں کی روشنی میں عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے مشہور مصنفین کے چند مسئلوں اور مضامین پر تبصرہ کرکے اصولوں کا استعمال دکھلایا گیا ہے گھٹائی چھپائی بہترین، کاغذ عمدہ، پاکٹ ایڈیشن صفحات تقریباً (۵۰۰) قیمت ہے

دنیائے افسانہ :مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ یہ اردو ادب میں پہلی تصنیف ہے جس میں افسانہ نویسی و ناول نگاری کے اصول و مسلمات پر بحث کی گئی ہے۔ گھٹائی چھپائی نہایت ہی عمدہ، کاغذ دبیز عمدہ پاکٹ ایڈیشن قیمت عجم

دکھنی میں اردو :مولفہ نصیر الدین ہاشمی نشی فاضل۔ قدیم اردو کے نثر و نظم کی مجموعی تاریخ، دکھنی شعرا کا تذکرہ و موزوں کلام بہترین گھٹائی چھپائی۔ پاکٹ ایڈیشن قیمت عجم۔

خیابان اردو :از سروری حکیم صلاح الدین صاحب عارف۔ اردو کے ستارہ اول یعنی اور مشہور شاعروں کی بہترین نظم و نثر کا جواب انتخاب مجلد قیمت عجم

تمدن ہند :ڈاکٹر لی بان کی مشہور فرنچ تصنیف کا اردو ترجمہ۔ جس کو شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی مرحوم نے ترجمہ کیا ہے۔ (۹۰) تصاویر اور ۲ نقشے شامل ہیں۔ یہ کتاب کیا ہے قیمت مجلد صرف

سرو آزاد :(بزبان فارسی) مصنفہ استاذ الاساتذہ میر غلام علی آزاد بلگرامی شعرائے فارسی و ہندی کا تذکرہ و موزوں کلام نہایت کمیاب کتاب ہے صفحات (۱۴۲) قیمت مجلد عجم

اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام (۲ حصے بزبان اردو) مصنفہ مولوی چراغ علی مرحوم پہلے حصے میں اسلام کے اساسی آئین قوانین سے بحث ہے۔ اور دوسرے میں تمدنی مساوات سے مسلمین یورپ کے اعتراض کا دندان شکن جواب قرآن حدیث فقہ اور تاریخ کے حوالوں سے دیا گیا ہے۔ مجموعی قیمت مجلد عجم

مجموعہ رسائل چراغ علی اس میں ظلی اسلامی، تاریخی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے مجلد ۳۰۰ صفحات مجلد عجم

تحقیق الجہاد مصنفہ مولوی چراغ علی (۳ حصے بزبان اردو) مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ و تدنی ترقی، یورپ کے مقام، تمام غزوات کے حالات درج ہیں۔ اور جہاد و جہاد لونڈی غلام اور رحم بنانے وغیرہ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے فاضل مصنف جلد اور اسکے متعلقات پر تفصیلی بحث ہے مجلد (۱۲۰۰) صفحات قیمت مجلد عجم

خیالات عالیہ مسز ہیمنس، بیکن، سروالٹر سکاٹ اور مسٹر ایڈیسن کے شاہکاروں کا بہترین اردو ترجمہ قیمت عجم

برونگ انگریزی کے مشہور شعرا رابرٹ برونگ شاعر کے خیالات عالیہ کا نفیس اردو ترجمہ قیمت عجم

ورثین مسز سروجنی نائیڈو، بلبل ہند کی انگریزی نظموں کا بہترین منظوم اردو ترجمہ (اصل انگریزی کا مقابل قیمت عجم

جولیس سیزر شیکسپیر کے بہترین تاریخی ڈرامے کا جواب اردو ترجمہ قیمت عجم

کنگ رچرڈ سیکنڈ شیکسپیر کے مشہور رزمیہ ڈرامے کا بہترین اردو ترجمہ قیمت عجم

حلقہ مسموم انگریزی کا علمی قصہ (پاکٹ بک) مصنفہ آرتھر کانن ڈائل کا نہایت عمدہ اردو ترجمہ قیمت عجم

معراج العاشقین مصنفہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اٹھویں اور نویں صدی کی اردو کے قدیم کا نمونہ ہیں ہیں دکھنی زبان میں تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ابتدا میں مولوی عبدالحق بی۔ اے کا عالمانہ مقدمہ ہے قیمت عجم

اردو کے قدیم :از مکیم شمس اللہ قادری ایم۔ آر۔ ایس قدیم اردو کی نظم و نثر کی مفصل تاریخ۔ ابتدائی زمانے سے گیسو دراز تک زیب عالمگیر کے عہد اخیر تک کے شاعروں کا تذکرہ و قیمت شعروں عالی قسم دوم عجم

شعرائے اورنگ آباد اردو کے قدیم شعرائے اورنگ آباد کا تذکرہ و موزوں کلام قیمت عجم

نور رہین شعرا :رہین شعرا کے حالات و موزوں کلام جنہوں نے اردو زبان میں شعر شاعری کی تھی قیمت عجم

قاموس الجدید عربی زبان کا اردو لغت جس میں ایسے دس ہزار الفاظ و اصطلاحات کا مجموعہ ہے جن کا آج کل صبح و شام روزمرہ میں رواج ہے حجم (۴۲۲) صفحات قیمت عجم

فرہنگ فارسی جدید :جدید فارسی مروجہ ایران کے دس ہزار الفاظ کا لغت اردو زبان میں صفحات (۹۱) قیمت عجم

مجمع الالفاظ عربی فارسی کے مروجہ مترادف الفاظ کا مجموعہ حجم (۱۲۹) صفحات قیمت عجم

ریاض المجد حصہ اول و دوم :از مجد حیدر آبادی یہ فارسی جذبات اور دور انگیز واقعات کی تصویر۔ صوفیانہ اور عارفانہ کلام کا دلکش مجموعہ ہر دو حصص کی قیمت عجم

رباعیات المجد حصہ اول و دوم۔ اردو کی بہترین رباعیاں جن سے رباعیات عمر خیام کا لطف حاصل ہوتا ہے قیمت فی حصہ عجم

خرقہ المجد سکی پیچوند۔ روحانیت کی تصویر۔ اس کا فی اللہ کان اللہ کی تفسیر بمطابق ہے مجلد ہر جلد عجم قیمت عجم

نذر المجد :ہجرت بلوی کے حالات میں پردہ نظم جو عورت، مرد اور بچوں کے پڑھنے کے لائق ہے قیمت عجم

نوٹ مذکورہ بالا کتب کے علاوہ اردو مصنفین کی قدیم و جدید مطبوعات ہمارے ہاں سے مل سکتی ہیں شائقین کتب فہرست طلب فرما سکتے ہیں ؎

ملنے کا پتہ :۔ منیجر مکتبہ ابراہیمیہ امدادیہ ہی محدود ڈاکٹیشن حیدرآباد دکن

طبیبوں کو بدنام نہ کرو

اُن کی ہدایات پر چلو اور شفا پاؤ

عام مریضوں کا یہ شیوہ ہے۔ کہ جب انہیں کسی طبیب کے نسخے سے شفا نہیں ہوتی۔ تو اس کی ذمہ واری صرف طبیب ہی پر ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ قصور بہت بڑی حد تک تیمار داروں اور عطاروں کا ہوتا ہے۔ عطار پرانے زمانے کی پھپھوندی لگی دوائیں دے دیتے ہیں۔ اور تیمار دار انہیں بے پرواہی سے گھوٹ چھان کر مریض کے حلق سے اتار دیتے ہیں۔ نہ کوئی سوچتا ہے۔ کہ یہ دوائیں اچھی اور تازہ ہیں یا نہیں نہ کسی کو اسکی پرواہ ہوتی ہے۔ کہ نسخہ صحیح طریق سے طیار کیا گیا ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مریض کو شفا نہیں ہوتی۔ اور طبیب بدنام ہو جاتا ہے۔ لہذا

اگر تازہ دوائیں صحیح مرکبات۔ مؤثر نسخے مطلوب ہوں

تو

مشرقی دواخانہ دہلی

میں تشریف لائیے جہاں ہر قسم کی تازہ اور خالص دوائیں اور شربت۔ معجون جوارش۔ عرق۔ حب۔ سفوف۔ اطریفل۔ روغن۔ ضماد۔ طلا۔ کشتہ۔ مرتبہ غرض تمام اقسام کے صحیح و مؤثر مرکبات ہر وقت طیار رہتے ہیں اس دواخانے کے کارپردازوں کی دیانت۔ خوش معاملگی اور مہارت ملک بھر میں مشہور ہے اور پنجاب کے بڑے بڑے نامور اطبا اس کی طیار کئے ہوئے مرکبات اپنے شفاخانوں میں سالہا سال سے استعمال کر رہے ہیں۔ اس دواخانے کی سب سے بڑی اور ممتاز خصوصیت یہ ہے۔ کہ مشہور دیار و امصار نامی گرامی

عالیجناب حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی

تمغہ کشندیافتہ طبیہ کالج (دہلی)

اس دواخانے کے سرپرست و نگراں ہیں حکیم صاحب کی مہارت تشخیص اور حذاقت علاج کو آج تمام دنیا میں جو وسیع و پیمانہ شہرت حاصل ہے۔ وہ اس دواخانے کے مرکبات کی عمدگی کے لئے سب سے بڑی ضمانت ہے

ہزارہا مفرد دواؤں کے علاوہ صدہا مرکبات

جو استادانِ طب کے اصلی نسخوں کے مطابق طیار کئے جاتے ہیں تازہ تازہ اس دواخانے میں موجود رہتے ہیں۔

مریضوں کے علاوہ

تمام معززِ اطبا اور عطاروں کو چاہیئے۔ کہ اس دواخانے سے تعلق پیدا کریں۔ اور اس کی خالص اور مؤثر دواؤں کی وجہ سے نیک نام ہوں

ایک کارڈ لکھکر دواخانے کی مفصل فہرست مفت طلب کیجئے

مینیجر مشرقی دواخانہ دہلی لوہاری دروازہ لاہور